U32470 Date 30-12-05

Title - SEEPARRA-E-DIL (Part-1).

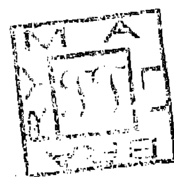
Creator - Khwaja Hasan Nizami.

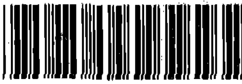
Publisher - N.A.

Date - 1938.

Pages - 384

Subjects - Urdu Adab - Mazameen; Mazhabiyaat - Abd-o-Maabood; Urdu Inshaiye.






# اِنسان کا نِسیان

ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے جب اسکو گناہ اور نیکی کی طاقتیں دی گئی ہیں اور حافظہ کی قوت بھی دی گئی ہے اور بھول بھی اس کے خمیر میں رکھی گئی ہے تو نسیان اور خطا کو بُرا کہنا یا بُرا سمجھنا ایک خطا ہوگی۔

مجھے اپنے حافظہ اور یادداشت کی قوت پر بہت گھمنڈ تھا لیکن جب بڑھاپے کی عمر آئی تو وہ گھمنڈ جاتا رہا کیونکہ ہر سکنڈ کے بعد بھول جاتا ہوں البتہ بچپن کی سب باتیں حافظوں کی طرح یاد ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسیان انسان کے خمیر میں شامل نہیں ہے بلکہ جب انسان کے قوائے جسمانی میں کمزوری آتی ہے تو حافظہ کی قوت بھی کم ہو جاتی ہے ورنہ دراصل انسان حافظہ اور نیکی سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال میں نے سی پارۂ دل کتاب کی ان غلطیوں کو جو کاتبوں اور چھاپہ خانوں سے پچھلی کئی اشاعتوں میں ہوئی تھیں ایک برس کی محنت میں درست کیا تھا لیکن جب کتاب چھپ کے آئی تو حیران رہ گیا کہ صفحات کا شمار جن ہندسوں سے ہوتا ہے وہ غلط لگ گئے اور میں نے کتاب کو پڑھا مگر ہندسوں کو نہ دیکھا، کیونکہ ہندسے ایک حساب کی چیز ہیں اور میں حساب سے ایسا ہی ناواقف ہوں جیسے مسلمانوں کو خیال ہو گیا ہے کہ ہم حساب نہیں جانتے، لہذا اس کتاب کے ناظرین سے عرض ہے کہ وہ پہلے اس فہرست کو غور سے پڑھ لیں جس میں صحیح ہندسے لگائے گئے ہیں اور ہندسوں کی غلطیوں کو بتا دیا گیا ہے اور صحت نامہ کی موافق پہلے اپنی کتاب کے ہندسوں کی اصلاح کر لیں تا کہ کتاب پڑھنے کے وقت وہ اُلجھن نہ ہو جو مجھے ان غلطیوں سے ہوتی ہے۔

حسن نظامی دہلوی ۔ ۱۱ جنوری ۱۹۳۰ء

حسن نظامی

# فہرست مضامین سیپارۂ دل حصہ اول

لہ صفحہ ۱۹۲ سے آگے نمبروں میں غلطی ہو گئی ہے اس لیے یہاں سے صفحوں کا سلسلہ صحیح ہے۔

# بیگم حبیبہ ضیا کی عمر زیادہ نہیں ہے

لیکن بیماریوں اور فکر نے پٹھے کمزور کردئے ہیں اور تازہ خون بدن میں پیدا نہیں ہوتا اس واسطے چہرہ پر بڑھاپا معلوم ہونے لگا ہے۔ اگر بیگم حبیبہ ضیا طبی کمپنی کا بنایا ہوا فاسفورس کا تیل روزانہ رات کو سوتے وقت گھٹنے سے پاؤں تک مل لیا کریں۔ تو چند روز میں ان کے پٹھے مضبوط ہو جائیں گے۔ اور جسم میں تازہ خون پیدا ہونے لگے گا۔ اور چہرہ پر سرخی اور تازگی پیدا ہو جائیگی۔

فاسفورس کا تیل طبی کمپنی دہلی سے ملے گا

بڑی شیشی تین روپے کی (للعہ)

اس سے چھوٹی ایک روپیہ کی اور آٹھ آنے کی اور

چار آنہ (۴ر) کو بکتی ہے

بڑے شہروں میں ایجنٹ بھی ہیں

# اولاد کی سلامتی

خدا آپ کی اولاد کو زندہ سلامت رکھے۔ بعض لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے سوکھ سوکھ کر مرجاتے ہیں۔ یا اچھے خاصے یکایک معمولی بیماری سے جان بحق ہوجاتے ہیں۔ اس بیماری کو مسان کی بیماری کہتے ہیں یہ بیماری ماں کی اندرونی کمزوری سے ہوتی ہے اگر بچوں کی مائیں حمل کے زمانہ میں رات کو سوتے وقت طبی کمپنی دہلی کا بنایا ہوا فاسفورس کا تیل مل لیا کریں تو بچے پیدا ہونے کے بعد ہلاکت سے محفوظ رہیں گے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد ان کے جسم پر بھی روزانہ رات کو فاسفورس کا تیل مل دیا کیجئے۔ پھر ان کو کبھی نہ کوئی بیماری ہوگی نہ مسان کا حملہ ہوگا۔ کیونکہ فاسفورس کا تیل بدن میں جذب ہوکر بے حد طاقت ور بنا دیتا ہے۔

بڑی شیشی تین روپے کی اور اس سے چھوٹی ایک روپیہ کی اور آٹھ آنے کی اور چار آنے والی کی

پتہ:- طبی کمپنی دہلی

# اولاد کی مراد حاصل ہو گئی

اگر کسی کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو یا حمل قائم نہ رہتا ہو اور ضائع ہو جاتا ہو تو طبی کمپنی دہلی سے فاسفورس کا تیل منگا کر زیر ناف اور پشت پر مالش کرائیے تاکہ پٹھوں کی کمزوری دور ہو جائے اور فاسفورس اندر جاذب ہو کر اندرونی قوت پیدا کر دے جس کی حمل قائم ہونے اور قائم رہنے میں ضرورت ہوتی ہے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ چالیس دن تک یہ تیل ملا جائے تو اولاد کی مراد ضرور حاصل ہو جائے گی۔

پتہ:- **طبی کمپنی دہلی اور اس کے ایجنٹ**

بڑی شیشی تین روپے ۳ کی

اس سے چھوٹی شیشیاں ایک روپے کی اور آٹھ آنے اور چار آنے (۴) کی ہیں۔

# دیباچہ

## از واقف اسرار انشا پردازی جناب مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو و افسر محکمۂ تعلیم اقلیم دکن

اردو زبان میں نثر کا دور تھوڑے ہی عرصہ سے شروع ہوا ہے۔ اسکی ابتدا بھی مثل بعض زبانوں کے شاعری ہی سے ہوئی اور کیوں نہ ہوتی۔ اس نے برج بھاشا کا دودھ پیا ہے جو گویا شاعری ہی کیلئے بنی تھی سب سے پہلے میر امن نے نثر کا سکہ جمایا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی کتاب اب بھی اپنے رنگ میں مثیل ہے۔ اس کے بعد مرزا نوشہ پھر سید احمد خان، مولانا حالی، نذیر احمد، مولانا آزاد اور مولینا شبلی نے اس کا وہ مرتبہ بڑھایا کہ نثر نظم پر سبقت لے گئی۔

آجکل خواجہ حسن نظامی صاحب نے اس میدان میں اشہب قلم دوڑایا ہے اور کوس من الملک نثری بجایا ہے۔ ان کا رنگ سب سے نرالا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اڑایا ہے، یہ صحیح نہیں اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ورنہ اصل میں اس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنع زیادہ ہے خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن اسے اس خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بیساختہ پن قربان ہو ہو جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں مگر اسکی بجائے سوز و گداز ہے۔ مرزا کے فقرے ظرافت کے ساتھ محبت میں گھلے ہوئے ہوتے ہیں خواجہ صاحب کے مضمون درد سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، خواجہ صاحب کی عبارت میں جو چلبلا پن ہے جو سیدھی سادی بات کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیتا ہے۔ مرزا ایک فقرا سی ترکیب لفظی یا ایک جملے میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں کہ آدمی مزا لیتا رہے خواجہ صاحب اپنے مضمون میں ایک ایک جزو کو الگ الگ کر دکھاتے اور وہ گلکاری کرتے ہیں کہ آدمی عش عش کرے۔

جو حکیمانہ اسرار اور فلسفیانہ نکات چاہتے ہیں، یہ تحریریں اُن کیلئے نہیں یہ اُن کے لئے ہیں جو دل رکھتے ہیں، جو عقل و حکمت سے رازِ دہر کی جستجو میں ہیں ان کی نظروں میں شاید یہ نہ جچیں گی لیکن جو درد دل اور عشق و محبت کے توسل سے وہاں پہنچنا چاہتے ہیں انہیں اس میں لطف آئے گا۔

یہ اخلاقی مضامین نہیں لیکن اخلاق کا رنگ ان سے ٹپکتا ہے۔ ان میں تصوف کا دعوے نہیں لیکن تصوف کی بُو ان میں پائی جاتی ہے۔ یہ معاشرتی تحریریں نہیں لیکن معاشرت کی اصلاح ان میں نظر آتی ہے۔ یہ حکیمانہ رسائل نہیں لیکن حکمت ان کی تہہ میں ہے۔ ہر کوچہ کی سیر کی ہے اور ہر گلی کی خاک چھانی ہے۔ کہی اور اَن کہی سب کچھ کہدی ہے۔ آگے پڑھنے اور سمجھنے والے کی صلاحیت پر موقوف ہے۔

ان مضامین میں کہیں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہیں وہ اپنے سے ہمکلام ہیں کہیں رازونیاز ہے کہیں درد دل کی داستان ہے اور اپنا اور سہارا دُکھڑا رو رہے ہیں۔ کون ہے جو "ایک عرب کے گھر" کو دل تھامے بغیر پڑھ سکتا ہے؟ کہیں تخیل کا زور عرش تک لے گیا ہے کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی ہے کہ نظم مقفّٰے ہیچ ہے۔ کہیں ذرے کو آفتاب بنایا ہے اور کہیں آفتاب کو خاک۔ غرض عجیب گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ کے پھول اور ہر پھول میں نئی خوشبو ہے۔ گو سب کچھ ہے مگر سُر وہی ہے اور لَے میں فرق نہیں آیا ہے۔

لیکن معترض یہ پوچھتا ہے کہ آخر اس کی غرض کیا ہے؟ خواجہ صاحب کیا چاہتے ہیں؟ ان کا مشن کیا ہے؟ کیا کوئی خاص غرض و غایت بھی ہے، یا یونہی تُک بے تُک جو جی میں آتا ہے کہے چلے جاتے ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ "میں مدینہ نگری سے پریم کا سندیسا لایا ہوں" اور یہ کہہ کے چپ ہو جاتے ہیں اور ان کی چپ سے جی گھبراتا ہے۔

بعض لوگ کہیں کہیں مضمون کی طوالت سے گھبرائینگے کہیں کہیں وہ بظاہر بے ربطی سی پائینگے

کہیں مضمون و طرز تحریر کی یکسانی سے اُکتائیں گے۔ کہیں عامیانہ باتوں پر ناک بھوں چڑھائیں گے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ انہی عامیانہ باتوں میں کام کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ عرفی نے خوب کہا ہے۔ ع

اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

ہاں نظر ہونی چاہیئے۔ ؎

اُس کی خوبی کے تو کیا کہنے مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے | داغ

آپ پڑھ کے دیکھئے اور خود اندازہ کیجئے۔ کسی کے کہنے پر نہ جائیے جی کو لگے تو کہنے والے کی محنت کی داد دیجئے نہیں تو خاموش ہو رہیئے۔ شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔

زبان کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے۔ ظاہر ہے، عیاں ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں اچھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں، کیا پڑھوں؟ میں نے کہا اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو اور دلّی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ دلی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے۔ اس میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟

آجکل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لئے خواہ مخواہ بعض لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بیچاری اردو کی گردن پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اس کی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ اردو کی ترقی نہیں، تنزل ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اردو سب میں مقبول ہو۔ مگر ان تحریروں سے وہ مردود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے وہ ان پیچیدہ اور مغلق تحریروں میں کہاں۔ یہ گر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے۔

میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ عقل نے اجازت نہیں دی اور مصلحت نے قلم روک دیا اور کہا "بس"۔

عبدالحق

# دیباچہ طبع اول

## از جناب مولوی غلام بھیک صاحب بی اے فقیر اللہ شاہ نظامی وکیل سرکار انبالہ

مولانا خواجہ حسن نظامی زید مجدہ السامی اپنی نسبی اور خاندانی حیثیت سے میرے محترم مخدوم ہیں اور دیرینہ ذاتی تعلقات کے اعتبار سے ایک شفیق اور عزیز دوست مصنف اور تصنیف کا تعلق فرزند و پدر کا سا ہوتا ہے یعنی جو تحریریں اس مجموعے کی شکل میں شائع ہوئی ہیں وہ میرے ایک مخدوم دوست کی معنوی فرزند ہیں اور اسی نسبت سے مجھکو عزیز ہیں۔ دیباچہ کا کام کسی کتاب کا اس کے ناظرین سے تعارف کرانا ہے۔ گویا یہ مختصر تمہید لکھکر میں اپنے ایک مخدوم دوست کے فرزندانِ معنوی کو اہل بصیرت سے روشناس کرا رہا ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کام میرے لئے خاص طور سے باعثِ مسرت ہے۔

جو تحریریں اس کتاب میں جمع کر کے شائع کی جاتی ہیں۔ یہ وقتاً فوقتاً اخباروں اور رسالوں میں چھپکر قبول خاص کا تمغہ اور دلچسپی عام کا خلعت حاصل کر چکی ہیں لیکن پھر بھی ان کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کرنا مصنف اور ناظرین دونوں کے لئے ضروری اور مفید ہے جس غرض اور غایت کے لئے مصنف نے اس قدر محنت اور دماغ سوزی گوارا کی وہ اوراقِ پریشاں کی نسبت مجموعہ سے بہتر حاصل ہو سکتی ہے۔

گویا ایک ایک سپاہی کا فرداً فرداً غنیم پر حملہ کرنا وہ اثر ہرگز نہیں رکھ سکتا جو ایک فوج کی فوج کا یک لخت حملہ کر نا رکھتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ اب تک یہ پھول کے پودے الگ الگ کیاریوں میں لگے ہوئے تھے اور اب سب کے سب ایک کیاری میں قرینے سے لگا دیئے ہیں تاکہ سیر کرنے والے کا دماغ یکا یک مہک اٹھے۔ آنکھیں مجموعی نظارے سے تازہ ہو جائیں اور اس کو بہت سی کیاریوں میں گھومنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔

یہ ایک بدیہی اور مشہور بات ہے کہ اس زمانہ کے ممتاز اہل قلم میں خواجہ صاحب ایک امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ ان کا رنگ گفتگو، طرز بیان، انداز خیال جیسا مقبول ہے ویسا ہی نرالا اور اچھوتا بھی ہے۔ زبان سادہ اور شیریں، محاورہ ٹکسالی اور نمکین، بیان رواں اور دل نشین بناوٹ سے معرّا، تصنّع سے مبرّا۔ غرض انداز مقال ہے کہ ایک سحر حلال ہے۔ علاوہ ازیں ان کی نگاہ حقیقت شناس ہر چھوٹے بڑے واقعہ میں ایک بڑا سبب اور بڑا نتیجہ دیکھتی ہے معمولی بلکہ بظاہر گھٹیا چیزوں کے مشاہدے سے اعلےٰ روحانی و اخلاقی سبق حاصل کرتی ہے۔ حتّٰی کہ وہ عزلت گزین، گوشہ نشین، شب بیدار پرندہ یعنی اُلّو جو اہلِ ملامت کی سنت پر عمل کر کے عام طور سے لوگوں کی نفرت اور ظرافت کا ہدف ہی بنا رہتا ہے خواجہ صاحب کی نگاہوں میں ایک خاص وقعت رکھتا ہے اور ان کو اس کی زندگی کے تاریک اوراق میں بڑے بڑے سبق لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دیا سلائی کے ننھے سے تنکے سے خواجہ صاحب کا گوش ہوش وہ ترش باتیں سنتا ہے جن سے حضرت انسان کا نشۂ خود پسندی ہرن ہو جاتا ہے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کی سب سے بدیہی خصوصیت قومی ہمدردی ہے لیکن یہ وہ قومی ہمدردی نہیں جو واقعات کو سطحی نگاہ سے دیکھنے والے دقائق اسلام سے بے خبر اور بے سوچے سمجھے تقریریں کرنے والے لکچرار ظاہر کیا کرتے ہیں بلکہ یہ قومی ہمدردی حقائق شناسی پر مبنی ہے۔ اس ہمدردی کی وجہ سے خواجہ صاحب قوم کی حالت کو اس کے اعمال کا نتیجہ تصور کرتے ہیں اور اس کو جا بجا عبرت کا سبق دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے خواجہ صاحب کو خاندانِ تیموریہ کے بعض حالات اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعض واقعات کی خاص واقفیت حاصل ہے۔ کچھ تو یہ واقعات اور حالات بجائے خود عبرتناک اور درد انگیز ہیں اور کچھ خواجہ صاحب کے طرز بیان کا جادو سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور انسانی ہمدردی کی رگ پر جگہ جگہ نشتر لگاتا ہے لیکن ان واقعات میں بھی سلسلۂ علت و معلول کو خاص صوفیانہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

مورخانہ طبیعت کے انسانوں کو خاندانِ تیموریہ کی تباہی کے اسباب و نتائج خالص پولیٹیکل رنگ میں نظر آئیں گے لیکن خواجہ صاحب کے نزدیک اس کے اسباب بھی روحانی ہیں اور اس کے سبق بھی روحانی۔ ان کے نزدیک سلطنت مغلیہ تاجداروں اور ان کے خاندان کی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ ہوئی اور یہ تمام داستان ایک دفترِ عبرت ہے جس سے دنیا کی بے ثباتی، تکبر و نخوت کی سفاہت اور مردم آزاری کی مذمت دلوں پر نقش ہونی چاہیے

## سرِ دلبراں

اہل طریقت کو سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں گفتن کے فن میں ہمیشہ سے کمال رہا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب بھی اس فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ مثلاً "خدائی گراموفون" "کھٹکا" وغیرہ وغیرہ معمولی معمولی عنوان قائم کر کے طریقت اور تصوف کے نکات بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں اور ان عام پسند اور عام فہم پیرایوں میں ان مسائل کو بیان کر کے اس زمانے کے مادہ پرستوں کی توجہ کامیابی کے ساتھ حقائق اسلام کی طرف منعطف کرتے ہیں۔ اس رنگ کے مضامین کی اس زمانہ میں بہت ضرورت ہے۔ دہریت اور مادیت کا چاروں طرف زور ہے اور معاش و معاد کے گہرے مسائل کی طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات کو کافی اعتنا نہیں ہے کاش کہ اس قسم کی تحریروں سے ان کو ایسے مسائل پر غور کرنے کی عادت ہو۔

یہ سب کچھ ہے مگر سب سے زیادہ قابل قدر وہ خاص خاص تحریریں ہیں جن کو دیکھکر قلب و روح میں ایک برقی رَو دوڑ جاتی ہے جن کو پڑھ کر زبان یا قلم سے پہلے آہِ سرد اور چشم تر داد دیتی ہے مثلاً "مستِ الست کی دعا" "مزار حضرت یوسفؑ پر دعا" "محراب حضرت زکریاؑ میں دعا" "استقبال رسول" "مستانہ بزم مولود" "حال دل" وغیرہ۔ ان مضامین میں اس جوہر کا خاص جھلکا ہے جسکے بغیر کسی مومن کا ایمان مکمل نہیں ہوتا یعنی شاہنشاہِ اقلیم رسالت کی ذات حسن الصفات کا عشقِ صادق اور جس کتاب میں یہ صفت ہو اسکی اور کسی صفت کی ضرورت نہیں ہے بس باقی ہوس ؎

شہر انبالہ۔ ۱۱ جون ۱۹۱۳ء نیرنگ

# خود خواجہ صاحب

## از جناب ملا محمد الواحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ "نظام المشائخ" و اخبار "خطیب" دہلی

سیدی و مولائی حضرۃ خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا مجموعہ دوسری مرتبہ چھپکر شائع ہوتا ہے پہلے ایڈیشن میں مضامین بھی کم تھے اور ترتیب بھی کچھ نہ تھی۔ اس دفعہ بہت کچھ ترمیم ہوئی ہے۔ وقت کے نامناسب مضامین خارج کر دیئے گئے اور ان سے کئی حصہ تازہ اور اچھے اچھے مضامین شامل ہو گئے۔ درحقیقت پہلے مجموعے کو تو مجموعہ کہنا ہی ٹھیک نہ تھا۔ اب بیشک چند اعتبارات سے یہ مجموعۂ مضامین کہنے کا حقدار بن گیا ہے۔

محبی جناب مولوی شیخ محمد احسان الحق صاحب قادری میرٹھی نے اس مجموعہ کی ترتیب و تالیف میں جتنی محنت کی ہے اُس کی تعریف کرنی چاہیئے۔ اصل میں شیخ صاحب موصوف کا یہ فرض تھا جس کو انہوں نے ادا کیا۔ کیونکہ ہم سب پر جو حضرت خواجہ صاحب کے ادبی روحانی خوشہ چین ہیں، اس قسم کی خدمتیں واجب و فرض ہیں۔

میں اس موقعہ پر خود حضرت خواجہ صاحب کی ادبی شخصیت پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری ان کی پانچ برس مسلسل یکجائی رہی ہے اور میں نے جس قدر اخباری و لٹریری دنیا میں تعارف حاصل کیا ہے وہ اُسی زمانہ کی ہم نشینی کا پرتو ہے۔ اس لئے حضرت خواجہ صاحب کی اندرونی زندگی کا حال جیسا مجھے معلوم ہے، دنیا میں شاید کسی کو نہ ہوگا۔

لوگوں میں دستور تو یہ چلا آتا ہے کہ کتاب کے شروع میں مصنف کی سوانحعمری لکھدیا کرتے ہیں۔ مگر میں نے اس روش سے الگ ایک موضوع قرار دیا ہے کیونکہ لائف کا لطف موت کے بعد ہے نہ کہ حیات میں۔ خدا خواجہ صاحب کو عمر طبعی عنایت فرمائے سوانحعمری لکھکر بدشگونی کرنی ٹھیک نہیں۔ اس کے علاوہ مجھے علم ہے کہ خود حضرت خواجہ صاحب "آپ بیتی حسن نظامی" کے نام سے اپنے حالات اسی مشہور طرزِ تحریر میں لکھ رہے ہیں جس نے اُن کو

تمام اردو انشا پردازوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ لائف کا جو مزا اس کتاب میں ہو گا دوسرے کی تحریر میں کہاں آسکتا ہے۔ لہذا میں صرف لٹریری زندگی کی تاریخ اور اسی موضوع کی تشریحات پر اکتفا کروں گا جس سے حضرت خواجہ صاحب کی اس کتاب کو تعلق ہے۔

# ابتدائی حالات

مختصر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت خواجہ صاحب درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں پیدا ہوئے جو دہلی سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ انہوں نے مروجہ نصاب عربی کو مکمل کیا اور جناب منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی کی صحبت کے سبب ادبی اخباری میلان پیدا ہوا۔ یہ غالباً سب جانتے ہیں کہ حضرت خواجہ صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خواہر زادوں میں ہیں اور ان کی نشوونما پیرزادگی میں ہوئی ہے۔ اگر منشی صاحب کی صحبت کا اثر نہ ہوتا تو اس قدرتی جوہر کا کھلنا، جو خواجہ صاحب کی طبیعت میں تھا یقیناً دشوار تھا۔ کیونکہ پیرزادگی اس زمانہ میں اکثر لوگوں کو مغرور و خود پرست بنا دیتی ہے اور ہاتھ پاؤں چومنے والے معتقدین پیرزادوں کے دماغ بگاڑ دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ منشی صاحب کا وہ ابتدائی جملہ مجھے ہمیشہ یاد رہیگا کیونکہ وہ میری ادبی زندگی کی بنیاد ہے کہ "دنیا میں چھوٹا اور انجان بننے سے کچھ ملتا ہے، بڑا اور دانا بننا انسان کو محروم کر دیتا ہے۔" میں نے اس قول پر عمل کیا اور آج تک کبھی اس خیال کو پاس نہ آنے دیا کہ میں کچھ ہوں جس کے پاس گیا انجان اور طالب علم بن کر گیا۔

حضرت خواجہ صاحب نے سب سے پہلے جو اخبار دیکھا وہ مراد آباد کا ایک ہندو اخبار "ہمدرد" تھا۔ فرماتے ہیں اس سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ اخبار کیا چیز ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جس اخبار میں مضمون لکھا وہ بمبئی کا "انڈیا گزٹ" تھا جس کو لاہور کے حکیم غلام محی الدین صاحب نکالتے تھے۔ اس مضمون کا عنوان تھا "انڈیا کی نازک حالت" اور اس میں قحط کی

پریشانیوں کو بیان کیا گیا تھا۔

منشی غلام نظام الدین صاحب کتابوں کے سوداگر تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو مولانا شرر کے ناول دیئے جن کو پڑھکر خواجہ صاحب کو انشاء پردازی کا چسکا لگا۔ فرماتے ہیں کہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شرر کی تحریریں میری لفظی استاد ہیں اور فطرت اُستاد معنوی۔ ان تحریروں سے میں نے مضامین کی بندش سیکھی اور فطرت، دمشاہدۂ قدرت سے نے معنوی اثر تعلیم کیا۔ ان کا ارشاد ہے کہ یہ حال شروع زمانے کا ہے جسے آج بیس برس سے زیادہ عرصہ ہوگیا۔ بعد میں جو کچھ ترقی کی وہ مولانا سید اکبر حسین صاحب جج الہ آبادی کی صحبت کا فیض ہے جن کے ساتھ سال میں کئی مرتبہ یکجائی کا موقعہ نکالتا تھا اور اُن کے کلام پر دوسروں سے جداگانہ نظر ڈالتا تھا۔ خواجہ صاحب تو یہاں تک مبالغہ فرماتے ہیں کہ مجھ میں اگر کسی کو کچھ آدمیت نظر آئے تو سمجھ لینا کہ وہ جناب اکبر کا عکس ہے، میری ذاتی نہیں ہے ادبی حیثیت سے دیکھا جائے تو وسطی اور آخری زمانے کے مضامین سے واقعی وہی شوخی و بیباکی اور نرالا پن ٹپکتا ہے جو جناب اکبر کی نظموں میں صفت مخصوص ہے۔

# مقصد مضامین نویسی

حضرت خواجہ صاحب پیرزادے ہیں اور خود صاحب سلسلہ وارشاد ہیں۔ ان کو طبیعت کی موزونی ورثہ میں ملی ہے کیونکہ تمام صوفیائے کرام اسرار تصوف کو ہمیشہ اشعار کی رنگینی اور لٹریچر کی تاثیروں میں بیان کرتے آئے ہیں۔ خواجہ صاحب شاید پہلے صوفی ہیں جنہوں نے نثر میں تصوف کے ولولے اور جذبات کو نظم کے انداز سے بڑھ کر لکھا۔ وہ شعر نہیں کہہ سکتے لیکن بعض مضامین میں قافیہ بندی کی شان گواہی دیتی ہے کہ وہ کوشش کرتے تو بہت بڑے شاعر بن سکتے تھے۔ علامہ شبلی مرحوم سچ فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب نثر میں ایسی بےنظیر شاعری کرتے ہیں جس کا اثر آجکل کی نظموں میں بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔

خواجہ صاحب کی مضامین نویسی کا صرف ایک مقصد ہے جو ان کا موروثی ہے اور وہ تصوف کی اشاعت ہے۔ وہ فرمایا کرتے ہیں کہ میں نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ محض اسلئے ہے کہ نئی روشنی کے لوگ جو صوفیوں کی پرانی کتابوں کو نہیں پڑھتے اور ان کتابوں کے قدیمی طرز تحریر کے سبب تصوف ہی سے غیر مانوس ہوتے جاتے ہیں، میرے نئے انداز تحریر سے ادھر راغب ہوں اور کیف روحانی سے فائدہ اٹھائیں چنانچہ اس میں حضرت خواجہ صاحب کو بڑی کامیابی ہوئی اور آج جو ہزاروں انگریزی تعلیم یافتہ لوگ تصوف کے دلدادہ ہو گئے وہ محض حضرت خواجہ صاحب کی تاثیر قلم کا طفیل ہے۔

ملک میں جس قدر صوفیانہ رسالے نکلتے ہیں جن میں نظام المشائخ، صوفی، اسوہ حسنہ، طریقت، انوار الصوفیہ اور معارف زیادہ ممتاز ہیں۔ یہ سب ظاہری یا اخلاقی اثر خواجہ صاحب کی تحریروں کا ہے کیونکہ سب سے پہلے حضرت خواجہ صاحب نے صوفیانہ رسالہ "نظام المشائخ" جاری کیا تھا۔ بعد میں اس کے اثر سے اور رسالے نکلنے لگے۔

خواجہ صاحب کی تحریر میں غالب مقصد تصوف ہے۔ اس کے علاوہ غربا، شریف، محتاجوں اور بیکس لوگوں کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ بھی درحقیقت تصوف ہی کی ایک شاخ ہے۔ ان تحریروں کو بھی تصوف کے تحت میں رکھ کر پڑھنا چاہیئے۔

پالٹیکس و سیاست کی نسبت جو مضامین خواجہ صاحب کے قلم سے نکلے وہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مذہب اور مظلوموں کی حمایت کرتے وقت، جو ایک جزو تصوف ہے، خواجہ صاحب نے ایسا لکھا جس کو حکومت نے پالٹیکس سمجھا اور خواجہ صاحب کو اس سے کچھ تکلیف مالی و جسمانی کا مقابلہ کرنا پڑا۔

یہ تصوف کا مشہور اصول ہے کہ سب قوموں اور فرقوں سے یکساں محبت کرنا خواجہ صاحب کے مضامین میں یہ وصف بھی جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مسئلہ وحدت وجود کے بیان میں متقدمین نے چند مثالوں اور تشبیہات کو مخصوص کر لیا

تھا جو شخص کچھ لکھتا انہی مثالوں کو پیش کرتا تھا حضرت خواجہ صاحب کی یہ جدّت صدیوں زندہ رہیگی کہ انہوں نے ہزاروں نئی تشبیہات اس مسئلہ کی تشریح کے لئے اردو میں پیدا کردی ہیں۔ یہ مثالیں خواجہ صاحب کے زمانہ میں تو محض ادبی لطائف تصور کی جاتی ہیں مگر ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ صوفیائے کرام انہی مثالوں پر اپنے درس وارشاد کی بنیا درکھیں گے۔

اگلے صوفی شعرا نے، خصوصاً حضرت جامیؒ نے، نعت گوئی میں سوزوگداز کی بڑی بڑی مؤثر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ مگر حضرت خواجہ صاحب جس انداز سے نعت لکھتے ہیں وہ اُردو کیا کسی زبان میں اپنی مثل نہیں رکھتی۔ خواجہ صاحب شوق اور درد کو مجسم بنا کر کھڑا کردیتے ہیں اور مسلمانوں کے دل میں اپنے رسولؐ کی محبت کو ایسا بھڑکاتے ہیں کہ سنگدل سے سنگدل لوگ بھی حبِّ رسولؐ میں آنسو بہائے بغیر نہیں رہتے۔ ان دونوں باتوں کا ثبوت، جن کو میں نے اب لکھا ہے ناظرین اس کتاب میں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ آیا وحدت اور نعت میں اس سے زیادہ مؤثر کوئی تحریر ان کی نظر سے گذری ہے؟

بندے اور خدا کے راز و نیاز، شوخیاں، گستاخیاں اور مستی سے بھری ہوئی محبت خواجہ صاحب سے پہلے شاید ہی کسی کے قلم سے اتنی زیادہ نکلی ہوں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس عجیب پیرائے سے پہلے شاید کسی نے بھی نہیں لکھا۔ اس سے بندے کے دل میں اپنے خالق کیساتھ خوف کی مجبورانہ محبت نہیں بلکہ خالص یگانگت ویکسوئی کا تعلق پیدا ہوتا ہے اور یہی تصوف کا حاصل مطلب ہے۔

## اثر اور نرالا پن

خواجہ صاحب کی تحریر میں اثر اور نرالے پن کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک تو اُن میں یہ ہے کہ خواجہ صاحب وہی لکھتے ہیں جو خود ان کے دل پر طاری ہوتا ہے اور دل میں کبھی دل چھپنے کی طاقت نہیں دیکھی، یہ آمد ہی ہے جو پہاڑوں کو پیس ڈالتی ہے۔

دوسرے وہ نہایت عام فہم اور سیدھے سادے پیرائے میں لکھتے ہیں۔ تیسرے

جن واقعات وحالات پر وہ لکھتے ہیں وہ بجائے خود طبیعتوں کو کھینچنے والے ہوتے ہیں اور جب خواجہ صاحب کے قلم سے ادا ہوں تو ان میں چار چاند لگ جائے عجب نہیں ہیں۔ مثلاً تیموری شہزادوں کی دردناک حالتیں خود ایسی ہیں کہ معمولی طور پر بھی کوئی بیان کرے تو سننے والا اشکبار ہوجاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے جب ان کو لکھا تو قیامت ڈھادی۔ میں نے دیکھا ہے کہ پڑھنے والے یہ مضامین پڑھکر بے قابو ہوجاتے ہیں اور سنجیدہ سنجیدہ اشخاص بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ خود خواجہ صاحب کو دیکھا کہ اپنے ہی مضمون کو پڑھتے ہیں اور زار وقطار روتے ہیں۔

چوتھی وجہ نرالے پن کی یہ ہے کہ خواجہ صاحب ہر مضمون میں سب سے زیادہ غور عنوان تجویز کرنے میں کرتے ہیں بعض اوقات جب انہیں کوئی خاص مضمون آورد سے لکھنا ہوتا ہے تو گھنٹوں بلکہ دو چار دفعہ میں نے دیکھا کہ تین تین روز صرف عنوان مقرر کرنے میں انہوں نے لگا دیئے اور جب تک نرالا عنوان ہاتھ نہ آیا مضمون نہ لکھا۔

ایکدفعہ میں نے ہنسی میں اُن سے کہا، جبکہ وہ فکرِ عنوان میں بہت چُپ چُپ تھے کہ سارے جہان میں خواہ مخواہ آپ کی انشا پردازی مشہور ہوگئی ہے۔ کوئی دیکھے کہ تین دن سے ایک عنوان آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تو جانے کہ ان کو خاک لکھنا نہیں آتا۔ خواجہ صاحب اس گستاخی کو بھی پی گئے اور اپنی فکر میں لگے رہے اور جب عنوان ذہن میں آگیا تو مضمون انہوں نے دو گھنٹے میں لکھ دیا اور فرمایا کہ میری شہرت اسی کی ہے کہ میرے عنوان نرالے ہوتے ہیں۔ میں مضمون سے زیادہ عنوان کو ضروری سمجھتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ عنوان سے سارا مضمون سمجھ میں آجائے اسپر طرّہ یہ کہ مختصر ہو، نظر کش ہو اور تقلید سے آزاد ہو۔

خواجہ صاحب مقلّد ہیں اور حنفی مشرب رکھتے ہیں لیکن انشا پردازی میں تقلید سے اُن کو اتنی چڑ ہے کہ پانچ برس کی یکجائی میں میری اُن کی جب کبھی بدمزگی ہوئی تو اکثر اسی بات پر کہ وہ دوسرے لکھنے والوں کی تقلید سے خلاف قدرت گریز کرنا چاہتے تھے اور مجھ سے یہ تاکید ہوتی تھی کہ کسی اچھے یا بُرے طرز کی پیروی نہ کروں، خود کوئی بات نکالوں۔ لیکن یہ بات میرے امکان میں تھی، نہیں

اس کو اتنا ضروری سمجھتا تھا جتنا خواجہ صاحب سمجھتے ہیں۔

ان کا فرمانا ہے کہ وہ لوگ اردو کے دشمن ہیں جو اس میں عربی و سنسکرت کے بڑے موٹے الفاظ جن کو عوام نہیں سمجھ سکتے، داخل کرتے ہیں اور وہ لوگ احمق یا سرمایۂ زبان سے جیب خالی ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔ مولوی ابوالکلام آزاد کی تحریروں کو خواجہ صاحب اردو کا قاتل کہا کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی لیاقت جتانے کو ایسی اردو لکھنی جس میں دو حصے عربی ہو، اردو کے گلے پر کند چھری ہے۔ ایسی عبارتوں کے پڑھنے سے کم مایہ طبیعتیں اردو سے گھبرا جاتی ہیں اور اس کو مشکل زبان سمجھنے لگتی ہیں۔ حالانکہ حامیانِ اردو کا فرض ہونا چاہیئے کہ اسے عام پسند بنائیں

خواجہ صاحب نے اردو میں جو نئی راہ نکالی ہے جس کا ہر انشا پرداز کو اقرار ہے، اس کا راز یہی غیر مقلدی ہے۔ ایک بات کسی شخص نے ایک پیرایہ سے بیان کی اور خواجہ صاحب کو منظور ہوا کہ اس کی تائید کریں تو وہ کبھی اس کے بیان کردہ پیرایہ کی نقل نہیں کریں گے بلکہ ایک ایسے انداز کی تلاش میں رہیں گے جو سابق لکھنے والے سے علیحدہ ہو اور بالکل ایک نئی مستقل بات بن جائے اس کوشش میں وہ ہفتوں مصروف رہتے ہیں اور مضمون نہیں لکھتے جب تک جدت ان کے قبضہ میں نہ آجائے۔

صوفیوں کے اصول یکسوئی خیال کو وہ مضامین نویسی میں ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں یعنی جب ان کو کوئی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو پہلے اسکو کچھ دیر خاموش ہوکر خیال میں جاتے ہیں اور پھر بیٹھکر آن کی آن میں جھٹ پٹ لکھ ڈالتے ہیں جتنی دیر ان کو خیال کے اندر مضمون کو یکسو کرنے میں لگتی ہے اتنی دیر لکھنے میں نہیں لگتی۔

ایک وجہ اثر ادرڈالے پن کی اور بھی ہے کہ خواجہ صاحب وقت شناس بہت زیادہ ہیں جس وقت میں کوئی بات خلقت کی طبائع پر مسلط ہوتی ہے تو خواجہ صاحب اس بات کو بالکل پبلک کے احساس کے موافق مضمون میں ادا کر دیتے ہیں اور خلقت اس سے قدرتاً بیحد متاثر ہوتی ہے۔

یہ بلکہ ہر شخص میں نہیں ہوا کرتا فطرت کے مطالعہ اور قدرت کے نظاروں کی محویت اور کچھ خداداد ذہانت سے یہ چیز میسر آتی ہے۔ خواجہ صاحب کے مضامین کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں کا بیشتر حصہ

ایسا نکلیگا جس سے معلوم ہوگا کہ انکا ہر مضمون اپنے وقت پر ہندستان میں بڑی ہلچل ڈال چکا ہے۔

یہ نوعیت جناب اکبر الہ آبادی سے بہت ملتی جلتی ہے وہ بھی کسی ایسے واقعہ کو نہیں چھوڑتے جس کا پبلک میں زیادہ چرچا ہو بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سوائے ایسی موثر باتوں کے اور کسی چیز کو چھوتے ہی نہیں۔

یہ کچھ غیبی بات ہے کہ فطرت یکایک کسی بات پر توجہ دلاتی ہے۔ دہلی میں ایک دفعہ گرمی کے شدید موسم میں نل بند ہوگئے اور خلقت ایسی پریشان ہوئی کہ قیامت کا مزا آگیا۔ رات کیوقت خواجہ صاحب کچھ لکھنے بیٹھے میں نے منع کیا کہ گرمی میں لیمپ کے آگے نہ بیٹھیئے مگر وہ ایسے محو تھے کہ میرے کہنے کو سنا بھی نہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک مضمون تیار کرلائے جس میں نلوں کی بندش پر ایک بڑے لطف کا صوفیانہ نوٹ تھا میں نے راتوں رات اُسکو لکھوا کر بصورت اشتہار چھپوایا اور صبح تمام شہر میں چسپاں کرا دیا پھر تو یہ کیفیت تھی کہ دہلی میں ایسے شوق سے آجتک کوئی اشتہار نہیں پڑھا گیا۔ جیسا کہ یہ۔ ہر اشتہار کے آگے چار پانسو آدمیوں کا ہجوم ہوجاتا تھا اور راستے بند ہوجاتے تھے۔

خواجہ صاحب نے اس مضمون میں یاد دلایا تھا کہ اگر خدا پانی کے چشمے خشک کردے تو کون تمکو پانی دے اور تمہارا کیا حال ہو جبکہ تم ایکدن میں ایسے پریشان ہوگئے۔ ان کا اشتہار اس آیت پر تھا جو قرآن پاک کے انیسویں پارے کی سورۂ ملک میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا پانی زمین کی تہ میں سوکھ جائے تو کون اس کو اوپر لاکر بہائے۔ اس کی تفسیر ایسے دلکش انداز سے ہوئی تھی کہ ہندو مسلمان یکساں جھومتے تھے۔

خواجہ صاحب نے اس قسم کے سینکڑوں اشتہار لکھے ہیں مگر افسوس کہ اس مجموعہ کی ترتیب کے وقت وہ ناپید ہوگئے ورنہ ناظرین دیکھتے کہ فطرت کے اس فوٹوگرافر نے اپنے وقت میں کیا کیا کام کئے اور معمولی معمولی باتوں کو کیسے چار چاند لگائے ہیں۔

نرالے پن کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدا سے خواجہ صاحب کی نظر ذلیل اور بے حقیقت اشیا پر جاتی تھی اور یہ وہ چیزیں تھیں جنکو اچھا لکھنے والوں نے اپنی بلند نظری کے سبب نظروں سے گرادیا تھا۔ خواجہ صاحب نے انہی کو اٹھایا اور چونکہ عوام کے طبائع کیلئے یہ بڑی کشش دار چیز تھی اس واسطے ہر دل میں ان کا گھر بن گیا۔

# دلچسپ جزئیات

اب میں بہت معمولی باتوں کو اپنے حضرت کی پیروی میں لکھتا ہوں جو اول اول تو معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر آخر میں اُنہی سے کیرکٹر کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بہت نحیف البدن اور دائم مریض رہنے والے ہیں کوئی شخص انکو دیکھے تو کبھی خیال نہیں کریگا کہ وہ ایک وقت اور ایک نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک رسالہ دو جز کا لکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ دیکھا گیا اور بارہا دیکھا گیا کہ انہوں نے ایسا کیا۔ خواجہ صاحب کی قلم دوات کبھی صاف ستھری نہیں رہتی نہ ان کو مضمون لکھنے میں اچھے کاغذ کی تلاش ہوتی ہے جہاں وہ لکھتے پڑھتے ہیں وہاں اسقدر پراگندہ کاغذات اور چیزوں کا ڈھیر ہوتا ہے کہ آدمی دیکھکر گھبرا جائے۔ مگر خواجہ صاحب اس کوڑے کرکٹ میں بیٹھے لکھا کرتے ہیں۔ ان کو مضامین تین حالتوں میں زیادہ سوجھتے ہیں۔ ایک گانے میں، دوسرے تھیٹر میں تیسرے کسی عاشق یا آشفتہ حال کو دیکھنے میں تھیٹر کا تماشہ بہت دیکھتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے تماشہ دیکھکر کوئی مضمون نہ لکھا ہو۔ یہ مضمون نفس تماشہ پر نہیں ہوتا تھا بلکہ تماشہ سے متاثر ہو کر کسی نئے خیال پر خامہ فرسائی کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ تماشہ میں مَیں ساتھ ہوں اور خواجہ صاحب بجائے لطف کے تماشے میں غمگین و افسردہ ہیں حالانکہ تماشہ میں کوئی بات غم کی نہیں ہے۔ گھر آکر میں سو گیا اور خواجہ صاحب صبح تک کچھ لکھتے رہے۔ "غریب شہید کا گھر" "تبریزی یتیم کی آہ" وغیرہ مضامین اسی طرح لکھے گئے ہیں جنکو لکھکر خواجہ صاحب رات بھر پڑھتے اور روتے رہے اور صبح کردی۔ بعض اوقات میں نے دیکھا کہ وہ آدھی رات کو خود بخود بیدار ہو کر لکھنے لگے۔ پوچھا تو فرمایا کہ کل شام کو فلاں بات نے بہت متاثر کیا تھا۔ اب خود بخود آنکھ کھل گئی اور اس کے لکھنے پر طبیعت مجبور ہوئی۔

انکی طبیعت بہت حاضر ہے لیکن ہر وقت یہ حالت نہیں رہتی بعض اوقات وہ بغیر تخلیہ اور تنہائی کے کچھ نہیں لکھ سکتے مگر عام طور پر وہ مجمع میں باتیں کرتے جاتے ہیں اور لکھتے جاتے ہیں۔ ایکدفعہ میں نے امتحان لیا رات کا وقت تھا بہت سے لوگ جمع تھے میں نے سوچا کہ خیال میں جمائے بغیر خواجہ صاحب کچھ نہیں لکھ سکتے ہیں اسواسطے فرمائش کی کہ اس مجمع میں کچھ لکھیئے اور میرے بتائے ہوئے عنوان پر لکھیئے۔ شرط یہ ہے کہ دو چار

آدمی باہم باتیں بھی کرتے جائینگے۔ آپنے ہنسکر اسکو قبول کیا اور لالٹین جو اسوقت روشن تھی وہی عنوان قرار پایا۔ آپنے فرمایا میں بولتا جاتا ہوں ایک آدمی لکھتا جائے تم سب آپس میں باتیں کرو۔ چنانچہ ایساہی ہوا اور ۲۵ منٹ میں خواجہ صاحب نے ایک لمبا اور نہایت دلچسپ معنی خیز مضمون لالٹین پر لکھوادیا جو شاید اس کتاب میں بھی ہو۔ فرمائشی مضمون نویسی سے انکو نفرت ہے مگر موقعہ آجاتا ہے تو اسکی تعمیل بھی خوب کر دیتے ہیں۔ ایکدفعہ میں نے عرض کیا کہ کاپی نویس بیکار بیٹھے ہیں بڑا حرج ہورہا ہے جلدی ایک ۲ صفحے کا مضمون دیجئے۔ فرمایا پانوں کی ڈبیہ منگاؤ اور دروازے پر بیٹھکر آنیوالوں کو روکو۔ میں نے ایسا کیا۔ آدھ گھنٹہ میں نقطہ کے عنوان پر چھ صفحے لکھکر دیدیئے۔

اب وہ مضمون لکھنے میں ہاں بہت کھاتے ہیں۔ ہاں جبتک پاس بہوں مضمون اور انہیں دشواری ہوتی ہے باجہ بج رہا ہو تو وہ دور بیٹھکر بہت اچھا مضمون لکھ لیتے ہیں۔ انہوں نے گراموفون محض مضمون لکھنے کی خاطر خریدا ہے۔ دوسرا آدمی اسکو بجاتا جاتا ہے اور وہ مضمون لکھتے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا شہرۂ آفاق مضمون "ہو تکبیر" جو ضبط ہوگیا اور اب اُسکے شائع ہونیکی ممانعت ہے اور جو کانپوری مسجد کے معاملہ میں لکھا گیا تھا اور جس کے ترجمے تمام عربی و ترکی اخبارات تک نے شائع کئے تھے اور جو ابتک ہندوستان میں سینکڑوں آدمیوں کو حفظ ہے، اسی طرح لکھا گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ خواجہ صاحب نے سحری کیوقت گراموفون بجوایا اور اسوقت یہ لکھا۔ یہ واقعہ میرٹھ کا ہے جبکہ خواجہ صاحب اخبار "توحید" کی ایڈیٹری کرتے تھے اور میرٹھ میں مقیم تھے۔ علمی مضامین بھی وہ خوب لکھ سکتے ہیں مگر اُنکا فرمان ہے کہ ہمارے مخاطب جاہل لوگ ہیں۔ ہمکو اُنکی زبان میں بات کرنی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو سمجھانے کیلئے ہزاروں پڑھے لکھے عالم فاضل لکھنے والے موجود ہیں مگر ان غریبوں کا کوئی نہیں۔ وہ غم کے مضامین بہترین لکھتے ہیں۔ ظرافت میں بھی انکے قلم کو بہت قدرت ہے۔ اخبار "خطیب" میں گُدگُدیوں اور چٹکیوں کے عنوان سے انہوں نے ایسی ظریفانہ عبارتیں لکھی ہیں جو اپنی شان میں سب سے نرالی ہیں اور جنکو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ خواجہ صاحب کا قلم کسی مضمون میں بند نہیں ہے۔ وہ ہر بحث میں صوفیانہ نکتہ نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ اخبار خطیب میں انہوں نے علم طب پر ایسے ایسے صوفیانہ مضامین لکھے جنکی طبقۂ اطبا میں دھوم مچگئی۔ ایک مضمون خیال میں آئے اور اُسکو نہ لکھ سکیں تو خواجہ صاحب بیمار ہوجاتے ہیں۔ وہ مضمون لکھکر مسودہ کو صاف یا نقل نہیں کرسکتے اور کہتے ہیں کہ نقل کرنا مشکل، دوسرا تیار کرنا آسان۔ اردو ترقی کرتی رہی تو وہ وقت دور نہیں کہ خواجہ صاحب کے مضامین پر بڑی بڑی لیاقت والے مجھ سے زیادہ لکھیں گے۔ میں تو اتنا ہی لکھ سکا۔ فقط۔

واحدی

# پہلی منزل

## بندہ اور خدا کے راز و نیاز

## مست الست کی دعا

(از رسالہ نظام المشائخ دہلی۔ جولائی ۱۹۰۹ء)

بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی، دلگیری و دل داری کے مالک! عرش کی اقامت میں جدا، دل کے گھرانے میں خدا! ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے ہم کو سربلند کر، فرش میں سماتا ہے تو وسعت و ثابت قدمی عنایت فرما۔ دل میں ٹھکانا ہو تو اس کو اپنے رہنے کے قابل بنا دے، رگ جان میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن بان کا جوش پیدا کر۔ اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا۔

تو عالم ہے، اپنے علم کا حصہ ہم کو بھی دے۔ رازق ہے، ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے، رحمت نازل فرما۔ قہر و جبر کی تلوار ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے۔ خیر کو وسعت دے کر شر سے بچا۔ ہماری آنکھ بن، تجھ سے دیکھیں۔ کان بن، تجھ سے سنیں۔ زبان میں تو ہی بول۔ ہاتھ سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آجا۔ قریب ہے تو اقرب ہو جا۔ اقرب ہے تو "نحن اقرب" کا حجاب بھی اٹھا دے۔ پھر ہم اور تو کا لفظ

بھی فنا ہوجائے اور فنا کو بھی ایسی فنا ہو کہ ازل سے ابد، عدم سے نمود، نمود سے عدم۔ جہاں تلاش کریں اُس کا وجود بصارت و بصیرت کو نظر نہ آئے۔ اے حمد و ستائش کے قابل خدا، تو خود آ تاکہ ہم تیری تعریف کریں۔ تیری تعریف اور تیرے رنگ برنگ کے ناموں کی تعریف۔ تیرے اچھے بُرے کاموں کی تعریف۔ او گاڈ! یورپ کے منکروں کا انکار اقرار سے بدل دے۔ ان کے پیاسے دل کو روحانی تسلی کی ایکشا مگر وہ بھی نمبروَن عنایت فرما۔

ہے پُرشوتَم پَرَم آتما! اگر تو نِرگُن ہے تو ہم کو سَگُن بنا دے۔ نِراکار ہے تو ہماری موہوم شکلیں بھی مٹا دے۔ سَگُن بن جا۔ ساکار ہو جا اور اپنی پَریم شکتی کو دنیا میں پرگھٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں۔ تیرے سوا کس کو دیکھیں۔ اے مکہ کے سیاہ پوش مکان پر نظر خاص رکھنے والے۔ اے صلیب کی صورت کو عزت دینے والے۔ اے ہر دوار کے دوارے رہنے والے۔ تجھکو ہم یقین دلاتے ہیں کہ تو ہی ہے اور کوئی نہیں تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا، اور جو کچھ ہے، کچھ بھی نہیں۔ تو ہی تو ہے اور بس۔ تو دیکھتا ہے مگر ہم بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ تو سنتا ہے مگر ہم بھی سنانا چاہتے ہیں۔ سن اور دیکھ۔ امیدیں ڈوب رہی ہیں، ارمان جل رہے ہیں، ماتم برپا ہے۔ نوحوں کا شور مچ رہا ہے۔

یہ ملک ہندوستان، اس کو تیری امان۔ فساد و خونریزی، قحط و بیماری۔ کاہلی و بیکاری، سب آفتوں سے، جو زمین کی ہوں یا آسمان کی، مشرق کی ہوں یا مغرب کی، دین کی ہو یا دنیا کی، حفاظت دے۔

مسلمان، بے یار و مددگار مسلمان۔ غریب و لاچار مسلمان، کسی زمانہ کے تاجدار مسلمان، وہ جو بھوکے سوتے ہیں، بھوکے بیدار ہوتے ہیں وہ جو ٹھکرائے جاتے ہیں، جن پر رونے والے بھی ہنستے ہیں۔ خدا وہی تیرے پیارے محمد صلعم (ہم اس نام پر فدا ہو جائیں) کے پیارے مسلمان۔ آج زمین و آسمان میں اُن کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ نرم غالیچوں کے بدلے خاک کے بچھونے

پر پڑے ہیں، مگر اب بھی گردش کو چین نہیں۔ وہ اس سے بھی سے گئے گذرے ذلت کے گڑھے میں ڈالنا چاہتی ہے۔ تو ان کی حمایت کر۔ صدقہ مدینے کی گلیوں کا۔ صدقہ اُس خاک کے ذروں کا جو تیرے رسولؐ کے قدموں سے پامال ہوئی۔

اے مشکلوں کے حل کرنے والے۔ اپنے دیوانے مستانے صوفیوں کو اپنے اشارۂ چشم سے آمادہ کر کہ وہ اپنے بیکس و بے بس مسلمانوں کی دستگیری کو کھڑے ہوجائیں، پہلے ان کے سلسلوں کو اکھٹا کرتا کہ ان کی قوت مجتمع ہو اور وہ ظاہری مرحلے بھی اسی اجتماع سے طے کریں جس طرح باطن کے مقامات اجتماع حواس خیالات سے ہوتے ہیں۔

الٰہی! حلقۂ نظام المشایخ اور رسالہ نظام المشایخ کو گروہ مشایخ کا سچا پکا مخلص خادم بنا اور اور اس کے فرائض کو پختگی سے پورا کرنے کی توفیق عنایت فرما۔ آج جس میدان میں یہ قدم ہم نے رکھا ہے اس کو ایسا بنا دے کہ ہم اور قدم بھی وہاں اٹھا سکیں اور منزل پر پہنچ جائیں آمین ثم آمین اور پھر آمین۔

---

# آہ! یہ خط

مدت کے بعد خط آیا۔ تسلی بھی تسکین بھی، خشم و عتاب بھی۔ زخموں پر مرہم رکھ دیا اور ہاں نمک پاشی بھی کی۔

خط! اچھے اچھے حرفوں والے، پیارے پیارے مطلب والے، آ! بہت راہ دکھائی، تجھ کو پہلے آنکھوں سے لگاؤں، کلیجہ پر رکھوں اور دل پر بھی جو رکھوں پھڑکتا ہے اور تجھ کو مانگتا ہے تو کس کا نامہ ہے۔ تجھ میں کیا لکھا ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

قاصد پر نثار۔ کیا ہی اچھا پیام لایا۔ ہاں تو یہ تاکید کر دی ہے کہ میرے مکتوب کا ادب کیا جائے، ناپاک ہاتھ نہ لگیں۔ دل و جان سے منظور۔ پیارے پیارے کا خط ہے۔ بھلا اس کی بے ادبی ہوسکتی ہے؟

لکھا ہے یہ خط ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ ہاں ہاں کچھ شک نہیں۔ بلاشبہ یہ آپ کا نامہ ہے۔ آپ بھی سچے اور آپ کا مکتوب بھی اور وہ قاصد بھی جو پیام لایا۔

آپ کی یاد میں آپ کے انتظار میں از خود رفتہ دیکھ کر اکثر لوگوں نے فرضی خطوط بنا کے اور کہا کہ یہ ان کا ہے جنہیں تم یاد کرتے ہو۔ مگر تسلی نہ ہوتی تھی۔ یقین نہ آتا تھا۔ شاید آپ کو بھی اغیار کی کارستانیوں کی خبر پہنچ گئی۔ جو لکھا کہ اس خط میں شک نہ کرنا۔ نہیں جناب۔ یہ تاثیر یہ تجلی یہ کشش اوروں میں کہاں تھی۔ دلی یقین کے ساتھ پڑھوں گا۔ آنکھیں ترس گئی ہیں۔ پتلیاں سیر نہیں ہوتیں اور کہتی ہیں خط! ہم تیری یاد میں روتے تھے پلکیں آنسوؤں سے بھگوتے تھے۔ تو اب آیا۔ بتا دے کیا تو آیا ہے۔ تو ہمارے پیارے کا پیارا خط ہے۔ قاصد نے تیرا نام قرآن بتایا ہے۔ دل یہ کہتا ہے کہ تو قرۃ العین ہے۔ اب تیرے بھیجنے والے سے مخاطب ہوتا ہوں۔ بندہ نواز! آپ نے جو یہ تحریر فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت آسمان زمین اور پہاڑوں کے پاس رکھنی چاہی تھی مگر سب نے انکار کیا اور اس بھاری بوجھ کی ذمہ داری سے ڈر گئے اور تو نے اس بار کو اٹھا لیا۔ میں اس لکھنے سے بہت شکر گذار ہوا۔ اس تحریر سے آپ نے میری قدر بڑھائی اور چشموں میں ممتاز کیا لیکن یہ محض ذرہ نوازی ہے ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس نازک امتحان میں پورا اترتا۔

یہ چھیڑ خانی کا فقرہ خوب فرمایا کہ تو بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ ہاں جناب جو مرضی میں آئے ارشاد کیجئے۔ آپ کے دلدادہ ہیں۔ سب کچھ سننا ہی پڑیگا۔

نوکدار نشتروں کی امانت بھی دل و جگر میں رکھیں اور پھر آپ کی نرم گرم باتیں بھی سنیں ہم جاہل ہی سہی، ظالم سہی، ناعاقبت اندیش سہی۔ پر یہ تو دیکھئے کہ جان پر کھیل گئے اور آپ کی فرمائش کو نہ ٹالا۔ اتنے بڑے ٹیل ڈول کے آسمان، ایسی چوڑی چکلی زمین، اور بھاری بھرکم پہاڑوں نے جس بات سے منہ چھپایا اور حیلہ حوالہ کرنے لگے، اُس کا برداشت کرنا ایک مشتِ خاک سے کیونکر ممکن تھا۔ مگر محض آپ کی رضامندی کی خاطر اس ہولناک

منزل میں قدم رکھدیا آپ کو خبر بھی ہے؟ آپ کی امانت کے سبب ہم پر کیا گذرتی ہے۔ آپ کی چاہت کا دم بھرنے والے میاں شیطان رات دن چوری کی فکر میں ہیں۔ ہر وقت وہ اور ان کے یار غار خانۂ دل کے گرد منڈلایا کرتے ہیں کہ موقعہ بنے تو وار کر جائیں اور ہمکو آپ کے سامنے خائن ثابت کر کے شرمندہ کرادیں۔

اس بیرونی طوفان کی حفاظت کے علاوہ ذرا اندرونی مشکلات کا حال بھی سنیئے۔ آپ کی امانت ہے تو بالکل سربستہ اور سربمہر، کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے اور اس میں کیا ہے لیکن عجب طلسماتی پڑیہ ہے۔ جہاں رکھی جائے وہیں ایک طرح کا سوز بے کلی اور اضطراب پیدا کردیتی ہے۔ اُلجھن ہوتی ہے۔ شہر میں جی گھبراتا ہے۔ جنگل ویرانے میں نکل جانیکو طبیعت چاہتی ہے۔ دنیا کی شان وشوکت، زیب وزینت، عیش وراحت سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ آنکھیں سونا کم کردیتی ہیں۔ زبان اپنا مزہ بھول جاتی ہے۔ بات چیت میں بھی زیادہ چلنا پسند نہیں کرتی۔ پیٹ مَن بھاتی غذائیں نہیں مانگتا۔ جو دے وہ لے لیتا ہے اور وہ بھی بار بار نہیں کئی کئی وقت کے بعد اپنے بیگانے غیر اور بیگانے معلوم ہوتے ہیں یہانتک کہ خود اپنا تن مَن بے حقیقت وبیکار نظر آنے لگتا ہے۔ تو جناب امانت کیا ہے۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ تاہم ع۔ ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

سبحان اللہ! آپ کی تحریر کی آن بان کے قربان، نوازش کا اظہار ہوتا ہے۔ قہر وغضب کی شان کا ذکر بھی کردیا جاتا ہے۔ وعدۂ وصل سے ڈھارس بندھائی جاتی ہے تو فرقت وجدائی کی دھمکی بھی ساتھ ہی ملتی ہے۔ جناب! کون کہتا ہے کہ آپ رحیم نہیں، کریم نہیں، دلنوازی نہیں کرتے۔ چارہ سازی نہیں فرماتے۔ آپ کی ذات سے اس سے بڑھ بڑھکر امیدیں ہیں لیکن ان دھمکیوں سے کیا حاصل۔ ہم پہلے ہی ڈرتے ہیں اور حضرت کی بے نیازی اور کبریائی سے خوف کھاتے ہیں۔

اس خط میں سرکار نے سب کچھ تو لکھا ہے مگر یہ نہ بتلایا کہ اب آپ کا دیدار کس دن

میسر آئے گا۔ اس وعدے سے اطمینان نہیں ہوتا کہ عنقریب ہم تم سے ملیں گے۔ وقت بتائیے۔ منٹ اور ساعت مقرر کیجیے اور ملاقات کے پروگرام سے آگاہی بخشئے۔ ایسی گول مول بات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہے گا اور ہر وقت انتظار کا سامنا ہوگا جو موت سے زیادہ سخت چیز ہے۔

برافگن پردہ از رخ بے محابا یکے کن وعدۂ امروز فردا

# آ

(از رسالہ نظام المشائخ ۱۹۱۲ء)

خوشی بن کر آ، غم میں سما کر آ، نگر آ، عید کے چاند میں آ، محرم کے ہلال میں نظر آ، چمک میں جھلک میں تاریکی میں لہریں لے۔ کڑک سے دل ہلا لیکن اسے آنے کے قابل آ۔

رمضان کے سناٹے میں آیا تھا دیکھ کے قرآن کی خوش لحنی میں جلوہ دکھایا۔ افطاری کے وقت تیری مزیدار آہٹ سنائی دی۔ اب بھی آ جس طرح چاہے آ لیکن آ۔

کہتے ہیں تو ہر چیز میں آسکتا ہے۔ ہر حال میں تیری آمد کا امکان ہے۔ تیرے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ تجھ کو بلانے کی ضرورت نہیں، آ۔ ہے بغیر جو آجائے۔ بلا حرکت متحرک ہو، وہ تو ہے۔ تو بس اسی طلسماتی۔ غیر مفہوم چال سے آجا۔ دیکھ آجا۔ سن آجا۔ سمجھ آجا۔

ہم کو وہ دیدار دے جو دیدۂ دیدار طلب کے شایان ہو۔ موسیٰ کو بے ہوش کرنے والا طور کو خاک سیاہ بنانے والا نہیں۔

# ہلالِ عید

آسمان کے کونے میں منہ نکالے ہمکو دیکھ رہا ہے ہم اسکو دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہی پارۂ نور ہے جو ہر ماہ کے ختم پر چھپکر نکلتا ہے۔ مگر کبھی آج کی سی خوشی، اُمنگ، کیفیت، پیدا نہیں

ہوئی۔ یہ کیوں؟ کیا تو اس کے پردہ میں اپنی ابرو دکھا رہا ہے۔ ہاں تو ہی ہو گا نہیں تو ہی ہے۔

ایسے عالم بیشمار ہیں۔ ایسے فلک لاتعداد ہیں۔ چاند بھی بہت سے ہوں گے اور دیکھنے والے بھی، پھر تو کہاں کہاں چشم نوازیاں کرنے جائیگا۔ آ۔ تجھے اپنی آنکھ میں چرا کر چھپا کر رکھ لیں۔ اپنے لئے اور اپنے دل بیقرار کے لئے۔ بڑی سیر ہو گی تو ذرا ہم میں چھپ کر تو دیکھ۔ لوگ تجھے ڈھونڈھتے پھریں گے۔ عرش و کرسی پریشان ہونگے فرشتوں کو تلاش ہوگی۔ دوسری دنیا کے باشندے عید کی بہار چھوڑ کر تیری جستجو کی سرگردانی میں پھنس جائینگے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہماری آنکھ کا خانہ چھوٹا ہے۔ اس میں تیری گنجائش نہ نکلے گی، نہیں دریا حباب میں آسکتا ہے۔ انجن کی وہ بھاپ جو ریل کی لمبی قطار کو کھینچ کر لے جاتی ہے اور خود انجن کی حرکت اس کے دم سے ہے، کہاں رہتی ہے؟ انجن کے ایک چھوٹے سے ظرف میں۔

اچھا یوں نہیں تو پھول کی خوشبو کی طرح دل کے گل میں سما جا۔ یہ مدلل مطالبہ قبول کر۔

## چاند رات

چاند تو چھپ گیا مگر چاند رات موجود ہے۔ ہر طرف اندھیرا اور یہی رات جو روز آیا کرتی ہے۔ پھر یہ چہل پہل گہما گہمی کیسی؟ ہو نہ یہاں بھی تیرے گیسوؤں کی شرکت ہے۔ بے شک یہی بات ہے۔ قسم لے لے۔ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى

## صبح عید

آنکھ کھلنے سے پہلے، سورج نکلنے کے اول اذکار کو شکست ہوئی۔ اسرار نے شرور کے کپڑے پہن لئے اور فتحیابی کا جشن تیار ہو گیا۔ عید گاہ میں چھوٹے بڑے اچھے

بُرے سب تیرے لئے جمع ہوئے ہیں۔ کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں اُجھک کر دیکھتے ہیں اور عاجز ہو کر سر خاک پر رکھ دیتے ہیں۔ اب تو آجا اور گلے مل جا۔

سُنا تھا کہ تو دلوں میں رہتا ہے اس لئے ہر شخص سینے سے سینہ ملا کر معانقہ کرتا ہے کہ شاید کسی کے دل میں تو مل جائے۔ مگر تو کیوں حجاب کرتا ہے اور ملنے سے گریز کرتا ہے۔ آج کے دن بھی نہ ملا تو کب ملیگا؟

دیکھ آ۔ اب صبر نہیں ہو سکتا۔ دامن قرار ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ تو نے کہا تھا اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔ سو تجھ ہی سے مانگتے ہیں اور تجھ ہی کو مانگتے ہیں۔

وعدہ پورا کر اور آ۔ یہ عید ہے۔ وعید کا خیال چھوڑ دے۔ اگر تو مَن جائے تو ہماری عید بھی مَن جائے گی۔

# دُعائے بیقراری
## اور
# دلِ آشفتہ کی بکا و زاری

رمضان المبارک ۱۳۳۱ ہجری کی اکیسویں تاریخ کو منزل گاہ حلقہ المشائخ میں امیرالمومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہ کا سالانہ عرس تھا۔ یہ دعا چند گرم فقروں کے اضافہ کے ساتھ اسی موقعہ پر خواجہ صاحب مدظلہ نے پڑھی تھی۔

الٰہی تجھ سے کیونکر مانگیں۔ دل کو قرار نہیں طبیعت کو یکسوئی نہیں۔ زبان میں گویائی نہیں۔ پہلے قرار دے۔ اطمینان عطا فرما۔ بولنے اور مانگنے کی طاقت مرحمت کر تاکہ کہیں سانس کی خفیف

اُس کی خیر اور اُس کی خیر جس کی دم شماری کا وقت آگیا. دل کی حرکت بند ہو جائے تو انسانی مشین رُک جائے مگر ایسی حرکت سے بچا جو درجۂ اختلاج کو پہنچ گئی ہے. جب دل ذرا صحت پر آئے گا تو پکاریں گے اَللّٰھُمَّ یَا رَبَّنَا اے پروردگار! اُدھر جگہ حاضر! آج کی رات کا صدقہ. ہماری دعا کو سُن. یہ وہ شب ہے جس میں تیرے شیر، تیری تیغ، اور تیر سے کلمہ. علیؑ مرتضٰی ع کی یادگاری کا سالانہ جلسہ منانے کیلئے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں

برادرِ رسولؐ. زوجِ بتولؓ. پدرِ فرزندانِ ملول. رموز و اسرار کے خرقہ پوش عیب کا رون کے پردہ دار. حیدر کرّار شہسوارِ کارزار. اَن داتا. من داتا. تجھ پر سلام اور اُس برکت والی روح پر سلام جس کے وسیلہ سے دنیا کی اس شب تار میں خدائے برتر سے دل و جان کا اُجالا مانگا جاتا ہے۔

اللہ میاں! تم دیکھتے ہو بجلیوں کی روشنیوں سے آنکھوں پر انجن کی چیخوں اور توپ کی گرجوں سے کانوں پر. الحادی فلسفہ کی دلیلوں سے عقل و حواس پر حملے ہو رہے ہیں۔

نورِ علوی کو ظاہر کرو کہ برقی رو ماند ہو جیدری نعرے کو بلندی دو، جس سے عارضی آوازیں پست ہوں. علوم (ربّانی) کے باب کھول دو عقل و حواس اپنی ہستی کو بچائیں آمین اے ربّ العٰلمین آمین. اے قبول کرسکنے والے! یہ کون ہے جو پوچھتا ہے کہ علی مرتضٰی کی روح یہاں کہاں؟ جس پر سلام بھیجتے ہو. بے تار کے برقی اشارات کی طاقت کو نہیں دیکھا. اس آلہ سے بڑھ کر ہم کو ہنر یاد ہے. ہم جو چاہیں کہیں اور اُن کو سنائیں۔

اے بیکسوں اور لاچاروں کی پناہ! ہماری مرادوں کو پورا کرنے والے. ہم کو اپنے در کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکا. معاش کی طلب میں در در کی ٹھوکریں نہ کھانے دے اپنے غیب کے خزانے سے رزق عنایت کر. بے اولادوں کو ایسے فرزند مرحمت فرما جو دین اسلام کے سپوت ہوں۔

خداوندا! اہلِ دہلی. حاضرینِ مجلس اور حلقہ نظام المشائخ کے تمام ممبروں کی دلی مرادیں

پوری کر۔ خاص کر ان کے مقاصد برلا جنہوں نے حلقہ کے دعاخانہ میں اپنی مختلف ضروریات کے لئے دعا کی خواستگاریاں بھیجی ہیں۔ الٰہی ان سب کے ارمان برآئیں جو اس حلقہ اور دُعا خانہ اور اس قسم کی مجالس کے معین و مددگار ہوں۔

اور مجھ بے وجود کو بھی توفیق دے کہ زمانہ کے فیشن اور نمائشی نفاق آمیز اعمال سے محفوظ رہوں۔ جو کچھ کہوں وہی کروں اور تیری رضا کی حد سے آگے نہ بڑھوں۔

# بھگت کے بس میں آ بھگوان

(از اخبار "توحید" میرٹھ مورخہ ۱۶۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

## یا رحمٰن یا سبحٰن

## تیری سمرن جپوں، آگے سیس دھروں، کیسے بھگتی کروں

## اے بھگوان، اے سبحٰن، اے رحمٰن

موسےؑ کے زمانہ کا چرواہا ہوتا تو تجھ کو اپنے گھر بلاتا، پاؤں دباتا، سر دھلاتا، ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پلاتا۔ تو سوتا تو پنکھا جھلتا، تو سنتا تو گانا گاتا، روتا، رُلاتا، جاتا تو روکتا پیروں پڑتا، ہاتھ جوڑتا۔

داتا تو کہاں ہے؟ میرے من کی بپتا کے دیکھن ہار، مولی، مولی۔ سُن۔ اُلجھنوں میں ہوں، گردشوں میں ہوں، بیقراری دیکھ، آہ و زاری دیکھ، اشکباری بھی۔

آنسو دے اُن میں نہاؤں، سوزش دے تڑپوں۔ لوٹوں۔ تجھ کو پاؤں۔ بلالؓ کا دل دے۔ در آستان پر سر ٹکراؤں۔ عزت تجھ سے ہے۔ ذلت تجھ سے ہے میرے پرکھیو بھگوان۔ اپنے بھگت کے بس میں آجا۔ دے جا۔ دلا جا۔

یہ رات کیونکر کٹے۔ تو یاد آتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے داس کو درشن دے۔
روپ دکھا۔ جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بے ہوش اور من سنتوش ہو۔ کس کا بلقان، کیسا ایران،
تیری رحمت کا چشمہ اور اس میں اشنان۔ اسی میں ہیں دونوں جہان۔ رین اندھیری۔ بدلی
کالی، رستہ بھاری، دشمن سر پر، غفلت دل میں، ہاتھ پکڑ کر بھگوان۔ میں قربان،
تجھ کو دیکھوں اور نہ دیکھوں کوئی۔ سب ہوں گم، تو ہے گر قم۔

شوکت والے، طاقت والے، توپوں اور سنگینوں والے، زخموں اور مرہم والے
دکھ کے کرتا سکھ سروپ، تیرے بھوکے، تیرے پیاسے۔ یہ ہے اچھا، تو ہو پاس۔
پھول بھی تو، خار بھی تیرا۔ نور بھی تو نار بھی تیری۔ آنکھیں میری، سب کچھ تیرا اور نین کے اندر
ڈیرا تیرا۔ بس میں آ بھگوان۔

سر ہے حاضر، کھنچے کٹاری عشق کی اگنی، چتا ہماری۔ ست پکاریں، ست
بن جائیں۔ جزو کو تیاگیں، کل ہو جائیں۔ یثرب پہنچیں مکہ دیکھیں۔ بیچ سمندر جھنڈا
گاڑیں۔ مہدی باپو گونجیں گرجیں۔ ان کے آگے چل کر کڑکیں۔ تیر چلیں سب سینوں پہ
دشمن چھدے سنگینوں پر۔

تو ہو بس میں۔ سب ہوں بس میں حسن نظامی کس کا بندہ؟ وقت کٹھن ہے۔ اٹکا
پھندا۔ بھگتی اپنی من کو دے۔ بھارت سیوا سب کو دے۔ بس میں آ بھگوان۔ تیرے
نام کو پرنام یَا ذِی الْعِزَّۃِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْاِکْرَامِ
تو اگر عہد وفا باندھ کے میرا ہو جائے ؛ گورے ملکوں کے اجالوں میں اندھیرا ہو جائے

# حروف کی دعا

الف تو آگے بڑھ اور کن کہنے والے داتا کے سامنے ہمارا وکیل بن۔ کیونکہ تو بھی

**ایک** و یکتا ہے۔ شرکت سے پاک ہے اور ہمارا خدا بھی وحدہٗ لاشریک اور غیریت سے پاکیزہ ہے۔

**مولا!** ہم حروف ہیں تیرے معانی کی امانت سینوں میں رکھتے ہیں۔ تو نے ہم کو ازل کے مخفی قلم سے پیدا کیا ہے اور ہمارے اجسام کو وہ روح دی ہے کہ ظاہر میں بے حس و حرکت و بے جان نظر آتے ہیں مگر درحقیقت زندہ ہیں اور جو ہم کو نظرِ غور سے دیکھے تو اس کو بھی زندہ کر دیتے ہیں۔

**تو نے ہم کو** وہ زبان دی ہے جو خاص تیری بول چال میں کام آتی ہے۔ یعنی یہ کہ بغیر بولے اور بغیر لب ہلائے بات ادا ہو جاتی ہے اور دوسرے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔

انسان روزمرہ کتابوں، اخباروں اور خطوط میں ہماری باتیں سنتا ہے مطلب سمجھتا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ یہ کیا بھید ہے کہ حروف منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن جہاں آنکھ کے سامنے آئے اور خود بخود ان کا مطلب ذہن میں آنے لگا۔ کانوں کو ان کی آواز سنائی نہیں دی مگر دل و دماغ میں اِن حروف کا مطلب چلا گیا۔

خدایا ایسے آدمی پیدا کر، جو ہمارے پُراسرار وجود کا اصلی مطالعہ کریں اور ہمارے ذریعہ **تو اُن کو ملجائے** اور جب تیرا ان کا وصال ہو تو اس خوشی میں ہماری مراد بھی پوری فرما اور وہ یہ ہے کہ ہم کو نااہل لوگوں کے قلم سے بچا۔ اپنے نافرمانوں کے قبضے میں نہ دے جو ہم کو تیرے وجود واحد کے انکار میں استعمال کریں۔

پروردگار! ہم عربی حروف ہوں یا سنسکرت، انگریزی ہوں یا فارسی، چینی ہوں یا جاپانی، اس لئے ہیں کہ ہم سے تیری وحدت کے مضامین لکھے جائیں نہ کہ تیری دشمنی اور مخالفت کی تحریریں ہمارے پُرزوں سے تیار ہوں۔

آؤ حرفو! اخبار "توحید" کے **قرطاس ابدی** پر صف آرا ہوں **عین** کی توپ سے **غین** پر گولہ باری کریں تاکہ غیر فنا ہو جائے اور وحدت کو مقامِ بقا حاصل ہو۔ آمین ربنا ثم آمین۔

# موسمی دعائیں

(۱) از اخبار "توحید" مورخہ ۱۴ ۲۔ اپریل ۱۹۱۳ء

تیرے نام سے شروع اے رحمت شفقت والے۔ اے آدمیوں اور سب کے پالنے والے، اے سب کے بادشاہ، اے سب کے معبود، پراگندہ دل کے وسوسوں اور شر یر خناس کے پھندوں سے محفوظ رکھ۔ جو گمراہ کرنے کے لئے بہکاتے رہتے ہیں۔

جی بیکل ہے، اس کو کل دے۔ آنکھیں خشک ہیں، ان کو اپنی محبت کے آنسو مرحمت فرما۔ خوش قول بنا۔ خوش عمل بنا۔ خوش وقت بنا۔ دشمن زیر ہوں، حاسد خوار ہوں، بدخواہوں کو رسوائی ہو۔ آزار دہندے زار و نزار ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

پاک روزی عنایت کر۔ وہ مشکلیں دور ہوں جو کسب حلال میں حارج ہیں۔ غیب کے خزانے کھول۔ جن کے ہاتھ سے دلوانا چاہتا ہے ان کو ہمارا بنا دے۔ آمین ربنا آمین۔

عزت و آبرو مرحمت کر۔ اپنے سوا کسی کے آگے جھکنے نہ دے۔ مذہب، ملک۔ قوم، خاندان سب کی لاج رکھ۔ ذلت و رسوائی سے بچا۔ آمین ربنا آمین۔

بے گھروں کو گھر دے۔ بے زروں کو زر دے۔ شادیاں ہوں خانہ آبادیاں ہوں۔ میاں بیویوں میں میل جول ہو۔ امن ہو، سکھ ہو، چین ہو۔ سب گھر بہشت بن جائیں۔ بے اولادوں کو اولاد دے۔ نہ بجھنے والا چراغ دے۔ ماؤں کی گودیں بھریں۔ سنسان ویرانوں میں نیک بچوں کی رونقیں ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

بیماروں کو صحت ہو۔ بلائیں دور ہوں۔ وبائیں دور ہوں۔ آہ کے بدلے واہ ہو۔ غم کے بستر تہہ ہو جائیں۔ درد و الم کافور ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

مقدموں میں کامیابیاں ہوں۔ حق فتح پائے۔ بیگناہوں کو قید سے رہائی ہو۔ ٹل جائے

اگر ناگہانی آئی ہو۔ آمین ربنا آمین۔

(۲)

از اخبار "توحید" میرٹھ مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء

## رَبَّنَا رَبَّنَا رَبَّنَا

نافرمان بندوں کے معبود، بیکسوں کے سہارے، لاچاروں کے چارہ کار، پروردگار یہ ہاتھ تیرے آگے پھیلے ہیں۔ یہ کچھ امید سے دراز ہوئے ہیں۔ ان کو تجھ پر ناز ہے کیونکہ تو بندہ نواز ہے۔ ان ہاتھوں کی خطا نہ تھی جو تیرے غیروں کے دروازوں پر دستک دیتے رہے قصور نفس کا تھا جو بہکا کر در بدر کی ٹھوکریں کھلاتا پھرا۔ اب تیرا دروازہ مل گیا ہے۔ آستانہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے شرمندہ سر کی لاج رکھ لے۔ یہ پیشانی تیرے سرکش بندہ کی ہے جو عاجزی سے خاک پر پڑی ہوئی ہے۔

رحم کرنے والے خطا پوش داتا۔ ہم تیرے ہیں تو ہمارا ہے۔ تجھ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔

طاعون نے، قحط نے، مفلسی نے، خود غرضی نے اور ریاکاری نے جھوٹی عزتوں کی حرص و ہوس نے تیرے بندوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ اپنی رحمت کی کمند میں اسیر کر لے اپنے کرم کے حصار میں بچا لے۔

صدقہ اُس گیسوؤں والے حجازی کا جس کی یاد واللیل کے پیارے لفظ میں کی جاتی ہے۔ صدقہ اُس نورانی مکھڑے کا جس کو والضحیٰ کا خطاب عطا ہوا۔ اُس کا طفیل جو بے قرار سمندر کے کنارے مستغرق پہاڑوں کے بیچ میں یثرب کی خوش نصیب زمین پر کملی اوڑھے تیرے نام کی منادی کرنے آیا تھا۔ اُس پتھر کا صدقہ جو تیری محبت میں سات دن کے بھوکے پیاسے پیٹ پر باندھا گیا تھا واسطہ اُن چھالوں کا جو بنتِ رسول ؐ کے ہاتھوں میں چکی پیسنے سے پڑے تھے۔ وسیلہ اُس پیاسے حلقوم کا جو کربلا کی تپتی زمین پر ستم کی چھری سے

کٹ گیا اور اُن تلواروں کا جو تیرا نام بلند کرنے کو اٹھائی گئیں۔ اُن گھوڑوں کا جو تیرے دشمنوں کی صفوں میں ہنہناتے ہوئے، ٹاپیں مارتے ہوئے، کف برساتے ہوئے گھس گئے۔ حرم حجاز کا صدقہ، مدینے کے در و دیوار کا صدقہ، سسکیاں بھرنے والے ستون کا صدقہ اور اس پیار کا صدقہ جس سے فراق زدہ لکڑی کو تسلی دی گئی۔ اس ممبر کا صدقہ جہاں تیرا مزمل تھا، تیرا مدثر تھا۔ اُس ہریالے گنبد کا صدقہ جو تیری شمع سراج منیر کا فانوس ہے۔ اُن جالیوں کا صدقہ جن کے اندر کچھ ہے، آہ کچھ ہے۔

فریاد ہے ربّ، دُہائی ہے مولےٰ۔ دیدے مولےٰ اپنا بنالے۔ ایک کر دے، اور نیک کر دے۔ آمین۔ اللّٰھم آمین۔ ثم آمین۔ بیماروں کو شفا، بے اولادوں کو اولاد، بے روزگاروں کو روزگار، بے قراروں کو قرار۔ امتحان دینے والوں کو کامیابی، مقدمہ والوں کو فتحیابی، مقروضوں کی سبکدوشی۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۳)

از اخبار توحید مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء

غریبوں کے دردمند خدا! ہم کو خس کی ٹٹی اور تہ خانہ کی ٹھنڈک درکار نہیں ہے اپنی رحمت کی خنکی مرحمت کر اور گرمی کے موسم کی بلاؤں سے بچا۔ گرم زمین کی حرارت سے ہمارے دماغ کو محفوظ رکھ جس پر ہم تیری دی ہوئی روزی کمانے کے لئے اور بال بچوں کو پالنے کے واسطے دھوپ میں چلتے پھرتے ہیں۔ لُو سے، سرسام سے اور گرمی کے کل آلام سے حفاظت دے۔

علیگڑھ کالج کی پیچیدگیاں دُور ہوں۔ حاجی و نواب سیکرٹری دلیری و حقانیت سے کارگذاریاں دکھائے۔

ندوۃ العلماء کا انجام بخیر ہو۔ موجودہ خلفشار آسانی سے رفع ہو جائے۔ علم دین کا بول بالا رہے۔

ہندو مسلمانوں کی تازہ کوشش اتحاد میں برکت ہو۔ دونوں کے دلوں کو خلوص عطا فرما۔ ذات کی رنجشیں اور خود غرضیاں بیچ میں نہ آنے دے۔ لارڈ ہارڈنگ کی خیر ہو۔ ان کو توفیق دے کہ ہندوستان میں عدل و انصاف برقرار رکھیں۔ گورے کالوں کو برابر سمجھیں۔ اخباری دنیا میں اتفاق دے۔ ہر ایک کو حوادث ناگہانی سے بچائے رکھ اور اپنے فضل کا سایہ ڈال تاکہ وہ حقیقی صداقت سے تیرے بندوں کی خدمت کریں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

# آنسو بھری آنکھ کی التجا

از اخبار توحید میرٹھ۔ مورخہ ۸۔ جون ۱۹۱۳ء

میرے مالک پچھلی رات ہے۔ سب سوتے ہیں۔ تو جاگتا ہے۔ میں جاگتی ہوں۔ تو سامنے کے آسمان میں ہے۔ یا خود میرے اندر کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سُن۔ صبح کا نور چمکنے سے پہلے۔ تاروں کی روشنی چھپنے سے پیشتر۔ پرندوں کی نغمہ خوانی سے قبل میری مراد مجھ کو دے۔

یہ سامنے تیرے اجمیری پیارے کا سفید گنبد ہے۔ اس کے کلس پر اپنا دیدار دکھا اس کو طور بنا۔ مجھ کو موسوی بصیرت دے اور تو جلوہ افروز ہو۔ آنسو کا پردہ تنا رہے اور کوئی نہ دیکھنے پائے گا۔ چپکے سے اس کے اندر آجا تاکہ تجھ کو اپنی بپتا سناؤں کلیجہ کے زخم کھول کر دکھاؤں۔

دن بھر ان بیقراروں کی دید میں گزر گیا جو اجمیری **وسیلہ گاہ** میں تجھکو ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ ایک کہتا تھا آہی قرض کے بوجھ نے پیس ڈالا۔ اپنے خواجہ کے صدقے میرے بازو ہلکے کر۔ دوسرے کی فریاد تھی مولےٰ ناگہانی بلا نے گھیر لیا۔ خواجہ کے ہاتھ سے اس

آفت کو دور فرما تیسرے کی فریاد تھی. گو دخالی ہے گھر بے چراغ ہے اولاد کیلئے جی ترستا ہے۔ ارمان کا باغ اجاڑ ہوا جاتا ہے. خواجہ کے وسیلہ میرا دامن بھر دے. چوتھا مرض جسمانی میں مبتلا تھا، روضۂ خواجہ سے سر ٹکراتا تھا. اس کی بھی تجھ سے آس تھی اور خواجہ کے در کی ڈھارس پاس تھی. پانچواں رزق کا بھوکا تھا. ہاتھ خالی. پیٹ خالی. خواجہ کے دروازہ پر تجھ کو پکارتا تھا اور روٹی کا ٹکڑا مانگتا تھا چھٹا آتش عشق میں جلتا، آہ شرربار کھینچتا. غلاف خواجہ پر مایوسانہ ہاتھ مارتا تھا. کیونکہ اس کو بھی یقین تھا کہ غلاف کے اندر تیرے پاس جانیکا راستہ ہے اور تیرے پاس جا کر شربت وصل کا جام میسر آسکتا ہے۔

ساتواں کچھ اور کہتا تھا. دیوانہ تھا، مستانہ تھا. کائنات اور ہستی موجودات کے معمہ کو اور اس کے گورکھ دھندے کو نادانی کی انگلیوں سے سلجھا کر اُلجھا رہا تھا اور خبر نہیں کیا بڑبڑا رہا تھا۔

اتنے نظاروں سے تھکی ماندی. اپنی عاجز بندی چشم اشکبار کی التجا پر رحم کر دے اور ان سب کی مرادوں کے ساتھ، جن کا اوپر ذکر آیا ہے، میری درخواست بھی پوری فرما دے۔

# جھولی والے فقیر کی بھیک

از نظام المشائخ۔ اگست ۱۹۱۳ء

تو ہی جانتا ہے رمضان میں کونسی رات ہزار راتوں کے برابر ہے. کس کو تو نے خطاب قدر عطا فرمایا ہے مجھکو ہزار. لاکھ یا سو بچاس سے غرض نہیں ہیں اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ رات خطاب یافتہ ہے یا نہیں. اس کا شوق بھی نہیں کہ نزول ملائکہ اور روحوں کی ملاقات والی شب میسر آئے۔

میں تو اسے بڑی اور اونچی چوکھٹ والے بادشاہ تجھکو مانگتا ہوں. تیری آرزو میں سر شام

سے نہیں سویا۔ چاہے تو رمضان میں بل یا شوال میں۔ رمضان کے عشرۂ آخر میں جلوہ افروز ہو یا بیچ کی اور کسی رات میں۔ مجھے اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں ہر حال میں راضی برضا ہوں۔

قربان اس دروازے کے جس پر چشم لاہوت کو ہاہوتی نوشتہ نظر آتا ہے۔ دل کہتا ہے میں جبروتی ہوں، روح کہتی ہے میں ملکوتی ہوں۔ ہاتھوں کا اصرار ہے کہ ہم ناسوتی ہیں۔ تو کیوں نہ اس دروازے کے راز کو عالم ناسوت میں فاش کر دیں۔ کب تک اقلیم ہاہوت پردۂ خفا میں رہے گی۔

مگر نہیں میرے باپ۔ میرے امام میرے مرشد اول۔ سیدنا علیؑ سلامک علیہ نے وعدہ کر لیا تھا کہ راز کو مخفی رکھوں گا تو، مجھ کو بھی یہ رمز ظاہر نہ کرنی چاہیئے۔ اچھا تو اے وہ جس کے پاس جانے کے لئے ہاہوت جیسے گم اور گم کرنیوالے دروازے سے گذرنا پڑتا ہے، دور سے میری آواز سن۔ میں ناسوت کے عالم خواہشات میں ہوں۔ وہیں سے پکارتا ہوں۔ پانچ پردوں کی دوری ہے مگر جانتا ہوں کہ تو وہاں بھی سن لیتا ہے۔ ناسوت میں ہوں۔ اس کے بعد ملکوت ہے۔ پھر جبروت ہے، پھر لاہوت ہے، پھر ہاہوت کا دروازہ ہے۔ مگر تو سب میں ہے۔ اول بھی آخر بھی۔ لاہوت میں بھی۔ ناسوت میں بھی۔ پس تو میری سُن۔ میں اپنے سر کو تیری چوکھٹ پر جھکاتا ہوں۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ یہ میرے دونوں ہاتھ کُنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ تو بخشش وکشایش کے دروازے کو کھول۔ جب تو دیتا ہے، اور دے سکتا ہے تو مجھکو دے۔ جب تیرے ہاں کسی بات کی کمی نہیں تو میرے لئے دیر کیوں ہے دست رحمت بلند کر۔ دربند ے فقیر کی جھولی میں کچھ ڈال دے۔ یہ جھولی والا فقیر گھر بہ گھر نہیں جاتا۔ اسی دروازہ پر آتا ہے، اسی پر آیا ہے، اسی پر آتا رہیگا کسی نے کہا وہ نوالہ دینے کے بہانہ سے اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھا دیتا ہے، اور یہ شعر پڑھا ؎

آمد بروں زخانہ چو آواز ما شنید　　بخشیدن نوالہ گدا را، بہانہ ساخت

تو یہ بھکاری بندہ بھی صدا لگاتا ہے بھیک کا ٹکڑا مانگتا ہے۔ دروازے کے فقیر کو مایوس کر لینے بھکاری کی بھیک کا خیال رکھ اور میری جھولی میں خیرات ڈالنے کے لیے دروازہ پر آجا تاکہ میں رمضان کے روزے، تراویح، نوافل شب بیداریاں۔ غرض تمام نیکیاں جو میں نے اور تیرے سب بندوں نے کی ہیں، تجھ پر قربان کر کے پھینک دوں اور پھر تیرے قدموں کو پکڑ لوں۔ اگر وہ نہ ہوں، اور یقیناً نہیں ہیں کیونکہ تو اعضائے جسمانی سے پاک ہے۔ تو اپنے خیال و تصور سے تیرے مثالی پاؤں بناؤں۔ اُن کو چوموں، ان پر سر ٹیکاؤں، آنکھیں ملوں اور جب تک تو میری جھولی نہ بھر دے، اُن قدموں کو نہ چھوڑوں۔

رمضان کے روزہ دار فقیر کی آواز سن جو کہتا ہے۔

میری جھولی بھر دے — میرا چنبل بھر دے

تیری جنت کی خیر — اس کی فرحت کی خیر — شاخ طوبیٰ کی خیر — حورِ حمرا کی خیر
ٹھنڈی نہروں کی خیر — اُجلی لہروں کی خیر — تیرے جلوے کی خیر — دید میلے کی خیر

میری جھولی بھر دے — میرا چنبل بھر دے

تیری دوزخ آباد — اُس کا برزخ آباد — طوق بھاری آباد — شعلے ناری آباد
قہر و خفگی آباد — طیش و ترشی آباد — گرز و ہنٹر آباد — دُکھ کے سنٹر آباد

میری جھولی بھر دے — میرا چنبل بھر دے

تیری کرسی رہے — اُس کی بستی رہے — عرش اعظم رہے — حکم محکم رہے
لوحِ محفی رہے — نقشِ ہستی رہے — نورِ نیّر رہے — شانِ اختر رہے

میری جھولی بھر دے — میرا چنبل بھر دے

تیرے دریا بہیں — موجیں ہر جا اُٹھیں — کوہ و جنگل رہیں — چپ کے دنگل رہیں
مرنیوالے مریں — جینے والے جیئں — عقل والے رہیں — بھولے بھالے رہیں

میری جھولی بھر دے — میرا چنبل بھر دے

سُنا! تیرا فقیر بندہ تیری ہر چیز کی سلامتی چاہتا ہے۔ خیر و شر، نور و ظلمت، قہر و رحم کا یکساں خیر طلب ہے تو تو بھی اس پر مہربان ہو اور اس کی خالی جھولی میں ایک غیبی ٹکڑا ڈال دے۔

# فلک پر

از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۳ء

فلک پر جس کو حدِ نظر کہتے ہیں، میں نے ایک مست کی متوالی آنکھ دیکھی۔ ستارے اُس کو ستارہ تھے مگر وہ بے پروائی، مدہوشی، خود فراموشی کے عالم میں آسمان کے دروازہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نہیں کہہ سکتا اس آنکھ کو کس کی تلاش تھی، مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ اس میں خمار و مستی تھی یا کچھ اور تھا۔

فلک کی کھڑکی کھلی۔ ایک فرشتہ نے گردن نکالی اور آنکھ سے کہا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی کا حکم نہیں سنا؟ نشہ باز کا یہاں کام نہیں۔ زمین کے میخانہ میں جا اور جام کی لال روح کو دیکھ۔ چشم دیدار طلب نے ملکوتی ہستی کے فرمان کی پرواہ نہ کی اور لڑکھڑاتی ہوئی آسمان کے اندر گھس گئی۔

فرشتے اس بے ادب، گستاخ اور دیوانی آنکھ کے داخلہ سے گھبرا گئے۔ انہوں نے غل مچا دیا اور کہا تو اس مقدس اور پاکیزہ مقام پر بھی فتنہ و فساد برپا کرنے آگئی۔ خدا سے ہم نے کہا تھا آدم کو خلیفہ نہ بنا جو تیری پاک زمین پر خونریزی کریگا مگر اس نے آدم کی علمیت سے ہم کو قائل کر دیا۔ وہ جو کچھ تھا زمین کے لئے تھا۔ اس کی خلافت تجھکو مبارک مگر آسمان ہمارا ہے ہم کو عبادت کرنے دے اپنی آوارگی کو یہاں مت پھیلا۔

عین فرشتوں کی یورش میں ایک غیبی صدا پیدا ہوئی جس نے کہا آنے دو مت روکو یہ میری ہے۔ میں اس کا ہوں۔ اس کے بعد ایک تجلی نمودار ہوئی۔ فرشتے کانپ کر سجدہ میں گر پڑے مگر انہوں نے گرتے گرتے دیکھا وہ تجلی آنکھ کے پردے میں سما گئی۔ آنکھ نے اپنے دونوں غلافوں کو کھینچا اور پردے بند کر لئے۔ پھر دیکھا تو نہ فلک تھا نہ زمین۔ نہ فرشتے۔ نہ کچھ اور۔ آنکھ اور اس کے اندر چھپی ہوئی تجلی کے سوا سب نابود ہو گئے۔ میں نے کہا کیا فنا و بقا اسی کا نام ہے

# قدرت میرے ہاتھ میں

از رسالہ نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۳ء

گنہگار، خطاؤں کی پوٹ، ابن آدم، خاک کا پتلا میں ایک بشر ہوں۔ تم بھی جانتے ہو میں بھی جانتا ہوں کہ کس قدر قصور میری ہستی سے نمودار ہوئے۔ تم نے مجھکو آزمایا۔ میں نے تم کو دیکھا ایک بار نہیں ہزار دفعہ۔ محبت کے رشتہ کو کتنی مرتبہ خفقان کی چھری سے کاٹا۔ گو وہ نہ کٹ سکا مگر زخمی ضرور ہوا۔

میرے خیالات، میرے حالات، میرا ظاہر، میرا باطن تم سے پوشیدہ نہیں۔ جو عیاں تھا وہ بھی تمکو معلوم، جو مخفی تھا اُس سے بھی تم خبردار۔ برسوں کجائی رہی آنکھ کی، کان کی۔ ہاتھ کی پاؤں کی۔ زبان اور ہونٹ کی اور خبر نہیں کس کس کی۔

مگر تم نے دیکھ بھال کر قبول دیا، جان بوجھکر پیمان وفا باندھا اور کہا میں تیرا ہو کر رہونگا اور اپنا بنا کر رکھوں گا۔ یہہ کہہ کر طاقت اور قدرت کی کنجیاں میرے حوالے کر دیں اپنا سب کچھہ سونپ دیا۔

میں نے یہ دیکھ کر گرد و پیش کے تعلقات توڑ ڈالے تمہاری زنجیر سے ہاتھ پاؤں اور دل کے گلے کو باندھ لیا۔ تمہاری یاد کو بقائے زندگانی کا ذریعہ ٹھہرایا۔ تمہاری اطاعت و فرمان

پذیری کے آگے جھک گیا۔ جو کہا وہ کیا جدھر لے گئے اسی سمت چلتا رہا۔

کچھ یاد ہے وہ اندھیری راتیں جن میں میں جاگتا تھا اور تم کو جگاتا تھا اور وہ گرمی کے دن جبکہ میں تمہاری خاطر اپنے جسم کو پسینہ میں ڈبوتا تھا۔ وہ سردی کے سناٹے جن میں تمہاری مدارات کی جاتی تھی۔

تم کہتے تھے آہا یہ کیسے اچھے دن ہیں۔ میں کہتا ہاں سیاں۔ یہ زمانہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ تم مجھپر فدا تھے میں تم پر نثار تھا۔ آسمانی آبادی رشک کرتی تھی۔ بازدوں کے فرشتے نیکی دبدی کے علاوہ ایک تیسری چیز درج رجسٹر کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں جبکہ میں نے سمندر کی یورش سے نجات پائی۔ تم نے کہا آدمی! میں تیری یاد میں بےچین تھا۔ تو کہاں تھا۔ تو آگیا؟

اب کیا ہوا جو تم مجھ سے بیزار ہو۔ اگر خطا داری اور غلط کاری باعث حجاب ہے تو یہ پہلے بھی تھی۔ کہہ چکا ہوں کہ تم نے آزما لیا تھا اور خصلت و عادت کو پہچان گئے تھے۔

اب تم مجھ سے بچتے ہو۔ بہانہ کرکے ٹالتے ہو۔ ظاہرداری کی رسموں سے بہلاتے ہو اُس کو، جو تمہاری دی ہوئی قوت و عرفان سے غیب کا مشاہدہ کرتا ہے جو باوجود سیہ کاریٔ عصیاں مآبی کے زبردست طاقت ہوش و دانش کی رکھتا ہے۔

آج اگر تم ناقص اور تمہاری شان کو نہ سمجھنے والی ہستی کو اپنا بناتے ہو اور تاج حکمرانی اُس کے سر پر رکھتے ہو، آج اگر تم کو یہ خیال ہے کہ قدیمی رشتہ توڑنے سے منظر کائنات کی نمائش بڑھ جائیگی، تو میں ادب سے کہوں گا کہ انصاف کا خون ہو جائیگا اور لطف رعنائی و کبریائی ہاتھ سے جاتا رہیگا۔

یاد تمہاری ہے اس کو سامنے لاکر سوچو۔ قدرت تو تم مجھکو دیکھچکے ہو۔ میں ہجوم اندوہ میں اپنے ہاتھ کی قدرت کو گردش دونگا اور ناقص العقل ہستی کو خاک و خون میں ملا دوں گا۔ پھر نہ کہنا کہ وفاداری و دلداری کے خلاف کیا۔ میرا دل پک گیا ہے میرا جگر دُکھ گیا ہے۔

(۳)

مسلمان ہوں جس پر نعمتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو۔ حجازی ہوں جس کی دلجوئی کا قول ہار چکے ہو۔ مست الست ہوں جس کے "بلے" کو قرآن میں شائع کر چکے ہو۔ وہ وجود ہوں جس کی پشت پر مُہرِ اسرار کے نشان ہیں۔ منکر اور ناشناس دوزخیوں کو مجھ پر مسلط نہ کرو۔ اپنی فرقت کی آگ میں مت جلاؤ، رقابت کی آتش میں نہ ڈالو۔ کوئی قصور ہوا ہو تو چشم کرم کو پھیر لو اس میں کام تمام ہو جائے گا۔ دوسروں کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کرو۔ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ نگاہِ قہر کی کارسازیاں ہیں۔ مگر قہر اپنی ذات تک محدود رکھو۔ تمہاری رحیم سرکار ہے۔ پھر ایک نہ ایک دن ملائمت کی توقع ہو سکتی ہے۔ ان خودغرض، بندۂ حرص ہوسِ اجسام، ان نمود سیئے اور فراموش کار افراد کے پالے نہ ڈالو جنہوں نے تمہارے دل دادہ کو جوتیوں میں ڈال رکھا ہے، اور اجازت دو کہ میں بھی انتقام کے لئے باہر آؤں اور اس خس و خاشاک کو نابود و فنا کر کے دکھاؤں کہ تھی تمہاری دی ہوئی قدرت میرے ہاتھ میں!

# کعبے والے خدا کو کیونکر پاؤں؟

از رسالہ "خدام کعبہ" جون ۱۹۱۴ء

میں اُس کو چاہتا ہوں۔ میرا جی اُس پر آگیا ہے اس کی یاد مجھکو ستاتی ہے۔ دید مانگتا ہوں۔ ایک نظر ڈالنے کی ہوس ہے۔

وہ کہاں ہے کس طرح دستیاب ہوتا ہے۔ ہر چیز کوشش سے مل جاتی ہے۔ ہرچرن نے پڑھتے پڑھتے بی۔ اے۔ پاس کر لیا۔ لال خاں کو مرغبازی کا ہنر آگیا۔ انجن دہلی سے دوڑتا کلکتہ پہنچ گیا۔ گنگا ہردوار سے بہتی بہتی بہتے سمندر میں جا گری۔ سورج طلوع

ہوا تو اُس نے ہر سوتے کو جگا دیا۔ چاند غروب ہوا تو تارے چمک گئے

میری بیٹی حسبانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کر لیا۔ پکانے والی نے آٹا گوندھا تھا اب روٹی پکا رہی ہے۔ مگر میں اس کو کعبہ کی کالی چادر میں، مدینہ کے سبز غلاف میں، اجمیر کے صندل میں، دلّی کے نظام الدین میں، نماز کے سجدے میں، بیوہ کی آہ و سرد میں یتیم کی چشم تر میں، مظلوم کی مایوسی میں، ظالم کی خود فراموشی میں ڈھونڈھ چکا۔ ہر دروازہ کی کنڈی بجا چکا۔ آنسو بھی بہائے ہاتھ بھی پھیلائے لیکن اُس کا دامن نصیب نہوا میں نیا گرفتار نہیں ہوں میری اسیری پُرانی ہے۔ مگر اب بھی مجھکو فریاد کرنی نہیں آتی اُنکی ناز برداریاں نہیں جانتا۔ کوئی ہے جو مجھے بتانے کہ میں اسے کیونکر پاؤں۔

ادہر جھک سُن۔ بتانے والا بتاتا ہے۔ زخم کھول مرہم کا پھایہ خود سامنے آتا ہے۔ تیری تلاش ادھوری تھی، تیری جستجو کا رُخ بے رُخ تھا۔ وہ کعبہ کی چادر میں مُنہ چھپائے موجود تھا۔ وہ مدینہ کے سبز غلاف پر صاف جھلک رہا تھا۔ اس نے تجھکو اجمیری صندل میں خوشبو بن کر اور دلّی کے نظام الدین میں سلطان المشائخ ہو کر پکارا مگر تیرے کان سائنس و فلسفہ اور نئے زمانہ کے ہوا و ہوس نے پردے ڈال رکھے تھے۔ تو اُس کی آواز بے صوت کو کیونکر سنتا؟

اور سُن۔ علی مرتضیٰ نے کیا آواز دی کہ ارادہ کی شکست میں اُس کی شکل نظر آتی ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے کتاب لکھی اور ہر چیز کا فلسفہ بتا دیا۔ مگر چھپنے کا وقت آیا تو ناگہانی افتاد سے مسودہ غائب ہو گیا۔ اس وقت اس نے کہا کہ یہ کون تھا جس نے میرے ارادہ اور یقینی کوشش کو جلدی پورا ہونے سے روک دیا۔ کیا یہ امر اتفاقی تھا؟ اگر اتفاقی بات تھی تو مسودہ پریس میں دستیاب ہونے کے بعد پھر کیوں گم ہو گیا۔ کیا اتفاقات کو میرے ساتھ ضد ہے۔ شاید اس میں کوئی بھید ہے۔ ممکن ہے اس کا اختیار کسی مخفی طاقت کے ہاتھ میں ہو۔ وہ کون ہے؟ کیا خلقت اُسی کو خدا کہتی ہے۔

اگر یہ سچ ہے تو میں اُسے کیونکر پاؤں؟ لیلی طوائف کو دیکھ۔ عمر بھی چھوٹی۔ صورت بھی انوکھی

لباس بھی طرحدار، آواز بھی قیامت، گانے کا ڈھنگ بھی بے نظیر مگر اس کو کوئی بھی نہیں پوچھتا مجرے کے لئے کوئی نہیں بلاتا۔ نوبلی جان طوائف۔ کالی بھونڈی۔ چالیس برس کی عمر، پھٹی ہوئی آواز، ناچنا آئے نہ گانا لیکن ہر شخص کی زبان پر اس کا چرچا ہے۔ یہ اثر اور بے اثری کس نے پیدا کی؟ کیا اس نے جس کو خدا کہتے ہیں۔ اگر بات یہی ہے تو سمجھ کہ خدا انہی موقعوں پر پہچانا جاتا ہے۔

استاد شبو کا قصہ بھول گیا۔ خون کے مقدمہ میں گرفتار تھے۔ ثبوت پورا تھا۔ قانون پھانسی پر لٹکانے کے لئے آستین چڑھا چکا تھا۔ ہزاروں روپیہ رونہ لینے والا وکیل قلم ہاتھ سے رکھ کر چپ چاپ کھڑا تھا۔ استاد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کہ جج صاحب نے حکم دیا کہ شبو خاں تم بری کئے جاتے ہو۔

ختم خواجگان چشت پڑھوایا تھا۔ ان کا زیادہ بھروسہ اسی پر تھا۔ گو وکیلوں کے محنتانہ میں دس ہزار خرچ ہوا لیکن ان کا دل یہ کہتا تھا کہ وکیلوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ مشکل تو خدا کو پکارنے سے حل ہوگی۔ کہ وہی اصلی وکیل اور کارساز ہے۔

اگر یہ بات درست ہے تو خدا اسی توکل اور بھروسہ کے اندر تھا اور سب ظاہری اسباب کو شکست دے کر ختم خواجگان میں نمودار ہونے والا وہی تھا۔ تو چاہتا ہے تو اس طرح اس کو تلاش کر۔

چودہری امر سنگھ کا دس لاکھ روپیہ کیوں تباہ ہو رہا تھا۔ قانون کے ہاتھوں دستاویز کی تحریر کی بدولت وہ کس طرح مایوس ہو گئے تھے۔ رشوت خوار حاکم کو ۷۵ ہزار روپیہ دینے کو تیار تھے مگر پنڈت جی نے گیتا کا پاٹھ ایسا کیا۔ کہ اس کے اثر نے ان کی جائداد کو بچا لیا۔ ان کو حیرت تھی کہ غیبی ہاتھ کہاں سے نمودار ہو گیا۔ اس کا تو انہیں گمان بھی نہ تھا لیکن غیب کی آواز پکار پکار کر اور نقارہ بجا بجا کر کہہ رہی تھی۔ کہ جو خدا پر بھروسہ کر لیتا ہے تو وہ اس کا حامی بن جاتا ہے اور ایسی صورتوں سے مشکلیں آسان کرتا ہے

جس کا اس کو وہم وگمان بھی نہ ہو۔ بس تو بھی انہی کرشموں میں اس کو ڈھونڈا کر۔

ارمان والی اصغری، دولت والی اصغری اولاد کیلئے بھٹک گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اور حکیموں کے علاج میں پورا اکیس ہزار روپیہ پانی کی طرح بہا چکی تھی۔ مگر کیا ہاتھ آیا حسرت ومایوسی۔ اور سورۂ مزمّل کے وظیفہ میں کیا خرچ ہوا صرف اکیس روپے، اور نتیجہ کیا ہوا، چاند سی صورت کا بیٹا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میرا اس پر ایمان ہے۔ اس گوشۂ تنہائی میں، جہاں زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں، یہی شغل رہتا ہے۔ مگر یہ سب میرے درد کی دوا نہیں ہیں۔ خون کے مقدمہ سے رہائی، دولت کی کمائی اور بچے کی ہوائی نہیں چاہتا۔

میرے دل میں ایک اور درد ہے، میری آنکھ کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اس کو پانے کا خواستگار ہوں اور علانیہ دید کا طلبگار ہوں جس کو خدا کہتے ہیں، جو رب کعبہ کہلاتا ہے۔ ابابیلوں کے، ہوائی جہازوں اور کنکروں سے توپ کے گولوں کا کام لیتا ہے۔ جو اپنے نام کے گھر بنواتا ہے۔ ان کی عزت وحرمت کراتا ہے مگر سکونت مکانی سے انکار کرتا ہے۔

وہ جس نے کشمیر کے گلزار پہاڑوں، شملہ کے خنک آبشاروں، سوئزرلینڈ کے سہانے نظاروں کو چھوڑ کر حجاز کے سوکھے جلتے بلتے کوہستان کو اپنی پسندیدگی کا نشیمن بنایا اور پروانہ بھجوایا۔ قرآنی گزٹ میں چھپوایا کہ ساری خدائی میں ایک دفعہ میرے ہر ہمت وطاقت والے شیفتہ پر اس مقام کی دید فرض ہے۔ میں اس کو مانگتا ہوں جو عرب کی کھجوروں کانٹے دار بیریوں، اونٹوں کے کجاؤں کو آم کی ٹہنیوں، گلاب کی شاخوں اور موٹروں پر ترجیح دیتا ہے۔

جس نے اپنے نام کی قسموں کو رب کعبہ کے لفظ سے نامزد کیا ہے جس کا اشارہ ہے کہ سب فدا کار کعبہ کے رُخ مجھ کو دیکھیں اور سر جھکائیں۔

بس میں اسی کو، بالکل ٹھیک اسی کو پوچھتا ہوں کہ وہ کیونکر ملے؟

# طائرِ سبز فام کا پیام

از رسالہ اسوۂ حسنہ میرٹھ بابت اگست ۱۹۱۴ء

ذکر اُسی شب برأت کا ہے جبکہ پہلے آسمان پر وہ جلوہ افروز تھا جس کو خدا کہتے ہیں۔ آسمان پر پہرے لگے ہوئے تھے۔ فرشتے اپنی نوکریوں پر سربسجود اور بالقیام حاضر تھے۔ چاند کی شمع جل رہی تھی۔ تاروں کے فانوس جگمگا رہے تھے۔ زہرہ گنگناتی تھی اور نغمہ بجاتی تھی۔ مشتری وجد کرتا تھا۔ عطارد سال بھر کی تقدیروں کے نوشتے پیش کر رہا تھا۔ مریخ تلوار کھینچے کھڑا تھا۔

## تختِ رب العالمین ظہورِ ذاتِ سبحانی کی مستی میں جھوم رہا تھا۔

میں نے دیکھا ایک سبز پرندہ دستِ قدرت پر بیٹھا ہے اور مخلوق پناہ رب سے کچھ کہہ رہا ہے۔ قدرت کا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر شفقت سے پھر رہا ہے اور بار بار اُس پرند کی منقار سرخ کو بوسے دیئے جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک زمردین قفس لایا گیا جس کے اندر موتیوں کا جھولا پڑا ہوا تھا۔ جانور پھدک کر اس پنجرے کے اندر چلا گیا اور قفس کی تیلیوں میں سے چونچ نکال کر ستائی صدا میں کچھ ادا کرنے لگا۔ غیب کے ہونٹ پھر بڑھے اور فریادی پرندے کی چونچ کو چوم کر اس کا پنجرہ ایک موجود وجود کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ موجود وجود پنجرا ہاتھ میں لئے ہوئے ہوا میں تیرتا، فراٹے بھرتا، دم کے دم میں زمین پر آ گیا۔

بمبئی میں داؤد یہودی کا گھر تھا جہاں حسن نظامی کا خاکستانی پیکر جلووں کی دید کے لئے آنکھیں مانگ رہا تھا۔ آج شب برأت ہے۔ میں بصیرت مانگتا ہوں۔ لال پدڑی

کا پنجرا نہیں مانگتا آپ کی بھی عجیب دین ہے۔ بھوکے کو کپڑا دیتے ہو اور ننگے کو روٹی، اندھے کو کان دیتے ہو اور بہرے کو آنکھیں۔

صاحب تسلی آنکھ کا طلبگار ہوں اور اپنے یار کا خواستگار ہوں۔ یہ جانور کسی بچے کو بخشئے۔ یہ کھلونا کسی نادان کے حوالے فرمایئے۔

چینی کی رکابی میں بنے ہوئے پھولوں کو کیا کروں۔ رنگ روپ بھی ہے۔ دوام قرار بھی ہے۔ مگر نیچرل ادائیں نہیں۔ نہ وہ گل اندامی کی مہک ہے۔ طلائی نقرئی گلدانوں کے گلدستے مجھکو منظور نہیں۔ یا وہ گل پودا درکار ہے جو اپنے بھروسہ اور اپنے پاؤں کا سردار ہے۔

کھجور کے درخت میں آم نہ لگا۔ انگور کی شاخ میں کیلے نہ پھیلا۔

وجود موجود! قرآن ہست کے فرد!! تو کیا جانے عبد و معبود کے کلمہ کلام کو۔ نابود ہو جا اور اس جوہر ستائی پنجرے کے سامنے سے ہٹ جا۔

وجود موجود نے ایک ہلکی سی جنبش کی اور اپنی نامفہوم صدا میں کہا۔

معدوم ہستی نما آدم! آج کی رات لین دین اور جزا و سزا کی رات ہے۔ اجسام وارواح، الفاظ و معانی۔ بندہ و خدا کی یکجائی کی رات ہے۔ ہر طلب کی حقیقت مجاز کا لباس پہنتی ہے۔ آج دربار سے جس کو جو کچھ ملتا ہے اس کی خواہشوں کا مجسمہ ہے۔ تو جو اکڑتا ہے، اُلٹی سیدھی باتیں بنا کر اپنا کوئی ممتاز مطالبہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ غور کر کہ یہ جانور اور پنجرا تیری ہی خواہشوں کا برزخ ہے۔ تیرے ہی مطالبات کا ہیولیٰ ہے۔

بصیرت کیوں مانگتا ہے؟ کس کی دید کا طلبگار ہے۔ دیکھ اس قفس میں سب کچھ موجود ہے۔ یہ طائر سبز فام طریق حیات کا خضر ہے اور عطائے ربانی کا مجازی برزخ ہے جس طرح تیری دعا اس زبان سے تھی جو اصلی حسن نظامی کی نہیں۔ تیری طلب اس دل سے تھی جو حقیقی حسن نظامی سے خارج ہے، تیرے ارادے اس دماغ سے تھے جو واقعی حسن نظامی سے تعلق نہیں رکھتا۔ لہذا اس کا جواب، اس کا عوض، اس کا تبادلہ

بھی اس صورت میں ہوا جو تیری آنکھوں کو اجنبی اور غیر نظر آتا ہے۔

وجود و موجود کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ طائر سبز فام نے اپنی شیریں نوا بولی کو اردو زبان میں آمیز کرکے یوں درفشانی شروع کی۔

پہلے ثابت کر کہ تو ہی حسن نظامی ہے پھر دیکھ کہ میں ٹھیک تیرا ہی مطالبہ ہوں یا کچھ اور؟

ارے نادان یہ سارا جہان وہ نہیں ہے جو تو دیکھتا ہے، وہ نہیں ہے جس کا تصور تیرے ظلماتی ذہن میں آتا ہے۔ یہ شکلیں حیوان و انسان کی، یہ صورتیں شجر و حجر کی دیکھنے میں کچھ اور ہیں اور حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ ایسے ہی ان اجسام کی ارواح کے جذبات و خیالات اپنے اندر باہر کی جو شکلیں بناتے ہیں وہ سب بے معنی اور مہمل ہوتی ہیں۔

اول تو مسلمانوں کی قوم کو دیکھ پھر دوسری قوموں پر نظر ڈال۔ بلندی و پستی۔ عروج و زوال۔ شہ زوری و بیچارگی۔ سرکشی و بے بسی کے دو کارخانے دکھائی دیں گے جو ایک دوسرے کے بالکل خلاف کام کر رہے ہیں۔ جب ایک فریق بلند ہوتا ہے تو جان لے کہ اس نے خود اپنی بلندی کو بلند نہیں پایا دوسرے اس کو بلند سمجھتے ہیں۔ اس کو رات دن اپنی پستی کا تصور ہوتا ہے۔ جو عروج میں ہیں ان کو اپنی حالت زوال پر نظر آتی ہے۔ شہ زور کو ہمیشہ اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ سرکش دوسروں کو مرعوب کر لیتا ہے تو خود اپنے نفس سے بھی مرعوب رہتا ہے اور اپنی کم طاقتی کا صدمہ سہتا ہے۔

لیکن میں جس کے پاس آتا ہوں اس کو چند رموز میں منتہائے مقصود کی اصلیت بتا دیتا ہوں، سمجھا دیتا ہوں بلکہ آنکھوں سے دکھا کر ذہن و دماغ پر نقش کر دیتا ہوں۔

دیکھ میں مدینہ کے گنبد خضرا برج سبز کا برزخ ناسوتی ہوں۔ میری منقار ہر رخ کے آگے گردن جھکا۔ جس کو پروردگار کے لب بے لب نے چوما پس تو میرے ہر بول کی صدا اور میری ہر حرکت پر قدم اٹھائے چلا جا کہ یہی میرا اسوۂ حسنہ ہے اور اسی کے اندر تو اپنے سب مطالبات مشاہدہ کرے گا اور پائے گا۔

# تُوہی ہے اے خُدا

از اسوۂ حسنہ۔ اگست ۱۹۱۲ء

لوہے کے قلم کو لال نیلے آنسو دینے والے۔ لوہے کی توپ کو آگ کی آہ بخشنے والے تو ہی ہے جس کے نام سے ہر چیز شروع ہوتی ہے جس کے پرتو سے بڑھتی پنپتی ہے اور جس کے اشارہ سے نابود و فنا ہو جاتی ہے۔

ہر صورت دوسری شکل سے نرالی ہے۔ یہ تیرے شجر قدرت کی ایک معمولی سی ڈالی ہے آدمی آدمی سے جدا، جانور جانور سے جدا۔ درخت سے درخت علیحدہ۔ پہاڑ ہے تو ہر ایک اپنی صورت میں سب پہاڑوں سے الگ۔ دریا ہے تو وہ بھی اپنے رنگ اور وضع قطع میں دوسرے دریاؤں سے انوکھا۔ ذرہ ذرہ میں فرق و امتیاز ہے۔ واہ مولیٰ تیرا کیا راز و نیاز ہے۔

بولیاں رنگ برنگ کی بنائی ہیں اور ہر بولی میں اپنی شانیں چھپائی ہیں۔ حرفوں کو عجیب عجیب وضع کے کپڑے پہنائے ہیں کسی سے کہا اوپر سے نیچے آؤ کسی کو حکم ملا کہ دائیں سے بائیں کو چلو۔ کوئی بائیں سے دائیں کو ہانکا جاتا ہے کسی کا نام عربی رکھا ہے کسی کو چینی کہا ہے کوئی ہندی ہے، کوئی انگریزی ہے غرض عجب ہنگامۂ رنگا رنگی اختلاف ہے اور پھر ہر جگہ مطلب ایک صاف صاف ہے۔

آسٹریا کا بوڑھا بادشاہ معلم الملکوت بن کر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی خونریزی کے لئے تلوار میان سے کھینچتا ہے تو پہلے تیرا نام لیتا ہے۔ دلی کا ناتوان گدا الفت آمیزی کے واسطے قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو پہلے تیرا نام لے کر زبان کھولتا ہے۔

میں کب تک کہوں تو ہی تو ہے۔ تو کب تک سنے تو ہی تو ہے۔ کہنے اور سننے سنانے کا وقت ہو چکا اب فعل اور عمل میں جلوہ افروز ہو۔ اس پرانی لفظی حمد و ثنا کے عوض نئی معنوی

تعریفیں حاصل کر۔

ذرا تو ہی دیکھ کیسی چوڑی چکلی، صاف ستھری سڑکیں آدمیوں نے بنائی ہیں۔ جگہ جگہ سنگی پہرہ دار کھڑے کر دیئے ہیں جو راستہ چلنے والے کو بتاتے ہیں کہ کتنا راستہ طے کیا اور کتنا باقی ہے۔ کچی سڑکیں ہیں۔ لوہے تک کی سڑکیں بن گئی ہیں۔ مگر بتا کہ تجھ تک کونسی سڑک جاتی ہے۔ تیرا پتہ کس پتھر پر لکھا ہے؟

سمندر کہتے ہیں ان کی موجوں اور کف آلود جوش و خروش میں تیرا نشان ہے۔ اکتائے آواز دیتے ہیں ہماری بیچارگی و افتادگی میں تیری شان نہاں ہے۔ آہ سینہ سے نکلتی ہے تو کہتی ہوئی چلی جاتی ہے کہ اس خلجان کے اندر تو ہی ہے۔ واہ زبان پر آتی ہے تو تیرا نعرہ مارتی سنی جاتی ہے۔

روئی دُھنیئے کے ہاں پاش پاش ہو جاتی ہے اور تیرا گیت گاتی جاتی ہے۔ لوہا آگ میں تپتا ہتوڑوں سے کٹتا پٹتا ہے مگر تیری سرمدی صوت اور تیری ابدی صوت کو فراموش نہیں کرتا۔

اکیلے خدا یہ تو نے رحمۃ للعلمین کا لقب کس بشر کو دیا ہے؟ وہ سورج ہے یا چاند ہے تارا ہے یا مٹی کا دیا ہے؟ سراجِ منیر کس کی شان میں فرمایا ہے؟ اس روشن چراغ تک ذرا ہم کو بھی پہنچا دے۔ ہم بھی اپنے بجھے ہوئے چراغوں کو اس سے روشن کرلیں۔ وہ چاند، سورج تارا نہیں مٹی کا چراغ ہے مگر دوسروں میں اپنی روشنی ڈال سکتا ہے۔ اس لئے ان سب سے اعلیٰ و برتر ہے۔ ہم اس کو چاہتے ہیں جس کی زلفیں اندھیری رات کی طرح کالی تھیں، جس کا چہرہ صبح کی نورانی روشنی کے مثل منور تھا، وہ جو خلقِ عظیم کا درجہ لیکر اس دنیا میں آیا تھا جس نے عیش و راحت تیرے نام پر لٹایا تھا۔ وہ جو میدانوں میں تلوار کھینچکر نعرۂ حق بلند کرتا تھا۔ برچھیوں کو بہادروں کے سینے پر مارتا تھا۔ تیروں کو چٹکی بجاتے دل و جگر میں اُتار دیتا تھا۔ وہ جو خود بوریئے پر بیٹھتا تھا اور دوسروں کو شاہانہ تخت دیتا تھا۔ وہ جو کمبل کا کرتہ پہنتا تھا اور اپنے غلاموں کو

سلطانی وتاج میں بخشتا تھا، جو کا آٹا کھاتا تھا اور ہمارے لئے پلاؤ تورمے پکوا کر رکھتا جاتا تھا۔ وہ جو راتوں کو جاگا اور ہمارے لئے پاؤں پھیلا کر سونے کا سامان کر گیا۔ وہ جو تیرے آگے آنسو بہاتا تھا کہ میری امت کو ہنستا رکھ، وہ جو بیماروں کی مزاج پرسی کو خود اُنکے گھر تک جاتا تھا۔ گھر والوں کے ساتھ ہو کر ان کا ہاتھ بٹاتا، اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ یہاں تک کہ اپنی جوتی خود ہی گانٹھ لیتا تھا اپنے کپڑوں میں آپ ہی پیوند لگا لیتا تھا۔ اس کو تو نے ہمارا آقا۔ مولیٰ بنایا ہے۔ اس واسطے ہمارا جی اس پر آیا ہے ہم کو اجازت دے کہ اس کا ذکر ادب سے کریں اور پھر کہیں کہ وہ جو لڑکوں تک کو پہلے خود سلام کرتے تھے۔ غریبوں مسکینوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے مفلس بیمار کو حقیر نہ جانتے تھے۔ لاچار بیوہ عورتوں کے سودے بازار سے خرید کر اور اپنے کندھے پر رکھ کر لاتے تھے جنہوں نے کام کے وقت کبھی اس کی پرواہ نہ کی کہ دور جانے کے لئے سواری موجود ہے یا نہیں اکثر پیدل، پابرہنہ، سر برہنہ چلے جاتے تھے۔ دینی لڑائی کے سوا کسی پر وار کرنے کی پہل نہ کرتے تھے اپنے اصحاب میں اس طرح مل جل کر بیٹھتے تھے کہ اجنبی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ حضور کونسے ہیں۔ وہ جو لیٹنے کے لئے بچھونے کا انتظار نہ کرتے تھے، اگر بچھونا نہ ہوتا تو بے تکلف زمین پر لیٹ رہتے تھے۔

تو ہی اے خدا اس حبیب کا راستہ بتا۔ اس کا اسوۂ حسنہ دکھا تا کہ ہم سب تیری کھینچی ہوئی لکیر کے فقیر بنیں اور ہماری رفتار تیرے اور تیرے بھیجے ہوئے رسول کی رفتار گفتار و کردار پر ہو۔

دنیا جہان کے حالات معلوم کریں تو اسی رسول کی پاک زندگی کے اسوۂ حسنہ کو دیکھ کر معلوم کریں۔ کیونکہ ان کی سیرت میں دین و دنیا کی معلومات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ پس وہی سیرت ہماری معلومات کا ذریعہ بنے۔ سیاست ہو تو وہ جو تیرے رسول نے بتائی۔ معاشرت ہو تو وہ جو تیرے فرستادہ نے بتائی۔ لکھنا پڑھنا، بولنا چالنا۔ کھانا پینا۔ رہنا سہنا۔ لڑنا۔ جھگڑنا۔ غرض ہر حصۂ زندگانی میں حصہ لیں مگر تیری اور تیرے رسول کی پیروی سے ایک قدم باہر نہ دھریں۔

# بندوں کی دُعا

از اخبار خطیب دہلی ۳۰ جنوری ۱۹۱۵ء

کاغذ کے ناتوان ہاتھوں کو توانائی دے۔ بیجان حرفوں میں اثر زندگانی بخش۔ اُن مٹّی تقدیروں کو نہ بدل مگر صبر کی تدبیریں تسلیم و رضا کی لکیریں۔ دل کی تسلی کے لئے بھیج۔ تو نے محتاجوں کے جھُلسے ہوئے بے رونق پہاڑوں میں وہ پھول نرگس کے پیدا کئے اور ان پھولوں نے کائنات آخر کی بیمار آنکھوں کو صحت بخشی۔ ہم اپنی شرمیلی جھکی ہوئی نظروں کو تیرے سامنے شفیع بناتے ہیں۔ ہمارے دین و دنیا کے پہاڑوں میں عیش و راحت کے باغ لگا دے۔

اے خیالوں میں رہنے بسنے والے مگر دانش و عرفان کی تمناؤں کو بیتاب رکھنے والے اے ہر ذرّہ میں موجود مگر آفتاب تحقیق کی نظروں سے مخفی اے ٹوٹے ہوئے دل کو نشیمن بنانے والے۔ ہمارے پاش پاش دلوں کو بھی نوازنے آجا۔ اس فطرت کی ستیوں سے جی ڈرتا ہے۔ اپنی بستی میں پناہ دیدے۔

تجھ کو داتا کہیں۔ تجھ کو مولیٰ کہیں۔ تجھ کو داور کہیں۔ تجھ کو کیا کچھ کہیں۔ تو ہر جے اور ہر سے آزاد۔ تو ہندو کا برہم اور رام اور مسلمان کا اللہ عیسائی کا گاڈ سکھ کا اکال پرکھ۔ تو امیر اور غریب کو ایک نگاہ سے دیکھنے والا ہے۔ ہماری دعا اور پرارتھنا سن اور قبول کر۔

# طائر سیاہ فام

از رسالہ الفرد ہلی۔ جون ۱۹۱۵ء

کل رجب ۱۳۳۳ھ کی ۲۷ رتھی معراج کی رات سوتے گزر گئی اس لئے کل رونا حصہ میں آیا رین بسیرے کے وسیع صحن میں بہت سے انسان پچھلی رات کی خنک ہوا کا لطف

اٹھا رہے تھے اور بے خبر سوتے تھے۔ میری آنکھیں ان کی بے فکری اور بے خبری پر رشک کرتی تھیں اور دل کی بھٹی آنسو گرم کر کے کھینچ رہی تھی۔

میں نے تکیہ کے نیچے سے بجلی کا لیمپ نکالا۔ اس کا کھٹکا دبایا۔ روشنی تڑپ کر باہر نکل آئی۔ غسل خانہ میں لیجا کر اس کو رکھ دیا۔ وضو شروع کیا۔ جب زبان نے کہا۔ میرے رب میرے چہرہ کو اپنے نور سے اُجلا کر دے۔ تو میرا خیال لرز گیا۔ میں نے یہ کیا مانگا۔ کیا میرا چہرہ منور ہونے کے قابل ہے۔ برقی لیمپ نے اشارہ کیا کہ کیوں خلجان میں پڑتا ہے نور بھی کوئی چیز ہے۔ بارہ آنے کو نور کی بیٹری آتی ہے خواہ مخواہ خدا کا احسان اٹھاتا ہے۔

باہر آیا۔ تاروں نے اذان دی۔ افق نے حیران ہو کر کہا نماز کا وقت نہیں ہوا یہ کیسی اذان؟ تخت کا مصلّٰی آہستہ سے بولا۔ وقت تہجد ہے مگر کل کی رات کیسی غفلت میں کٹ گئی۔ خیر آج بھی کچھ نہیں گیا۔ چاہتا تھا کہ نیت باندھوں اور دل کی گرہ کھولوں کہ پھر کلیجہ میں ایک تیر لگا۔ کوئی چیز سینہ کے اندر جوش مارتی منہ کی جانب اُبلتی ہوئی آئی۔ میں نے آہ آہ کہہ کر اس بخار کو باہر پھینک دیا۔ اور کہا اٹھتے اُودے پیارے بولے یہ میرے گھٹ کے اندر کیا چیز ہے۔ کمبخت یہ کیا بلا ہے میری ساری رات برباد کر دی

جب میرے آہ و فغاں نے کچھ اثر نہ کیا۔ سارے جسم پر اس نامعلوم زہر نے قبضہ کر لیا میں بیقرار ہو گیا۔ میں نے نماز کے قانونی طریقے کو ترک کر دیا اور بغیر قیام و رکوع سجدہ کے آگے سر جھکا دیا۔

پیشانی کے نیچے خاک نہ تھی تخت کی لکڑی تھی۔ اس پر سر دجا نماز تھی۔ میرا ماتھا اُس پر رکھا تھا اور اُس کی پڑوسن آنکھیں بے اختیار رو رہی تھیں۔

میں نے سبحان ربی الاعلیٰ نہیں کہا۔ میں نے ہندی میں اُسکی تعریف کی۔ اُس کی خوشامد کی۔ اس کی بڑائی کی۔ جوں جوں میں اس کو جگت داتا پکارتا تھا دوں دوں دل کی آگ بھڑکتی تھی۔ کیا میرا خدا ہندی زبان میری زبان سے سُن رہا ہوگا؟

اس نے تو وعدہ کیا ہے بندہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اسکی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ آج وہ کہاں چلا گیا مجھے کیوں رُلاتا ہے سامنے کیوں نہیں آتا ہے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا شعلۂ غم کو زیادہ بھڑکا گیا میں نے سجدے کو چھوڑ دیا۔ گردن کو اوپر اٹھا لیا چشمِ تر کو آسمان سے لڑایا جب بھی جی کو قرار نہ آیا۔ رین بسیرے کا دروازہ کھولا سب سونے والوں پر حسرت کی نگاہ ڈالی قبرستان میں آیا۔ حورِ پاک کی والدہ خاکی چھپر کھٹ میں غریب گیاہِ سبز کا چادرہ اوڑھے اپنے لاڈلے بچے حسن بصری کو آغوش میں لئے سوتی تھیں۔

حدیث یاد آئی۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم قبروں کے مُردوں پر رشک کروگے، کاش قبروں میں ہوتے اور زندگی کی اُلجھن ہم کو نہ ستاتی۔ سچ فرمایا میرے رسولؐ نے۔ دیکھو میری بیوی، جو دس برس شریک بزمِ حیات رہ کر جنت کو سدھاریں، کیسی خوش نصیب ہیں اور آرام سے پڑی ہیں اور آگے بڑھا۔ اب جنگل سامنے تھا۔ بڑے بڑے گنبد چپ چاپ کھڑے تھے۔ درختوں پر اندھیرے نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ دن کو جو سایہ مجھے نیچے نظر آتا تھا اس وقت ان کے اوپر سوار تھا۔

# سگنل کی لال آنکھ

جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے کی لائن آئی۔ سگنل نے اپنی لال آنکھ دکھائی۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر مجھے یاد آیا۔ کہ جو اپنا ہاتھ دوسروں کے آگے پھیلاتا ہے، اس کی زندگی کا راستہ رُک جاتا ہے جیسے اس سگنل کے پھیلے ہوئے ہاتھ کے سبب ریل اس سٹرک پر نہیں آسکتی۔

میں اس سے کیوں مانگوں۔ کیا وہ حاضر و غائب کا عارف نہیں ہے۔ اتنے میں سگنل نے ہاتھ جھکایا۔ لال آنکھ بند کی۔ سبز کھولی۔ کیا کوئی ریل آئی۔ آگے بڑھا۔ سلطان سکندر لودھی کا مقبرہ استقبال کو کھڑا تھا۔ ہاتھ ملایا۔ ملاقات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک گیدڑ برابر سے نکل کر بھاگا۔ اس کے فرار نے جسم میں گدگدی کی۔ بے اختیار ہنسی آئی۔ برقی لیمپ کی شعاع کو گیدڑ پر دوڑایا۔

غریب وحشی زیادہ گھبرایا اور کہیں بھاگ کر غائب ہو گیا۔

اب خدا خدا کر کے جی ٹھہرا اور اس کھنڈر میں ذرا چین آیا۔ چار رکعت نماز ادا کی۔ اسم بار ذکر جہر ادا کیا اور بہر ہو میں ایک مزا پایا۔

صبح صادق قریب تھی چاہتا تھا کہ گھر چلوں کہ پیپل کے بے برگ درخت پر ایک شامہ نے نغمہ حمد شروع کیا۔ بولی :۔

## سانچے پیر

کہیں دور ایک دیوار پر اس کا جوڑا بیٹھا تھا اس نے جواب دیا۔ سب پیر سانچے سانچے۔ بہت دیر تک ان کے سوال و جواب ہوتے رہے۔ کیوں ری کالی کلوٹی چڑیا۔ تو ہمارے پیروں کا مزاج بگاڑتی ہے۔ سانچا نام اللہ کا ہے۔ باقی سارا جہان جھوٹا ہے۔ شامہ بولی :۔

## کیسے پیر سچے پیر کیسے

جوڑے نے جواب دیا :۔

سانچے رب سانچے سانچے

ہاں اب ٹھیک کہا۔ آخر تو کالے رنگ کی چڑیا ہے سراپا ظلمت ہے مگر بات نورانی کہتی ہے۔ جتنے کالے بدشکل ہوتے ہیں ایسی ہی سفید بات کہا کرتے ہیں۔

طائر سیاہ فام کے ظاہری الفاظ میں تو یہ تھا جو سنایا۔ مگر اس طائری اسپرٹ کا سمجھنا آسان نہیں جس نے اس کو سمجھ لیا وہ رات کا سونا بھول جاتا ہے۔ اس کو رونے میں مزا آتا ہے اور رونا ہی اس کی دارین کی تسلی بن جاتا ہے جس کی ہر آدم زاد کو ضرورت ہے

## پہلی منزل ختم ہوئی اب دیکھنا دوسری منزل کی کیا شان ہے!

# ۲ دوسری منزل

## ذوق و شوق، عشق و محبت، سوز و گداز، ارادت و عقیدت

# حسن کا فرمان

از رسالہ مخزن ۱۹۰۷ء

(تھڑدلے، تودے لے نفسانی عاشقوں کے نام)

جاں نثار قدیمی زلف کے مشرقی صوبے دار **ذوق** دہلوی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ظل الٰہی کا حسب ذیل فرمان اُن عاشقوں کو پہنچا دے جن کی محبت ماجناب کی شانِ عالم آرائی میں بٹہ لگاتی ہے۔

ان کو بتایا جائے کہ ماجناب عرصۂ دراز سے ایک ایسے ملک میں رہتے تھے جہاں ہمکو سوائے ہمارے کوئی نہ جانتا تھا۔ اس ملک میں ماجناب کی جیسی شان و جبروت تھی اس کا اظہار ہماری قدرت میں داخل ہے مگر تم کو اتنی طاقت نہیں دی گئی کہ کشفِ راز کی تاب لاسکو۔ ایک ذرّہ اگلی شان کا ظاہر ہو جائے تو نمائشی ہستی کا نشان باقی نہ رہے۔

ایک دن ماجناب نے اپنی آن بان کا تماشا دیکھنا چاہا۔ خیال آنا تھا کہ خود بخود تماشاگاہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑ ہیں، دریا ہیں، جنگل ہیں، گلستاں ہیں اور ایک انسانی صورت ان کے بیچ میں بے حس و حرکت کھڑی ہے۔ یہ عالم ماجناب کو پسند آیا۔ شان زیبائی

کے تھوڑے تھوڑے جلوے چاروں طرف بکھیر دیئے تصویر کی خاموشی ایسی بھائی کہ اس کو اپنے لئے اختیار کر لیا اور اس کی آنکھوں میں تخت سلطانی بچھا دیا گیا۔

یہیں سے ہماری حکومت کا زمانہ شروع ہوا اور ماجناب کی کبریائی کونسل میں ابرو، رخسار، لب، دندان، ذقن، گردن داخل کئے گئے۔ گیسو کی سرحد قائم ہوئی۔ آواز اور زبان کے وزیر احکام چلانے لگے۔ ماجناب کی رعایا ویسی ہی وفادار ہوئی جیسا ظل الٰہی کا پہلے منشا تھا۔ کونسل کے بعض ممبر یا یوں خیال کرنا چاہیئے کہ بعض صوبیدار نادانی و شرارت سے کسی پر ظلم کرتے جفا کاری سے پیش آتے تو اطاعت شعار رعیت بڑی خوشی سے انکی ستم آرائی برداشت کرتی۔ بارہا باڈی گارڈ کے سپاہی پلکیں نوکدار برچھیوں سے حضوری کے لوگوں کو ستاتے مگر کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی نے اُف کی ہو۔ ماجناب کے کان انکی فریاد سے ہمیشہ ناآشنا رہے۔ اگرچہ ہم نے کبھی نہیں چاہا کہ بے زبان رعیت پر ظلم توڑے جائیں مگر کیا کریں بعض دفعہ شوخی کے نشہ میں ایسا ہو جاتا تھا اور بارگاہ احدیت مآب کو اس سے افسوس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ رعیت کے بعض افراد نافرمان ہو جاتے تھے تو ماجناب ایک حسین ایلچی ان کی ہدایت کے لئے مقرر فرماتے تھے۔ چنانچہ یوسف، موسیٰ، رام، کرشن، محمدؐ جیسے خوبصورت لوگ وقتاً فوقتاً ہدایت کے لئے مقرر کئے گئے۔

اب آجکل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رعایا میں ابتری پھیل گئی ہے۔ دو دلے، تھڑدلے اور نفس پرست لوگ ہماری حضوری کی طلبگاری کرنے لگے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ایک فرمان کے ذریعہ انکو ہدایت کی جائیگی اگر انہوں نے اس فرمان کو قبول کیا تو نیز دل رحمت کے مستحق ہوں گے ورنہ قہر کی بجلیاں گرینگی اور ان کی ہستی کو نیست و نابود کر دیں گی۔

ماجناب احدیت کے خیال مقدس میں تھڑدلا شخص جو ذرا سی بدنامی و ملامت کے ڈر سے گھبرا جائے۔ یا ایسا دو دلا کہ گاہے چنیں اور گاہے چناں کی حالت میں گرفتار ہو یا نفس پرستی اور جذبۂ شہوانی کی تکمیل کی غرض سے ہماری رعیت بننا چاہتا ہو، ہرگز اس قابل

نہیں کہ ما جناب کی نورانی حکومت کو اپنی سیاہ کاریوں سے بدنام کرنے کے لئے باقی رکھا جائے۔

اگر تم لوگ ما جناب کی دل آرا حکومت میں باقی رہنا چاہتے ہو تو بدنامی کے فکر و تردد کو پس پشت ڈال دو یکسوئی اور خلوص قلب سے اپنی پیشانیاں ہمارے سامنے جھکا دو۔ نیت اور ارادے کو نفسانی خواہشوں سے پاک رکھو۔ ہم تم میں وہ صفت دیکھنا چاہتے ہیں جو ہماری قدسی صفات سلطنت کی رعایا کے واسطے زیبا ہو

نفسانی خواہش کی تکمیل ایک فوری لذت ہے جو دوسرے ملکوں میں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہماری اقلیم کی جو بات ہے وہ دیرپا اور ابدی۔ اگر نفسانیت درمیان میں نہ لائی جائے تو عارضی سرور کے بدلے ابدی لطف کی کیفیت عطا کی جائے گی۔ پس تمام طلبگاروں کو آگاہی دی جائے کہ وہ اس فرمان کی تعمیل کے لئے تیار ہو جائیں۔

# منظرِ فراق

یعنی

# وفات الرسول

## کا سین

از نظام المشائخ۔ مارچ ۱۹۱۲ء

آسمان چپ، زمین دل تھامے ہوئے۔ ہوا چلتے چلتے رکتی ہے اور خانۂ رسولؐ میں غم کی گھڑی کو جھانکتی ہے۔ پرندوں نے چہچہانا چھوڑ دیا۔ کبوتر معصوم عائشہؓ کی جیسے کسی کو بھولپن سے دیکھ رہا ہے۔

آفتاب رسالت پر موت کا ابر چھا رہا ہے۔ نورانی کرنیں پردے میں چھپ رہی ہیں۔ امت کا سرتاج دنیا سے سدھارتا ہے۔ باپ کی لاڈلی فاطمہؓ کا سہارا بیٹی کے سر سے

ہاتھ اٹھاتا ہے۔ عائشہؓ کا دل دھڑکتا ہے کہ سہاگ کی منزل آخر ہوئی۔ حجرۂ رسولؐ کی رونق رخصت ہو رہی ہے۔ یاس و ہراس در و دیوار سے لگے کھڑے ہیں۔

یارسول اللہ! ابھی نہ جائیے حسنؑ حسینؑ سے جدا نہ ہو جیئے۔ ذرا دیکھیئے یہ گیسو دراز سہمے جاتے ہیں۔ اب ان کو کون دوش پر بٹھائے گا۔ کس سے ان کے نازک دلوں کی لداری ہوگی۔ انہیں کس پر چھوڑا تلواریں ان کو گھور رہی ہیں اور ڈرا رہی ہیں۔ تیر ان کے بے کینہ سینوں سے اور خنجر ان کی صراحی دار گردنوں سے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے ہیں۔

علیؑ کی کمر ٹوٹی جاتی ہے عقدہ کشا کی زندگی میں حسرت در نج و محن کی گرہ لگا رہی ہے۔ سلجھے ہوئے ایام اُلجھ رہے ہیں۔ صدیقؓ کو بڑھاپے میں یار غار کا داغ رلائے دیتا ہے۔

بی بی عائشہ رضہ

ستی کی ستی بی بی عائشہ رضہ کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتا کی جائی، ست پتی کی من موہنی، برج کائنات کے سب سے بڑے شام سندر کی منظور نظر، صدیق رضہ کی گود میں پلنے والی، آغوش نبوت کے تخت کی ملکہ کیسی اُداس، مایوس، نڈھال سر رسولؐ کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ آج اس کی راجدھانی ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دنیا سے منہ موڑ رہا ہے۔

پتی کی ستی عائشہ! ہم تیرے ست کے قائل ہیں۔ تو سچی صدیقہ ہے۔ ایک دفعہ آگ میں جل کر مرجانا آسان ہے مگر سارے عمر پتی کے کام میں لگا رہنا اور اس کو انجام پہنچانا تیرا ہی حصہ تھا۔ رسولؐ کے خانگی حالات جن پر امت کے ہزاروں کاموں کا انحصار تھا۔ تو نے ہی بتائے اور پربھو پرشوتم کے پیارے شوہر کے نام پر اپنی زندگی کا عیش و آرام نثار کر کے جلا ڈالا۔

عقل والے تدبیروں کے بادشاہ عمرؓ کو دیکھنا۔ سائیں کے فراق نے دیوانہ کر دیا ہے ہوش و حواس قابو سے نکلے جاتے ہیں عثمانؓ فدا کار سکوت میں ہیں، غم نے گم کر دیا ہے۔

سب سے زیادہ جس دل پر قیامت آئی وہ فاطمہ زہرا رضہ کے سینے میں پھڑک رہا ہے۔

یہ ان کے باپ ہیں جو داغِ جدائی دیکر جاتے ہیں۔ زہرا بی بی، رسولؐ بابا کو نظرِ بے بسی سے دیکھتی ہیں اور دل ہی دل میں کہتی ہیں۔ الٰہی! اب کیا ہوگا۔ کیا بابا جان مرجائیں گے۔ کیا میری تشفی دینے والے پردیس کو چلے۔ اچھی بابا۔ فاطمہؓ کو بھی لے چلو۔ لڑائیوں میں اپنی لونڈی کو نہ بھولے۔ اکثر ساتھ رکھا میدانِ موت میں بھی یہ کنیز ساتھ رہے گی۔ ہائے میرے فقر و فاقہ کے وقت اب کون دلاسا دینے آئے گا۔ بابا میں تمہاری بیٹی ہوں۔ بابا میں تمہاری فاطمہ ہوں، میں ضد کرتی ہوں کہ آپ نہ جائیے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھ کو یتیم نہ بنائیے اے خدا! تو ہی سن۔ صدقہ اس کششِ الفت کا جو اپنے حبیبؐ کو دنیا سے کھینچ رہی ہے صدقہ اس قاب قوسین سے آگے والے مقام کا طفیل اس آنکھ کا جو اس بندہ کو خصوصیت سے پیار کرتی ہے، واسطہ اس مشیت لامتناہی کا جو سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کرسکتی ہے، میرا باپ مجھ سے جدا نہ ہو، میرا سید آنکھ بند نہ کرے۔ پروردگار! میں تیرے رسولؐ کی لختِ جگر ہوں۔ خداوندا! میں اس آنکھ کی ٹھنڈک ہوں جس کو تو نے دنیا کی ٹھنڈک کے لئے مقرر کیا تھا الٰہی! میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے

سرکار استغراق میں تھے۔ رختِ سفر کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ عالم خاک سے آنکھ بند تھی۔ عالم پاک کی جانب کھلی ہوئی تھی یکایک اہل بیت کی بیتا بیاں۔ امت کی یتیمی کو ساتھ لیکر قدموں کو چمٹ گئیں۔ آنکھوں کو تلووں سے ملا اور حضور کو متوجہ کر لیا چشم گرامی وا ہوئی۔ بیقراروں کی غمناک صورتوں پر نگاہ ڈالی اور رفیق اعلیٰ کے ان سب کو سپرد کیا گیا۔ رفیق اعلیٰ کو پکارا۔ رفیق اعلیٰ نے لبیک کہی اور جھک کر اپنے کارگذار مقبول بندے کو اٹھالیا قریب کے سب مقام ادب سے بُعد ہو گئے۔ عزرائیل کا اسم صفت۔ اسم ذات نے الگ کر دیا۔ رفیق اعلیٰ نے رفیق اعلیٰ کو خود منزل رفق میں لیجا کر پہنچا دیا۔

جو کبھی نہیں ہنسا، جو کبھی نہیں ہنسے گا، جو ہنسی سے پاک ہے۔ اس نے مسکرا کر رسولؐ کے فرقت زدہ اصحاب کو اہل بیت کو غم و الم کی تصویروں کو دیکھا اور زبان بے زبانی سے

ارشاد فرمایا۔ کیا یہ میرا ہمیشہ تمہارے پاس رہتا۔ کیا تمہارا دل مجھ سے زیادہ اس کا مشتاق تھا؟ تم کو اس کی خاطر نوازوں گا اور نواز رہا ہوں۔ تم کو اس کی خاطر امتوں کا سرتاج بنایا اور بناؤں گا۔ عائشہ رضہ ہراساں نہ ہو میں تیرا محافظ ہوں۔ فاطمہؓ دلگیر نہ ہو میں تجھکو دلاسا دونگا اور جلدی اس سے ملاؤں گا۔ میرے بندے کے فدائیو! بےچین نہ ہو قیامت تک میں تم سے ماتم پرسی کروں گا اور دل زخم خوردہ پر مرہم پاشی ہوتی رہے گی۔

لو صاحبو! آقا رخصت ہوئے۔ فاطمہ رضہ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ عائشہ رضہ کے حجرے میں آفتاب چھپ گیا۔ جبرئیل جاتے ہیں۔ اب نہ آئیں گے۔ دیکھو یہ تمہارے کملی والے شاہ لیٹے ہیں۔ امتی امتی پکارنے والے اور آخر وقت تک اُمت کے خیال میں سرشار رہنے والے کو جی بھر کے دیکھ لو۔ اب یہ شکل بھی مٹی میں منہ چھپانے والی ہے۔

منظر خیالی تیرہ سو تیس برس کے بعد دل کو نہ ستا۔ کون مرا؟ کون گیا؟ کس کی وفات؟ وہ زندہ ہیں۔ زندہ خدا کا زندہ رسول۔ نہ مرے نہ مرنے دے۔ آؤ۔ اس کے دین کی آس میں سانس کو قربانی پڑھائیں اور اس تک پہنچیں جس کی آرزو ان مناظر تخیلات میں لیکر آئی ہے۔ مرجاؤ اور اس کو پاؤ۔

# اچھی بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے؟

## اُمّت کی سسرال سے مدنی میکہ کو ایک خط

از توحید۔ ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء

بابل بدھوا، چودھویں سال میں بیوہ ہو جانے والی دکھیا، امتا کے چاہنے والے پتا باواجان۔ امت تم پر قربان۔ آپ کی بدنصیب رانڈ امتا پردیس میں بیکس بےبس پڑی ہے کوئی پرسان حال نہیں۔ کیا آپ اپنی لاڈلی کو بھول گئے۔

ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے جب میں آپ کی دل کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی آپ سنوارتے تھے میں روتی تھی آپ رومال سے آنسو پونچھتے تھے۔ میں ضد کرتی تھی آپ ناز برداری کرتے تھے میری فکر میں آپ نے رات کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن کے فاقے جس کے لئے ہوتے تھے وہ یہی پھوٹی قسمت کی کنیز ہے۔۔

وہ زمانہ بھی یاد ہے جب آپ کی لاڈلی بیٹی کے بیاہ کی تیاریاں تھیں قیصر و کسریٰ کی بادشاہتوں کا سامان میرے جہیز کے لئے نکالا جا رہا تھا اور ہاتھوں کو ایسی مہندی لگائی گئی تھی جس کے چاؤ نے پردیس میں جا کر بالم سیاں کو بے اختیار کر دیا اور وہ ان ہاتھوں پر قربان ہو ہو گئے۔

اور اس گھڑی کو کیونکر بھولوں جبکہ میکہ سے ڈولا چلا ہے اور میں نے بچپن کے گھر بار کو چھوڑ کر پردیس کی راہ لی ہے۔ اپنے بیگانے روتے تھے۔ بابا جان آپ بھی غمگین افسردہ تھے مجھکو کالے کالے پہاڑ۔ اونچی اونچی کھجوریں جنگل کی بیریاں اور ان پر کبوتروں کا غٹرغوں غٹرغوں کرنا اور مدینہ کی سہیلیوں کی جدائی۔ سب پر طرہ آپ جیسے پریمی پتا کی چشم محبت کا فراق غضب ڈھا رہا تھا سسرال میں اچھی گزری۔ لال جوڑے والی جہانی کہلائی شوہر دلداریاں کرتا تھا آنکھ کے اشارہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ چاندنی راتیں تھیں سمندر کا کنارا تھا اور کان میں موتی ہزارہ تھا۔ فوجیں تھیں پہرے تھے۔ در و دیوار سنہرے تھے۔ تاج تھا تخت تھا سہاگ تھا بخت تھا

مگر ہائے بابل قسمت لوٹ گئی۔ عمر کا چودھواں سال۔ امنگوں اور ارمانوں کا شباب پورا نہ ہونے پایا تھا کہ شیام سندر پیا رن میں کام آئے دشمن نے دھوکے کی کٹاری خبر نہیں کہاں ماری۔ کام تمام کر دیا۔ میرا سہاگ لُٹ گیا میری راجدھانی مٹ گئی میں بے وارث رہ گئی۔ میری ہری ہری چوڑیاں اتر گئیں۔ میں بیوہ اور دُکھیا رانڈ کہلانے لگی۔

اچھی بابل ذرا اپنی ابتا کو دیکھنے آؤ۔ اچھی میرے چاہنے والے باپو مجھکو ساس نندوں کے طعنوں سے بچاؤ۔ وہ مجھ کو چھیڑتی ہیں۔ انہوں نے مجھکو نکو بنا رکھا ہے۔ اب اس گھر میں میری مٹی خراب ہے۔

بیٹی اپنے منہ سے کیونکر کہے۔ بڑے شرم کی بات ہے لیکن پتا تجھسے کیا پردہ ہے اب مجھ سے رنڈاپے کے دن نہیں کاٹے جاتے۔ راتیں مجھکو ستاتی ہیں۔ گھٹائیں جب آتی ہیں، بجلی جب چمکتی ہے، بادل جب کڑکتا ہے، مور جب بولتا ہے، پپیہا پی کہاں کی صدا لگاتا ہے، سہاگنوں کے جھولے جب دیکھتی ہوں، پھول پہننے والیاں جب سامنے آتی ہیں میری تمنائیں، میرے دلولوں میں حشر برپا ہو جاتا ہے۔ کلیجہ پر سانپ لوٹتا ہے ننگی کلائیوں پر نگاہ جاتی ہے تو بے اختیار ٹھنڈا سانس نکل جاتا ہے سنتی ہوں آپ بدھوا کی شادی کے حامی ہیں میرے لئے بھی کچھ فکر کیجئے۔ میری جوانی دیوانی کی خوشیوں کو بربادی سے بچائیے۔ پھر وہی پہلی سی مہندی منگائیے۔ سفید ہاتھوں کو لال لال بنائیے۔ پھر دولہن ہوں پھر جہیز کا انتظام ہو جیسی آپ کی لاڈلی بیٹی ہوں ویسا ہی بیاہ رچائیے۔ ارمان کہتے ہیں ابھی تیری عمر چودہ برس کی بھی نہیں۔ باپ کی چہیتی ہے۔ جو ضد کرے تھوڑی ہے جو دان مانگے کم ہے۔

اچھی بابل میرا بیاہ رچا دو۔

اچھی بابل مجھے مہندی منگا دو

اچھی بابل میرا منڈھا چھوا دو

سب پربتوں کے بانس کٹواؤ، سب باغوں کے پھول پتے منگواؤ مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہناؤ، اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ۔ وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے۔

کاگا! میرا یہ سندیسا مدینہ نگری پہنچا دے۔ بھونرے! کلیوں کے رس کو چھوڑ اور ذرا میرے من کی بپتا باوا جان تک لیجا۔ نسیم سحری میرے نامراد گھر میں کیوں چلی آتی ہے؟

یہاں سب پھول مرجھائے ہوئے ہیں۔ اسلئے قدم جا اور طائف کے چمن والوں کو یہاں کی خزاں کاریاں سنا دے۔

بجلی کے تارو! اگر تم میرے "ہوم" جاسکو تو "مائی ڈیر فادر" کو میری خبر دیدینا۔

# ہم ہیں بالک ایک پتا کے

از توحید ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء

ہمارا باپ فقط آسمانی نہیں زمین پر بھی وہی ہے۔ اول بھی وہی ہے۔ آخر بھی وہی ہے دکھ میں بھی ہمارا باپ ہے اور سکھ میں بھی ہمارا پدر بزرگوار تیرہ سو اکتیس برس سے وہ ساری دنیا کا باپ اور دنیا والے اس کے بچے ہیں۔ اسی واسطے رحمۃ للعلمین کا لقب دیا گیا ہے۔

گورے۔ کالے۔ نیلے پیلے۔ لمبے تڑنگے چھوٹے بونے۔ بھوکے پیٹ بھرے۔ خاک پر سونے والے اور مخملی بچھونے پر پاؤں پھیلا کے سونے والے سب حجازی باپ کے فرزند ہیں۔

انجیل کا آسمانی باپ اس کے قول کے موافق اپنے اکلوتے بچے مسیح کو سولی پر چڑھتا دیکھتا ہے۔ اس کی فریاد سنتا ہے جبکہ اس نے ایلی ایلی کہہ کر باپ کو پکارا اور کہا۔ کیا تو مجھکو بھول گیا مگر اس کو اپنے لاڈلے بیٹے پر ترس نہیں آتا۔ یہاں تک کہ اس کا نور چشم سولی پر تڑپ تڑپ کر جان دیدیتا ہے۔

ہمارا باپ آسمانی و زمینی خدا کا بھیجا ہوا رسول اور بندہ ہے۔ ہمارے باپ میں اس کے خدا کی صفت رحمت سر سے پاؤں تک چمکتی نظر آتی ہے۔ ہمارا باپ اپنی امت کے پاؤں میں پھانس کی کھٹک کو بھی گوارا نہیں کر سکتا اور بے چین ہو جاتا ہے۔

ہمارے باپ کو مدینہ کی گلیوں میں بچے روک لیتے تو وہ کھڑا ہو جاتا اور جب تک بچے ہاتھ نہ چھوڑتے ٹھہرا رہتا۔ ہمارا باپ دو جہاں کا شہنشاہ تھا۔ مگر غریب لاوارث عورتوں کا سودا

بانبار بچے لاتاان کے بوجھ کندھے پر اٹھاتا بیماروں کی خدمت میں رات رات بھر جاگتا
اور اپنے بچوں کی خبرگیری کے لئے آبادی میں رہتا تھا جنگلوں، پہاڑوں میں خلقت
سے منہ چھپائے نہ پھرتا تھا۔ ہمارے باپ پر اُس کے بچے عاشق تھے جب کافر تیر چلاتے
اور تاک تاک کر ہمارے باپ پر نشانے پھینکتے تو اس کے بچے ستر ستر تیر ڈھال بن کر اپنے
جسم پر کھاتے تھے۔ مسیح کے بچوں کی طرح نہ تھے جنہوں نے تیس روپے لیکر اپنے باپ کو
قاتل دشمن کے حوالے کر دیا۔ ہمارا باپ آدمی تھا۔ ہمارا باپ بچوں سے ان کی سمجھ کے موافق
باتیں کرتا تھا۔ مسیح کی طرح نہیں جو مچھلی والوں کے سامنے فلسفہ اور الٰہیات کی مشکل مثالیں دیتا تھا۔

ہمارا باپ بڑا۔ ہمارا باپ سب سے اچھا۔ ہمارا باپ سب کا باپ اور ہم سب اس کے بالک
تو آؤ اپنے باپ کو پہچانیں۔ دردر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ اپنے باپ کے گھر چلیں۔ وہ
ہم کو یاد کرتا ہے ہم بھی اس کو یاد کریں۔ اس کی محبت گود پھیلائے۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی،
موسائی سب بچوں کو بلاتی ہے چلو بابا واجان کے سینہ سے چمٹ جائیں۔ پاؤں چومیں
آنکھوں سے لگائیں۔ باپو پیتا۔ بابا۔ فادر۔ ابت کہکر جنت کے میوے اور پھول مانگیں۔
باپ کے گھر کا راستہ کدھر ہے؟ دیکھو کسی یتیم بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرو۔
اس کی خبرگیری کرو۔ باپ کا گھر مل جائیگا۔ جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ باپ کے پاس جا پہنچوگے۔
لڑائی جھگڑے سے باز آؤ مدنی بابا کا دروازہ ہاتھ آجائے گا۔ کسی سے نہ ڈرو۔ خدا کا خوف
اپنے دل میں ہر وقت رکھو۔ اس کو ایک مانو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اس کو اور اپنے
باپ کو ہر چیز سے اچھا اور بڑا سمجھ کر محبت کرو۔ باپ تم کو اپنے گھر میں بلا لے گا۔

ہم ہیں بالک ایک پتا کے جس کا پیارا پیارا نام محمدؐ ہے اور جو خدا کی طرف
سے ہم دنیا والوں کے لئے رحمت کا پیام لے کر اور رسول بن کر آیا ہے۔

سلام ہمارے باپ پر، سلام ہمارے رسولؐ پر، سلام ہمارے پتا پر۔ سلام ہمارے
فادر پر اور اس کے اصحاب اور آل صفا پر، سلام اس پر جس کی نسبت قرآن میں ماکان

مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔ ارشاد ہوا اور ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے محمد کو زید۔ بکر اور دنیا کے نسلی باپ کی طرح نہ سمجھو بلکہ رسول اللہ اور پیغمبری ختم کرنے والا مانو۔ لہذا ہمارا اس کو باپ کہنا اور اپنے تئیں بالک سمجھنا محبت کا لفظ ہے ورنہ وہ رسول ہم اُمتی۔ ہمارے ماں باپ اُس پر قربان ہوں۔

# مدنی شیام سُندر کی مُرلی

از توحید یکم جون ۱۹۱۳ء

شیام نے مرلی بجائی کس طرح ٭ مچ گئی گھر گھر دہائی کس طرح
ہر کی مرلی ہر کے اندر باجتی ٭ ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح

زلفوں والے یتیم پیارے، یثرب باشی موہن کنہیا کی بانسری کے بلہاری۔ حجازی پربت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے دُکھ کلیش دُور ہو گئے۔ روح۔ آتما جیو جسم سب کو سرشار و پُر کیف بنا دیا۔

مگر اب زمانہ گذر گیا۔ راتیں بیت گئیں۔ شیام سندر کی مرلی کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ جنگل کے ہرن۔ باغوں کے مور، آم کی ٹہنی کی کویل، سب اس پیاری اور سریلی صدا کی راہ دیکھ رہے ہیں جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے۔ برسات کا موسم قریب آیا۔ کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں گی اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈھیں گی کوئی چاتر سمجھدار سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شیام سندر کو سندیسا پہنچائے۔ اس سہانے بن میں بلا کر لائے۔ پریم روپ مورتی کانوں میں مندرے ڈالے۔ بانسری لے کر پھونکے اور نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ کا جلوہ ظاہر ہو۔ شیام کی مرلی سننے کو جی ترستا ہے۔ رن کے بگل نرم ہمارے حجازی موہن کی بانسری کے آگے ہیچ ہیں۔ کاش وہ پھر بجے۔ پھر گھر گھر دُہائی مچے۔

آہاہا۔ وہ دیکھو شیام سندر مرلی لئے بن سے نکلے۔ وہ ہمارے سینا پتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے۔ اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی اور نین کی بدلی برسے گی۔ ندی نالے سوکھے تھے۔ گنگا جمنا پیاسی تھیں۔ گھٹ کے تیرتھ سونے تھے بھگتی کا تھا کال پڑا۔ ست کے گلے جنجال اٹھا۔ اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی اور چنتامن کا فور ہوئی۔ اب ہر ہر کی آمد آمد ہے۔ اب ہر کی آمد آمد ہے۔ سنسار کا داتا آتا ہے اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے بانس کی مرلی صور ہے یہ اور پستک کا مسطر ہے یہ۔

# حلقہ بگوش کا قلمی نذرانہ

## خواجہ کے دربار میں

از توحید۔ ۸ جون ۱۹۱۳ء

شاہوں کے شاہ عرش پائے گاہ۔ سلطان الہند اجمیری خواجہ کے دربار میں حلقہ بگوشوں کی نذریں گذر رہی ہیں۔ فقیر بے نوا خالی ہاتھ۔ خانماں برباد۔ اس قابل کہاں ہے کہ جہاں پناہ کے حضور میں کچھ پیش کر سکے۔

ہندا لولی داتا جانتے ہیں۔ بندہ حسن گدڑی پوشوں میں پیدا ہوا مسکینوں میں پلا۔ گور غریباں میں جا کر سو جائے گا۔ زر و جواہر طلا و نقرہ کی نہ کبھی اس نے اپنے وجود کے لئے خواہش کی نہ دوسروں کو ان کی حرص دلائی۔

خواجہ بابا اس شکل موہوم معدوم ہستی نما کو پہچانتے ہیں۔ بندہ برس گزر گئے اخباری میدان میں خواجہ کا نام بلند کرنے کے لئے جس خیال سے نکلا تھا اسکی تعمیل میں کوئی دن۔ کوئی رات۔ کوئی گھنٹہ۔ کوئی ساعت۔ کوئی منٹ خالی نہیں جانے دیا۔ آج اگر وہ میدان میں یہ رجز پڑھے کہ خواجہ اپنے غلام کو دیکھئے جس نے قلم کی آنکھ سے لاکھوں آہنی دل موم کر دیئے

بے شمار انکار کرنے والی ہستیوں کو در آستان پر جھکا دیا تو ذرّہ نواز خواجہ اظہار قدردانی فرمائیں گے۔

اخبار توحید کا خواجہ نمبر بھی اسی دیرینہ جانفشانی و خدمت گذاری کا نمونہ ہے دنیا والے جس قسم کا شوق رکھتے ہیں اور جن طریقوں سے بات کو سننا چاہتے ہیں اسی کی موافق اور ان ہی طریقوں سے اور اسی پیرایہ سے گفتگو کی جاتی ہے

نمبر کا لفظ خواجہ کے بزرگ اور پاکیزہ نام نامی کے ساتھ بھدا اور بے جوڑ معلوم ہوتا ہے مگر کیا کیا جائے یہ بھی نئے زمانہ کی رسم ہوگئی ہے عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر کیا عجب نکلا جو ۔ توحید کا خواجہ نمبر۔

لہذا لفظوں سے چشم پوشی کر کے ان معانی کی طرف توجہ کی جاتی ہے جن کی اشاعت اس دور جدید میں لازمی اور ضروری ہوگئی ہے۔ خواجہ نمبر اخبار توحید کی، اور اس غلام بے زر خرید کی قلمی نذر ہے۔

بندۂ حسن بصد زباں گفتہ کہ بندۂ تو ام  تو بزبان خود بگو بندہ نواز کیستی؟

خواجہ اور اُن کے درباریوں میں یہ نئی روشنی کا نذرانہ لے جاتے ہوئے حجاب آتا ہے۔ مگر حقائق شناس بارگاہ، ضمائر آگاہ سرکار اپنے حلقہ بگوشوں کی نیت سے خبردار ہے۔ لہذا کمال ادب و عقیدت کے ساتھ یہ قلمی گلدستہ پیش کیا جاتا ہے۔ پھول پراگندہ ہیں افسردہ اور بے رنگ ہیں لیکن خواجہ کے دربار میں اچھے بُرے سب کھپ جاتے ہیں سب پر نظر التفات رہتی ہے۔

عالم پناہ سلطان اس ناچیز نذر کو قبول فرمائیے اور اس میں ایسی برکت و تاثیر عنایت کیجئے کہ جو دیکھے سیدھا معانی کی تہہ میں پہنچ جائے تاکہ خاکروب آستانہ کی محنت ٹھکانے لگے اور کسی وحدت کی ڈگر یا مل جائے، اور

مستانہ ہم مضمون بہے اخبار میں ✤ ناؤ کاغذ کی چلے بحر حصار میں

# اجمیری پہاڑ کا بولنا

از توحید ۔ ۸ جون ۱۹۱۳ء

اجمیر کے اونچے پہاڑ نے جو رات دن خواجہ کے روضہ کو دیکھتا رہتا ہے ہندوستان والوں کو خطاب کر کے زبانِ حال سے کہا۔

میں سنگدل پتھروں کا پہاڑ ہوں مگر اے آدمی میرا دل چشمے بہاتا ہے۔ میں سختی میں ضرب المثل ہوں لیکن اے نرم مزاج کے مدعی انسان! تجھ سے زیادہ دوسروں کے کام آتا ہوں۔ میں اجمیری ہوں میری بات سن مجھکو نظرِ بصیرت سے دیکھ۔

طور میرا بھائی تھا جس پر خدا نے حضرت موسیٰ کو بلا کر پیغمبری دی جودی بھی میرا ہم جنس تھا۔ جہاں حضرتِ نوحؑ کی کشتی نے قرار پکڑا۔ وہ میرے ہی ہمقوم پہاڑ کا غار تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے چاند ستاروں اور سورج کو دیکھکر خدا کا عرفان حاصل کیا۔ بیت المقدس کا نورانی پہاڑ بھی مجھ جیسا پتھریلا تھا جہاں حضرت عیسٰے نے کلمۂ الٰہی کا وعظ کہا۔ اور جو آج تک انجیل میں کوہ زیتون کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے آگے کچھ اور کہوں تو سن سکے گا تجھ میں تاب اور برداشت ہے حضرت موسٰیؑ کی طرح بیہوش تو نہیں ہو جائیگا۔ اچھا تو آ تجھے وہ بھی کہوں حجاز کا نام سامنے لا۔ وہاں بھی میرا ہمشکل کالا کلوٹا سوکھا پہاڑ ہے جس کی آغوش میں ایک تر و تازہ پھول کھلا جس کی وادی میں ایک گیسو دراز نے لکڑی کندھے پر رکھ کر بکریاں چرائیں جس کے اوپر چڑھ کر اس نے اپنی قوم کو پکارا اور خدا کے غضب سے ڈرایا یہ وہی پہاڑ ہے جس کے نیچے اس نے گھر چھوڑ کر راستہ چلا اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچا۔ اسی پہاڑ کے دامن میں اس نے حق کا پیام ختم کر کے آرام فرمایا۔

ذرا آنکھ بند کر تا کہ دل کی آنکھ کھلے، اور دیکھ یہ سبز گنبد کس کا ہے؟ یہ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی کالی دیواریں کس کی ہیں یہ سب پہاڑ ہیں مجھ جیسے پتھر ہیں جن کی چوٹیوں پر خدا کی تجلیاں نازل ہو رہی ہیں۔ اس پہاڑ کی یاد میں مسلمان فاتحوں نے زمین کے سب بلند مرتبہ والے پہاڑ فتح کر لئے اور ہندوستان کا کوہ ہمالیہ بھی انکے آگے جھک گیا۔

بس وہی میں اجمیری پہاڑ ہوں۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ سبز گنبد دیکھتا ہے۔ اجمیر میں مجھکو سفید گنبد اسی وضع قطع کا نظر آتا ہے۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ کے گرد دیکھوں مشتاق پروانہ دار

## فانوس سبز

سمجھ کر چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ اجمیر میں میری آنکھ بے شمار فدائیوں کو حجاب سفید کے آس پاس بیقرار مشاہدہ کرتی ہے جو مدینہ میں ہے وہی یہاں ہے غفلت چھوڑ آنکھیں مل منہ دھو اور ہوش ٹھکانے کر کے دیکھ۔ کیا جلوے ہیں۔ کیا شانیں ہیں؟ درِ خواجہ یا رو درِ مصطفےٰ ہے۔ سراسر مدینہ کا نقشہ کھنچا ہے۔

دیکھنے سے فارغ ہو تو مدنی جبل کی یاد میں تو بھی ہاتھ پاؤں ہلا اور اپنے اجمیری پہاڑ کی عزت کو بلند کر۔ میرے تارا گڈھ کو امید کا ستارہ بنا۔ میرے چلے کو کمان توڑ کر تیر اندازی کی کمان میں ڈال اور نفس وخودی کے لشکروں پر تیر برسا۔ ادہر آ۔ اُدھر جا۔ اس کو دکھا۔ اس پر تیر چلا۔ کمان جس طرف چاہے کھینچ مگر تیر کا نشانہ ایک ہی رکھ تاکہ خود فراموش دشمن نفسانی چلا اٹھے اور کہے۔ ؎

کماں جانب دیگرے می کشند
ولے تیر بر جان ما می زنند

# آیار اب چلکے دیکھیں برسات کا تماشہ

(از توحید۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء)

والضحےٰ، واللیل، والرعد، والبرق۔ چمک۔ کڑک اور گھنگھور گھٹاؤں کی قسم برسات کا موسم آگیا۔ جون کی گرمیاں گئیں۔ جولائی کی سیرابیاں نمودار ہوئیں۔ سمندر ی مانسون ہوائی جہاز پر اڑا چلا آتا ہے۔

کیوں رے ابر تو آیا میرے پیارے کو نہ لایا۔ تیری بوند بوند میں ایک روح ہے تیرے قطرہ قطرہ میں ایک جان ہے۔ اب مردہ مٹی زندہ ہو جائے گی۔ کروڑوں جانور حرکت کرنے لگیں گے۔ چراغوں اور برقی لیمپوں پر ان کی یورش ہوگی۔ چراغ کہے گا۔ بیہودہ! مجھ پر کیوں گرا پڑتا ہے؟ پروانہ جواب دے گا۔ کل جہاں تھا وہ نورانی مقام تھا۔ آج دنیا میں آیا تو اس کو تاریک پایا۔ تجھ کو دیکھا تو سمجھا کہ تو میرے وطن وٹن کا نشان ہے۔ اس لئے تجھ سے گلے ملتا ہوں۔ ملنے دے ناراض نہ ہو۔ بادلو! ذرا ٹھہرنا۔ دیکھو۔ ایشیا میں اور مسلم کے دلِ تشنہ کام میں بھی جا سکتے ہو یا نہیں۔ اگر نہیں تو جاؤ میں تم کو نہیں مانگتا۔

برسات وہ اچھی جس میں برسا تھ ہو ورنہ ہیچ۔ قسم ہے گھونگر والے بالوں کے بادلوں کے پیچ دخم کی وہ مسلمانوں کے پیچیدہ احوال سے زیادہ نہیں ہیں۔ قسم ہے کوندنے والی بجلی کی، جو مسلمانوں کی بیقراری بہت بڑھ گئی ہے۔

کوئی یار نہیں کس کو برسات کا تماشہ دکھائیں کون سمجھے کہ جولائی کی برسات میں کیا بہار ہے مور بولتے ہیں۔ کوئل کی آواز آرہی ہے۔ مینڈک تالابوں میں کچھ پکار رہے ہیں۔ میرا یار ہوتا تو وہ بھی ان کا مزا لیتا نہیں بلکہ وہی اس کا لطف اٹھا سکتا تھا۔

یہ سب تماشائی بندۂ حرص و ہوس ہیں۔ اسیرِ مجاز ہیں۔ ہیں جس یار کو تماشہ دکھانا چاہتا ہوں وہ مجذوب ہے، دیوانہ ہے، سالک ہے، ہوشیار ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے، سُنتا ہے اور سُناتا ہے۔ آج وہ آجائے تو بادلوں سے پانی نہ برسے کچھ اور برسے، کچھ اور بہار ہو۔ کسی دوسری چیز کی کیچڑ نظر آئے۔
پیاسی زمین کی قسم۔ گرمی اور گھمس کی قسم۔ دھوپ اور لُو کی قسم۔

# افقِ حجاز

پر ایک بادل نظر آتا ہے جو شاید گرج رہا ہے اور ادہر کو بڑھ رہا ہے۔ میں اس میں حیات اور ممات کے کرشمے دیکھتا ہوں۔ مجھ کو اس کی آمد کا یقین ہے۔ وہ طوفانی رفتار سے، سیلابی انداز سے، غیبی پروں سے اڑتا ہوا نظر آتا ہے۔
اگر یار سوتا ہے تو اس کو جگا دو۔ اس کا تماشہ دیکھے یہ برسات بار بار نہیں آتی۔ اور کہو۔ آیار چلکے دیکھیں برسات کا تماشہ۔ دن رات کا تماشا، اسرار کا تماشا، اغیار کا تماشا ایک دار کا تماشہ اور سب مل کے ترک کردیں۔ گھربار کا تماشہ

---

# ٹھنڈا سانس
# کھجور کی ٹہنی کے نیچے

از توحید ۸۔ جولائی ۱۹۱۳ء

میرٹھ میں شام تھی، ابر تھا، ہوا کا سکوت تھا۔ آسمان و زمین پر اُداسی تھی۔ جھینگروں کا شور تھا۔ مینڈک جگہ جگہ بول رہے تھے۔ میں نے کھجور کے نیچے کھڑے ہو کر قدرت کے اس نظارے کو دیکھا اور میرے سینے نے ایک ٹھنڈا سانس باہر بھیجا

زمین کہتی تھی میں ٹھنڈی ہوں۔ بارش کے پانی نے مجھ کو سیراب کر دیا۔ دیکھو میرے جسم پر پانی بہنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں جو بل کھاتا ہوا مجھ پر سے گذرا ہے۔

چھوٹی چھوٹی گھاس کے سبز تنکے خاک سے منہ نکالے مجھ کو دیکھ رہے تھے۔ ہرے درختوں کی شاخیں مستانہ شباب کے عالم میں مخموری کی شان سے سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں کمپنی باغ کے تختۂ چمن میں لال۔ نیلے۔ سفید۔ رنگ برنگ کے پھول شام کے ڈراؤنے وقت سے سہمے جاتے تھے اور پتوں میں منہ چھپا کر تاریکی کی چادر بدن پر کھینچے لیتے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر میری آنکھ نے پھر کھجور کی ٹہنی کو دیکھا جو

## بانکی تلوار

کی مثل اونچے درخت کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی۔ سینے میں پھر ایک شورش ہوئی اور اس نے ایک ٹھنڈا سانس نکال کر مجھکو دیا۔

ہاں آج کے دن اس موسم میں سب مخلوق شگفتہ اور خوش حال ہے مگر ابن آدم اپنے دل کی گرمی میں بھنا جاتا ہے۔ اس کو باطنی سوز جلائے ڈالتا ہے۔

جھینگر اور مینڈک نغمہ سنجی میں مصروف ہیں۔ اپنی زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔ آدم زاد کیا کرے جس کو یہ زندگی وبال معلوم ہوتی ہے۔ وہ کیونکر واہ کہے اس کو آہ کے مقام سے فرصت نہیں ملتی۔ میں نے کھجور کی ٹہنیوں کو نظر بھر کے دیکھا اور کہا۔ تم اس اجنبی ملک میں کیوں؟ بہت دن نہیں گذرے مدینہ حجاز میں باب رحمت کے سامنے والے گھر میں تم کو بعالم رویا دیکھا، تمہارے سایہ میں میرا سلطان جس کا سکہ دونوں جہان میں چلتا ہے، کھڑا تھا۔ اس کے بدن پر افغانی لباس تھا۔ اس کے سامنے شکستہ دلوں کے ڈھیر تھے۔ وہ تمہارے پتے توڑ توڑ کر ان دلوں کو باندھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

میری امت کے دل ٹوٹ گئے ہیں، ان کو باندھتا ہوں، آ تو بھی باندھ

یا وہ تھا، وہاں تھا۔ یا یہ اور یہاں ہے گرم سانس والے اب یہاں نہیں رہے۔ کھجور کی ٹہنی میرے ٹھنڈے سانس پر سایہ نہ ڈال میں مسلم ہوں جس کا سینہ گرمایا ہوا ہے۔ مگر ٹھنڈا سانس نکلتا ہے۔ میرا دل بھی ٹوٹا ہوا ہے مگر اس کے زخم کی بندش حجازی کھجور کے پتے سے ہوسکتی ہے تو میرٹھ میں ہے کیونکہ تیرا پتا اس جراحتِ درونی کے کام آ سکتا ہے؟

موسم برسات ہے مخلوق خدا کے دل اُمنگوں کے سانس لے رہے ہیں دیکھو مینڈک کیسی بے فکری سے گُن گُناتا ہے جھینگر کس اطمینان میں گاتا ہے۔ مجھ کو قرار ہو تو میں بھی ایک نغمہ مستانہ کی لے بلند کروں۔ مگر ٹھنڈے سانس کا کیا علاج وہ بار بار آتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرا دل بے چین ہے۔ تو برسات کی بہار نہ دیکھ۔ پہلے اس کو ہاتھ میں لے اور حجازی شفاخانے میں لے کر جا۔ جہاں افغانی لباس والا

## ربانی سرجن

اس کی مرہم پٹی کریگا۔ اس کے بعد تو بھی شام کی دلگیری میں برساتی ترانے کا مزا دیکھیو۔ اب تو فقط تو ہے اور ٹھنڈا سانس۔ امید ہے اور اس میں خوف وبیم کی پھانس۔

---

# عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

از توحید ۳۔ ستمبر ۱۹۱۳ء

عید کے چاند نے کہا مجھکو دیکھیو مدنی محبوب کے ابرو کا خم اسی شکل کا تھا آسمانی کنارے کی شفق بولی اور رخسار کی رنگت دیکھنی ہو تو مجھ پر نظر ڈال لو اس میں کچھ اسی قسم کا روپ تھا۔ سامنے سے تاریکی دوڑ کر آئی اور شرما کر کہنے لگی گیسو مجھ سے ملتے جلتے تھے۔ شام کے منظر اپنی کہہ چکے تو صبح کا نور بھی چمکا اور زبان شعاعی سے گویا ہوا

اپنی تجلی کی قسم روئے محمد کا میں آئینہ ہوں. اس کی زبان درازی بجلی کی طرح گری. وجودِ عشق بے تاب ہوگیا اور کلیجہ تھام کر عید گاہ کی جانب چلنے لگا. وہاں کچھ سائل تھے، کچھ مسئول تھے کچھ اُجلے تھے، کچھ میلے تھے. آنکھ نے کہا غریبوں کی یہ عید گاہ نہیں ہے. دل نے کہا ناز کا مقام تو یہی ہے. تو اگر نیاز کی عید گاہ تلاش کرتی ہے تو حجاز میں جا، یثرب کو دیکھ. چند پیچیدہ گلیاں نظر آئیں گی. ان کی دیواروں پر رازِ نیاز کے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں. ان سے معلوم ہو جائے گا کہ مقصود کہاں دستیاب ہوتا ہے.

غریبوں کی عید گاہ مہربان ہوئی اور اس کے امام نے جھک کر گلے لگانا چاہا. مگر مشتاق سینہ نے کہا نیاز مندی کا ناز قدموں سے ملنا چاہتا ہے. اس کی یہ مجال نہیں کہ سرکار کے سینہ تک بڑھنے کی جرأت کر سکے. یہ ادب پسند کیا گیا اور ارشاد ہوا. دیوانو یہ قدم ہمیشہ تمہارے رہیں گے. تم کو عید مبارک. بیقراروں نے جواب دیا.

عید گاہ ما غریباں کوئے تو ——— انبساط عید دیدن روئے تو

---

# پیا اجمیری

## ہست کے مست

از نظام المشائخ. جون ۱۹۱۴ء

فطرت جس کو آجکل نیچر کہتے ہیں، قدرت جس کا نام اس زمانہ میں عادت طبعی ہوگیا ہے، اجمیری پہاڑوں میں ہست تھی مگر مست نہ تھی.

نیچر کی مستی پہاڑوں کی ہستی میں سکوت ہے. سمندر اور دریاؤں میں شور و روانی ہے. جمادات میں پابندی ہے. نباتات میں شگفتگی اور سرسبزی ہے حیوانوں

میں حرکت خود اختیاری ہے اور انسانوں میں ہوشیاری و دلفگاری، دلداری وجفاشعاری ہے۔

اجمیر کے جمادات، نباتات، حیوان۔ انسان سات سو برس پہلے ہست تھے شکلیں رکھتے تھے لیکن یوم الست کے مست خواجہ پیا کے قدم آنے سے مستی میں آگئے مستی کے دم سے بستی ہے چشتی خواجہ کا اس سنسان خاکستان میں پاؤں رکھنا تھا کہ کوہستان کے ہر تنکے سے پھول میں دنیا جہان کی آبادیاں نظر آنے لگیں۔ ہر کلی کھلکھلا کر ہنسی اور اپنے اندر کی بستیاں نازک پتیوں پر دکھانے لگی۔

## چنبیلی کے پھول پر شبنم

خواجہ پیا، موہن سیّاں، کالی کملیا کاندھے پر ڈالے، وحدت کی بانسری ہاتھ میں لیے جب اس بیابان میں جلوہ افروز ہوئے تو ایک چنبیلی کے پھول نے اپنی ہری بھری ٹہنی میں جھوم کر خواجہ پیا کے چرنوں پر سر جھکایا اور اپنے سینہ و گردن کے موتیوں کے شبنمی ہار کو ادب سے نذر چڑھایا اور کہا۔ پالاگن مہاراج۔ ایک رات کی عمر والی ہستی آپ پر قربان میری بپتا سنتے جایئے۔

میں ذرات خاک کا مجموعہ ہوں فطرت و نیچر نے ہست ہونا چاہا تو مٹی سے سر نکالا۔ شاخیں بڑھائیں۔ پتے پھیلائے۔ کانٹے چنے۔ اور پھر ایک دن شام کو سبز فام کچی کلی کی صورت نمودار کی۔ وہ رات ارمانوں کی رات تھی۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا تو کلی سبزی سے سفیدی کی جانب بڑھتی تھی۔ بند پتیوں میں سرگوشیاں ہوتی تھیں ہر پتی دوسری پتی کے سینے سے لگی اور کہتی تھی۔

غنیمت جان اس مِل بیٹھنے کو  جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

اُس شب ہر ذرہ گل میں خمار تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ہر پتی میں کس کثرت سے ذرے

تھے اور ان سب کی مخموری سے میرے سُرور کا کیا عالم ہوگا۔

میں نے سمجھا کہ زندگی بڑے مزہ کی چیز ہے۔ کھیلنے کا وقت آرہا ہے اور شباب اپنا گھر بنا رہا ہے۔ ابھی وجود گل کی ہیکل پوری تیار بھی نہیں ہوئی ہے اور جذبات کی رنگا رنگیاں لذتوں کا مینہ برسانے لگیں جب سب کچھ تیار ہو جائے گا تو خدا جانے کیا مزا آئے گا۔

اسی اثناء میں مرغ نے صدا بلند کی۔ مندر کا گھنٹہ بجا۔ نسیم سحر آنکھیں ملتی اور مستی میں لڑکھڑاتی نمودار ہوئی اور ہمارے درخت کے بدن میں گدگدیاں کر کے آگے بڑھنے لگی۔

مجھکو بے اختیار ہنسی آئی مگر ہنسنے کی دیر تھی۔ ایک ہی جنبش میں پتیاں کلی کی ہم آغوشی سے جدا ہوکر تھر تھرانے لگیں اور صبح صادق کے افق کو سامنے دیکھکر شرمانے لگیں۔

اب کیا تھا آسمانی نور نے زندگی کا دوسرا دور دکھانا شروع کیا۔ آس پاس کی جھاڑیوں سے چھیڑ چھاڑ ہونے لگی، ہوا نے ہمارے شباب کی مستی کو اپنے دامنوں میں بھر کر چپ چاپ جنگل میں بکھیرنا شروع کیا۔

یہ زمانہ ختم نہ ہوا تھا کہ آسمان کی آنکھ کا آنسو قطرۂ شبنم کی شکل میں مجھ تک آیا اور کہا۔ پھول! مجھ کو جگہ دے کہ فلک نے نظروں سے گرادیا۔ میں نے ہاتھوں ہاتھ اس کو لیا۔ مگر میرے ذرات نے اس کو جذب کرنے سے انکار کیا بے چارہ کو آغوش ہستی کے کنارہ ٹھہرائے رکھا۔

اتنے میں سورج نکل آیا۔ کرنوں نے شبنم کو چھیڑنا شروع کیا اور بیچاری بوند کا گھڑی بھر ٹکنا دوبھر کر دیا۔ آخر وہ گھبرا کر موت موت پکارنے لگی اور میرا دل موت کا نام سن کر سہم گیا۔ میں نے خیال کیا تو کیا مجھکو بھی موت آئے گی اور ان ولولہ خیز خوشیوں کو خاک میں ملائے گی؟

یکایک آپ کے جمال باکمال پر نظر پڑی شبنم کا قطرہ جلدی سے آپ پر تصدق ہو گیا۔ مجھے بتائیے کہ میں کیونکر قربان ہوں کہ اس موت کے کھٹکے سے نجات پاؤں

خواجہ پیا نے گلابی مستانی آنکھ سے اس فریادی پھول کو دیکھا اور خبر نہیں نظروں ہی نظروں میں کیا کہہ دیا کہ پھول مستی میں آ گیا اور بولا پا لیا، مل گیا۔ یہ زندگی کیا چیز ہے۔ اس نگاہ پر سب کچھ نثار۔ میرے پیا میرے سیاں تو ملا تو سب کچھ ملا۔

# پیکر امکان کیوں دلگیر ہے

از نظام المشائخ دسمبر ۱۹۱۴ء

لامکاں نہیں مکان، مکان نہیں مکین، مکین نہیں کن کا ہدف جس کو کون و یکون کہتے ہیں جس نے اپنا گلا قوت ایجادکی چھری سے کٹوایا اور پھر مخلوق کے آگے بڑھ کر انسان کہلایا یہی پیکر امکاں کا کائنات شاداں و فرحاں میں اسیر پنجۂ دلگیری ہے۔ اسی کو وحدت نے فرقت کی شکل بن کر ستایا ہے۔ یہی کہتا ہے الٰہی ہجر میں کلیجہ منہ کو آیا ہے چیونٹی رفیق زندگی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ مکھی اپنے جوڑے کے ہمراہ اڑتی پھرتی ہے بگلا دریا کے کنارے دوئی کی بہار سے سفید ہے۔ کوا گھر کی چار دیواری پر اپنے مونس کو لئے بیٹھا ہے اور کالی رنگت پر فخریہ چہچہاتا ہے۔ ریل کے پہیئے آہنی ہم جنس سے گلے مل کر چلتے ہیں۔ پھول ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلتے ہیں پانی کے قطرے کیسے سٹے ہوئے ہیں۔ ہوا کے ذرے کس طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں، پہاڑوں کی بلندی سنگی ذرات کی باہمی ہم نشینی سے ہے۔ دریاؤں کی روانی پانی کے میل جول سے ہے۔ چاند تاروں کو لے کر چمکنے آتا ہے۔ سورج شعاعوں کے حلقہ میں موج اڑاتا ہے۔ خود اس کو دیکھو جو خدا ہے ہر ہے۔ ہر میں ہے اور پھر کہنے کو سب سے جدا ہے جس کی وحدت و یکتائی کی گھر گھر

دلگوم ہے۔ جو نہ مانے اس کے لئے خطاب احمق و شوم ہے۔ وہ بھی اکیلے پن سے اکتاتا تھا۔ دیکھنے دکھانے کی ہوس میں خاک کے پتلے بناتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے اچھا معلوم ہوا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلقت پیدا کی۔ آدم کو خلیفہ کہا۔ دیکھا دکھایا۔ نوحؑ کو، ابراہیم کو موسیٰ کو عیسیٰ کو ان کے زمانے میں محرم راز بنایا۔ ابراہیم سے کہا میرا خلیل ہے۔ موسیٰ کو آگ کے بہانے پاس بلایا اور کہا تو کلیم ہے۔ کچھ اور ترنگ آئی۔ دل لگی کی ٹھہرائی۔ بولا جوتیاں اتار دے اور سانپ سے کھیل۔ جی بہلا اور فرعون سے لڑ۔ مٹی کی مورت اپنے بنانے والے کی مہربانیاں دیکھ کر اترائی اور صورت دیکھنے کی صدا لگائی۔ کہا کہ تو دیکھ نہیں سکتا اور پھر جلدی سے ناسوتی آنکھ کے سامنے لاہوتی جلوہ نمودار کر دیا۔ تاب کہاں سے آتی وہ خاک کا پتلہ سینہ تھام کر رہ گیا۔

عیسیٰ کو اپنی روح کہہ کر پکارا، عالم تعین میں پھنسا کر مردے جلائے۔ پھر کہا کہ تیرے بعد اس کی باری ہے۔ جو محبوب جناب کردگاری ہے محمدؐ نام۔ محمدؐ کام۔ محمدؐ سرانجام رفیق اعلیٰ، رفیق ظاہر، رفیق باطن۔ معراج میں بلایا۔ دو کمانوں یا اس سے بھی قریب فاصلہ پر ٹھہرایا۔ کچھ کہا، کچھ دیکھا۔ کچھ دکھایا۔ اب تیرہ سو برس سے خبر نہیں کیا کرتا ہے کہاں رہتا ہے، کس شغل میں مشغول ہے۔ مسرور ہے یا ملول ہے۔

مگر مجھے اس سے کیا۔ وہ خوش ہو یا ناخوش۔ وہ تو عین ذات میں سرشار ہے مشکل میں میرا آزار ہے کہ عالم امکان تعین کی تصویر ہوں۔ وحدت کے ہاتھوں ہجر و فراق میں اسیر ہوں۔ جب اس نے اپنی واحد خوشی کو اکیلا نہ رہنے دیا اور صفاتی شکلیں جی بہلانے کو بنائیں۔ جب اس نے ہر موجود کو اس کا ہم جنس وجود دیا، جبکہ اس کی نیچپہ صفات کی رفاقت میں دی گئی جبکہ اس کی قدرت حیلہ اور وسیلہ کی دست نگر رہی تو میں کیوں اکیلا رہوں، میری دلگیری ختم کیوں نہیں ہوتی۔ مجھکو میرا دلدار کیوں نہیں ملتا۔ چاند کتنی دور ہے۔ مجبوروں کے ہارغ کتنے فاصلہ پر ہیں۔ وہ مقام کہاں ہے جہاں

سرورِ عالمؐ شکستہ دلوں کو کھجوروں کے پتوں سے باندھتے تھے۔ میرے پاش پاش دل کا مرہم انہی کے پاس ہے۔ یہ زخم انہی کے نشتر سے چیرا گیا ہے وہی پٹی باندھیں گے۔ کوئی چارہ ساز ہو یا نہ ہو، کوئی دلنواز ہو یا نہ ہو، مدنی شیام سندر کی یاد کافی ہے جبکہ اس کی آس ہے تو پھر کیا ہراس ہے۔ میری آنکھوں کے خالی کٹورے آنسوؤں کی لبریزی مانگتے ہیں۔ میرے سینہ کے خالی کچھوے محمدی آرام جان چاہتے ہیں۔

میں نہیں، ایک اسیرِ دست بیداد فریاد کرنے کھڑا ہوا ہے۔ سب سہاروں کو قطع کرکے ایک سبز گنبد کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ دیکھیے دل کی گرہ کون کھولنے آتا ہے۔ درد بھی اُس حکیم کے گھر جانے کے وقت ملا تھا۔ علاج بھی یہیں ہوگا فرقت بھی اس کوچہ کی گردش میں پائی پوسی تھی، وصال بھی اُس کی گلی کی ٹھوکریں کھانے سے میسر آئے گا۔ اسیر ہوں۔ دلگیر ہوں۔ اُفتادہ پامالی رہگیر ہوں، حیات کا مجاز ہوں، ممات کی حقیقت ہوں، حرکات کا عکس ہوں، بے اختیاری کا سایہ ہوں۔ محمدؐ محمدؐ تیرے دروازہ پر آیا ہوں یا اُس کو ملا، یا تو مل جا۔

## پردیسی پیتم دیکھی تمہاری پریت

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

اُس کے لئے میں، میرے واسطے وہ۔ وہ دونوں اجنبی اور پردیسی تھے۔ فاصلہ کچھ بڑا نہ تھا۔ بس اتنا کہ تین بار پلک جھپکے ہیں اُس کا، وہ میرا پیتم کہلایا۔ اس نے مجھے میں نے اُس کو اپنا بنایا۔ ان دنوں سورج مشرق ہی سے نکلتا تھا اور دریاؤں میں خاک کی جگہ پانی ہی بہتا تھا۔ جب تک سمندر میں آتشی طوفان کا ذکر سننے میں نہ آیا تھا، ہر چیز اپنی تھی کوئی بھی پرایا نہ تھا۔

ایک رات کھجور کی ٹہنیوں میں ہوا جُھولا ڈالنے آئی اور بیری کی شاخوں میں مکھی بھنبھنائی۔ دل سرشار تھا، تخیل مستغرق، بحرِ ناپیدا کنار تھا۔ ہوا کو مدد نہ دی اور مکھی کے سامنے مستی نہ رکھی۔ اس بات سے خدا ناراض ہو گیا اور اس نے اپنے جہان کا رخ میری طرف سے بے رخ کر دیا۔

میں نے کہا دنیا بے رخ ہو جائے۔ میرا پردیسی پیتم رُخ نہ پھیرے۔ پیارے پیتم نے میرے قول کو چوم لیا اور قول کے جسم کو سینہ سے لگا لیا۔ خدا کو ہم دونوں کی محبت پسند آئی اور اس نے توبہ کے دروازے کھول دیئے۔ سورج نے کہا میں مغرب سے نکل آؤں گا۔ اس وقت یہ در بند کرنا پڑیگا۔ پردیسی پیتم نے اپنے رخسار کو سورج کی جانب موڑا کہ کچھ کہے۔ سورج بن سُنے شرما کے پیچھے کو ہٹ گیا۔ میں نے کہا پیارے تمہارا منہ ہے یا شمس الضحےٰ۔ اس نے جواب دیا بزرخِ کبریا۔ میں نے کہا تو لاؤ تم کو سجدہ کر دوں بولا خبردار یہ عالم مجاز ہے۔ میں نے کہا مجاز بھی حقیقت کا رائی ہے اور وہ ہنسکر خاموش ہو گیا، شرما کر نظریں جھکا لیں۔

کیا لطف کی راتیں تھیں، کیا مستی وسرور کی گھاتیں تھیں، کیا بانہیں تھیں، کیا گردنیں تھیں جو ہم آغوش ہوتی تھیں، کیا لمبے بال تھے جو اُلجھتے تھے۔

مگر دیکھو تو وہ پردیسی روٹھ گیا۔ میں تو لڑا نہ تھا۔ وہ کیوں خفا ہو گیا۔ اونٹوں کے قافلے میں کہیں چھپا ہے۔ چاند مسکراتا ہے۔ کیا اسی کے اندر گیا ہے۔ تارے کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں اور ان میں ہو بہو اس کی ضیا ہے۔ ہاں یہیں ہو گا۔ ان کو توڑ لو آسمان سے جدا کر دو۔ زمین پر رکھ کر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھو۔

نہیں سنو، یورپ کے میدانوں میں گرج کی آواز آتی ہے۔ اس کو جنگ کی زمین بہت بھاتی ہے۔ شاید وہاں جا نکلا ہو۔

ادب سے پکارنا، وہ فیلڈ مارشلوں کو نقشے بتاتا ہو گا، خندقیں کھدواتا ہو گا،

زخموں کی مرہم پٹی کرتا ہوگا۔ لاشوں کو دفنانے کی فکر میں مصروفیت ہوگی۔

کیوں پردیسی تم یہاں ہو اور ہو تو کس کمپ میں. اتحادیوں میں یا ہیدادیوں میں، جرمن میں یا انگریزی خرمن میں۔ بولو۔ من جاؤ۔ بس ناراضگی ہوچکی میں نے مانا کہ امت کی لاشوں کو یورپ میں دیکھنے گئے ہو. مگر اپنے اس کو بھی ساتھ لیا ہوتا جو ایک دم کو جدا نہ کیا جاتا تھا۔ نہ بولو گے تو ہم بھی بولنا چھوڑ دیں گے۔ نہ آؤ گے تو ہمارا بھی آنا جانا بند ہو جائے گا۔

یتیم یتیم۔ پیارے۔ راج دُلارے میاں کہاں ہو۔ ذرا تو ترس کھاؤ اور جواب دو۔ آسمان چہارم کے عیسیٰ تک تمہاری خاموشی سے بیقرار ہیں. فرشتے ان کی آہ وزاری سے بیزار ہیں. مگر مجھے ان سے زیادہ اپنی فکر ہے۔ وہ تو امت کی سفارش کے لئے تم کو ڈھونڈھتے ہیں اور میں فقط تمہاری دید چاہتا ہوں۔

نہیں بولتے، دروازہ نہیں کھولتے۔ کیسے دلدار ہو۔ کیونکر کہوں کہ جفا شعار ہو۔ تم نے تو کبھی جفا نہ کی تھی۔ آج کیا ہوگیا۔

افوہ! میری بے صبری، میری بے چینی. کیا ہی اقرار تھا۔ کیا اسی سلوک کے قابل یہ گنہ گار تھا۔ اگر سر لائق دار تھا تو یہاں کسے انکار تھا۔ مگر جدائی کی سزا خلاف تہذیب قانون بین الاقوام عشق ہے۔ یہ بڑی وحشیانہ پاداش ہے۔ ہائے اب بھی رحم نہ آیا. نہ خود بولے۔ نہ کسی قاصد نامہ بر کو بھیجا. واہ بس پردیسی یتیم دیکھی تمہاری پریت۔

---

# رس کے بھرے تورے نین

از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء

خونخوار آنکھیں، اشکبار آنکھیں، دلدار آنکھیں، دلفگار آنکھیں میں کیا کہوں کہ

وہ ہیں زہردار آنکھیں۔ شرربار آنکھیں۔

آنکھ تھی یا نرگس کا پھول۔ پھول تھا یا دل میں چبھنے والا کانٹا۔ نہیں کانٹا نہیں۔ یہ پھول ہے۔ وہ وحدت کی شراب کا لبریز گلاس تھا۔ شاید اب بھی نشہ میں غلط کہا۔ وہ نشتر دل کا پیکٹ نہ ہو۔ چھری کی دھار نہ ہو۔ تیر کی نوک نہ ہو۔ مگر دل تو کہتا ہے وہ آنکھ رسیلی، کٹیلی، نشیلی تھی۔ اُس میں سے نور برستا تھا۔ سرور اُبلتا تھا۔ اس نے اپنا رس دو پیالوں میں مجھکو بھی دیا تھا۔ دل کی گواہی معتبر نہیں۔ اس کو جنون ہے۔ وہ وارفتہ مزاج ہے۔ دماغ سے پوچھو کہ چشم زیر بحث کی نسبت بیان دے۔ حق کو جان کر سچی زبان دے۔

جناب عالی! وہ حجاز کی بنی ہوئی دو نالی بندوق تھی۔ ایک سکنڈ میں دس کروڑ فیر کرتی تھی۔ یا وہ بے تار کا تار دار اشارہ تھا یا کھاری سمندر کا کنارہ تھا۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ وہ رولا رہی تھی اور ہنسا رہی تھی اور آزاد ہستیوں کو جال میں پھنسا رہی تھی۔

دماغ میں بھی خلل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی کسی سودا کا دخل ہے۔ ارے کوئی تو کہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک کیا تھا۔ آنکھ تھی یا طلسم ہوشربا تھا۔

جی ہاں۔ چھ معتبر اشخاص اس گھر میں ہیں۔ چار مرد۔ دو عورتیں۔ ان سے دریافت ہو تاکہ تحقیقات خلجان بے خودی سے واگزاشت ہو۔

آپ کون؟ اسم شریف؟ ابوبکر بن ابی قحافہ۔ کچھ ان آنکھوں کے بارے میں واقفیت ہے؟ کیوں نہیں۔ میرے یار، میرے خلیل۔ محبوب خدا کے جلیل کی آنکھیں ہیں۔ انہی کو دیکھکر میں بوڑھا جوان ہو گیا۔ انہی آنکھوں نے مجھکو چشم بصیرت عنایت فرمائی۔

دوسرے صاحب تشریف لائیں۔ ان کا اسم گرامی؟ عمر ابن الخطابؓ۔ ان آنکھوں کی نسبت کیا رائے ہے؟ میری رائے ان آنکھوں ہی نے چھین لی اور خود میری رائے بن گئیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہیں۔ اتنا کہہ سکتا ہوں۔ فاتح ہیں، ملک گیر ہیں، قاتل ہیں اور سب مقتول۔ انہی کے اسیر ہیں۔

تیسرے بزرگ کہاں ہیں۔ ان کا اسم مبارک؛ عثمانؓ بن عفان ان آنکھوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کن آنکھوں کے متعلق؟ یہ جو سامنے ہیں۔ میری زبان شرماتی ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے اور عقل چکراتی ہے۔ چوتھے صاحب کو بلائیے اور مجھ سے کچھ نہ کہوائیے۔

ان حضرت کو تکلیف دی جائے۔ صورت سے ذکی اور ذہین نظر آتے ہیں دیکھئے یہ کیا فرماتے ہیں؛ آپ کا اسم عالی؛ مجھ کو علیؓ ابن ابی طالبؓ کہتے ہیں۔ مگر میں ابھی کچھ نہ کہوں گا۔ پہلے ان دو عورتوں کا بیان سن لیجئے۔

اچھا اول ان بی بی صاحبہ کو تکلیف دو اور پردہ میں یہ آنکھیں دکھاؤ۔ آپ اپنا نام نامی ارشاد فرماسکتی ہیں؟ مجھکو عائشہ صدیقہ رضؓ کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آنکھیں کیا ہیں؟

بعد مدت کے ہوئی دید تری آنکھوں کی۔ یہ میری گود میں بند ہوئی تھیں، یہ مجھکو محبت سے دیکھتی تھیں، ان کو میں نے آسمانوں سے ٹکٹکی لگائے دیکھا، ان کو آنسوؤں میں غرقاب پاتی تھی، انہی کو دیکھ کر میرے تن بدن میں جان آتی تھی۔

دوسری سیدہ کو بھی دکھاؤ اور ان کے فرمان کو قلمبند کرلاؤ۔ حضرت کا نام مبارک؛ مظلوم فاطمہؓ۔ بنت صاحب العیون۔ یہ میرے بابا جان کی آنکھیں ہیں جو مجھ سے خفا ہو کر کہیں چلی گئی تھیں۔ یہ میرے حسنؓ حسینؓ کو پیار کرنے والی انکھیاں ہیں، یہ میرے ہاتھوں کے چھالوں کو دیکھنے والی ہیں۔ مجھے دو کہ مدت کے بعد میں نے پائی ہیں۔ میں تم کو آنکھوں پر رکھوں دل میں چھپالوں میں کچھ نہیں کہتی انہی سے پوچھو کہ یہ کیا ہیں۔

علیؓ نامدار۔ اب تو فرمائیے الجھن کا خلفشار مٹائیے۔ اچھا سنو! کہتا ہوں۔ یہ دیوانوں کو ہوشیار کرنے والی ہیں۔ ایک طرف خونخوار ہیں ظالموں کا قصہ پاک کرتی ہیں ایک جانب اشکبار ہیں، خوف ذوالجلال سے تر رہتی ہیں بے دلوں کی دلدار ہیں۔ دلوں کو قرار دیتی ہیں سنگدلوں کا نشتر ہیں۔ ذکاران کا کار ہے۔ یہ رس کے بھرے دو نین ہیں۔ انہی کی

مٹھاس سے کونین کے لب بند ہیں رخسار بخش ہیں۔ خمار شکن ہیں۔ یہ چشم محبت میرے بھائی محمؐد کی ہے۔ یہ چشم فسوں ساز میرے مولا میرے سردر کائنات کی ہے جس پر سحر کاری کا الزام لگایا گیا۔ یہ وہ ہیں، یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ۔ یہ ............... آنکھ کھل گئی۔ منزل مل گئی

# اجمیری چنبیلی کا پھول

از خطیب ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

منت پھول۔ یہ اجمیری چنبیلی کا پھول ہے۔ اس کی دید میں ہر ارمان حصول ہے۔ ایک ہار خرید و۔ گلے میں لٹکا کر سینہ سے لگاؤ۔

کیوں جناب داتا چنبیلی۔ آپ نے آنکھ کھولی۔ کلی سے پھول بنے۔ ذرا ہماری کلی کے لئے بھی تھوڑی سی صبا منگوا دو۔ اس کی بند پتیوں کو کھلنے کی اور کھلنے کی اجازت دلوا دو بھائی تم مقبول صبیبا آنہ ہو۔ تم چاہو تو خواجہ بھی مہربان ہو جائیں۔ خواجہ کی نظر مہر ہو تو اللہ میاں کی عنایت میں کیا دیر ہے۔ اسی خود غرضی کے لئے اتنا چکر اتنا پھیر ہے۔

بندہ مشرک نہیں۔ تم کو اور تمہارے خواجہ کو خدا، یا شریکِ خدا نہیں مانتا۔ مگر تمہارے وسیلہ کے سوا کسی کو نہیں جانتا پہچانتا۔ دل کے لگاؤ کے واسطے ایک رشتہ درکار ہے۔ رشتہ کہاں سے لاؤں قطع و برید کا زمانہ ہے۔ رگ گل میں تمنا کو پردتا ہوں۔ تم سے کہتا ہوں تمہارے خواجہ کے آگے روتا ہوں۔

کہنا چمن حیات سے یقین کی بہار خفا ہو کر چلی گئی ہے۔ وہم۔ شک۔ گمان نے ہر غنچہ کو گھیرا ہے بلبل نہیں۔ زاغ چونچیں مارتا ہے اور کہتا ہے یہ میرا ہے۔ یہ میرا ہے باغ اُجڑ جائے گا اس وقت آپ کو توجہ ہوگی تو کیا ہاتھ آئے گا۔ اے اجمیری پھول اتنا کہہ دے گا تو بڑا اجر پائے گا۔

# زُلف کا ماجرا

از خطیب ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

اندھیری رات میں سوائے اس کے میں اور کیا بیان کر سکتا ہوں کہ وہ سیاہ بال تھے۔ ان میں پیچ وخم تھے۔ کنگھی سے اُلجھتے تھے مشکل سے سلجھتے تھے۔

شاعروں نے ان کو گیسوئے عنبریں کہا۔ زلفِ پیچاں نام دھرا۔ میں نے یہ ماجرا سنکر خلقت کی آہوں کو فراہم کرنے کا حکم دیا کیونکہ سنتا تھا۔ آہ بھی کالی ہوتی ہے۔ اس میں بھی پیچیدگی کا جنجال ہوتا ہے۔ لوگوں نے کہا دوسروں کی آہ مانگتے ہو۔ تم بھی تو سینۂ سوزاں رکھتے ہو۔ ایک شرارۂ آہ اپنا بھی دو۔

میں گلِ چمپا کی بوئے مست میں مشغول تھا پبلک مطالبہ سے چونکا چاہا کہ ایک آہِ تاریک کھینچوں مگر دل نہ مانا۔ پھول کی بوئے پیچیدہ کو آگے بڑھا دیا۔ خوشبو گل کی لائی۔ غمزہ سے اترائی اور بولی اکیلی نہ جاؤں گی شمع کے دھوئیں کو ساتھ بھیجو۔ خوشبو کی یہ ادائے محبوبانہ دل کو بھائی۔ آہ کو بلایا۔ شمع کے دھوئیں کو بھجایا اور تین پیچیدگیوں کو اللہ بیلی، اللہ نگہبان کہا۔

اب زلف کا ماجرا شروع ہوا۔ سارے جہان کی آہیں، دنیا بھر کے پھولوں کی خوشبو کل بزم کائنات کی شمعوں کا دھواں مل جُل کر گھر سے چلا تو دیکھا۔ عرب کے ایک شہر مدینہ میں ایک کاکل دراز کھڑے ہیں اور سورہ واللیل پڑھ رہے ہیں۔

اس مردِ عرب کے گیسو دیکھ کر ہر پیچیدگی شرما گئی اور بولی۔ آشفتہ می دارد مرا زلفِ سمن روئے شما۔

زلفوں والے منہ سے نہ بولے۔ ایک دوسرے کمبل والے کے سر پر ہاتھ رکھا یہ بھی

گیسو دراز تھے، اور فرمایا

جاؤ میرے حسن۔ ہندوستان سدھارو اور تم کو سلطان الہند لقب دیا جاتا ہے وہ ملک تاریکی شرک سے کالا ہے۔ وحدت کا نور لیجاؤ، اُجالا بنو۔ میرے بنو۔ میرا بناؤ

خبر نہیں اس ہاتھ میں کیا تاثیر تھی۔ زلف حسن لہرانے لگی اور بل کھا کر چلائی۔ مجھ کو معین الدین حسن کا درجہ دیا۔ دین حسن کی اعانت میرا فرض ہے اور ہندی دلوں کی الجھن سلجھانا دل کا ارمان پورا کرنا میرا کام ہے۔ زلف کا اتنا ہی ماجرا سنا تھا کہ رجب کا چاند نظر آیا۔ ہندو مسلمان کے گھر میں عید آئی۔ اجمیر اجمیر کی دھوم مچی۔ ہر ستی اپنی بستی چھوڑ کر گھر سے چلی دیکھا پہاڑوں کی آغوش میں گنبد سفید کی وہی شان ہے جو مدینہ میں گنبد سبز کی تھی، زبان سے نکلا ؂

درِ خواجہ یا رو درِ مصطفےٰ ہے ٭ سراسر مدینے کا نقشہ کھچا ہے

ادب نے کہا خاموش سلسلۂ زلف میں اسیر ہو۔ زبان بند کر۔ تقریر نہیں تاثیر ہو تاکہ دل کے اُلجھاؤ سلجھیں۔ من موہنی مراد ہاتھ آئے۔

---

# چارۂ تشنہ لبی

ازخطیب۔ ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء

اجمیر کا عرس، مئی کا مہینہ، خلائق کا انبوہ جس میں ہندو بھی، مسلمان بھی، دانا بھی نادان بھی۔ مگر ہر جان پانی کی خواہاں اور پانی مثل خطہ حجاز ہر جگہ نایاب۔

اخباروں نے چھاپا۔ اس کا تدارک ضرور ہو۔ اہتمام کرنیوالوں نے کمریں باندھ لیں حضور نظام کے وعدے چشمہ کشائی بھی یاد آگئے مگر دل نے انگڑائی لیکر کہا میری پیاس کا کیا انتظام ہوگا اس کے لئے کونسا ہمدرد ہے جو کنڈی کھٹکھٹائے گا۔ تشنہ کامی سے

جان لبوں پر آئی ہے۔ روح کی زبان خشک ہے چہرہ پر مردنی چھائی ہے۔ کوثری خواجہ سے کہو اس تشنہ لبی کے چارہ کار نہیں۔ تو اخبار العشق میں ریمارک چھپائے جائیں گے فلکتہ چینی ہوگی۔ پھر نہ کہنا کہ یہ سخت نویسی حد سدیشن تک پہنچتی ہے۔ پریس ایکٹ کے اشارے کنائے یا اور کسی انداز میں گرفتار کرو۔ اس پر پہلے ہی صاف کہے دیتے ہیں اس پیاس کا انتظام کرنا ہوگا۔ خالی جام بھرنا ہوگا۔

ایک میں ہوں ایک میرا خماری ہے۔ مجھ میں اس میں اسی جام کی خاطر مدت سے یاری ہے۔ دودھ کی نہر نہیں مانگی، شہد کا چشمہ طلب نہیں کیا۔ سادہ پانی کا ایک کٹورہ درکار ہے۔ بڑھا دو، منہ سے لگا دو، دل کی لگی کو بجھا دو۔ للہ بجھا دو۔ میں قربان کوچہ شرابی سے بچا کر عشق کے اصلی دارالخلافے تک پہنچا دو۔

# اے دل مجھ پر آ

از خطیب ۲۲ جون ۱۹۱۵ء

تو اچھی صورتوں پر آتا ہے میں بھی خدا کی صورت پر بنا ہوں۔ اچھی سیرتوں پر آتا ہے تمام کائنات کی مخلوق سے افضل و اشرف سیرت رکھتا ہوں۔ تو لباس پر، رفتار پر، گفتار پر، اداۓ طرحدار پر جان دیتا ہے دیکھ مجھ میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔

پس میں درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر آ یعنی مجھ سے محبت کر۔ میری الفت میں اسیر ہو۔ اگر تو میرا دل ہے تو غیر پر نہ آ خود مجھ پر آ۔

تو مجھ کو کتنا پیارا ہے سینہ کے اندر پہلو میں چھپا کر سوائے تیرے کس کو رکھا ہے۔ اس جون کی گرمی میں تیری خاطر نیلوفر کا شربت پیتا ہوں۔ دریا کے ٹھنڈے ریت پر لوٹتا ہوں تاکہ تو خنکی سے راحت پائے، اور ہاں اپنے

## سانس کا پنکھا

تجھ پر لگا رکھا ہے جو دن رات چلتا رہتا ہے اور تجھ کو ہوا دیتا ہے۔

میرے دل میں تیری مخفی خواہش کو ذرا سے اشارہ سے تاڑ جاتا ہوں اور جس طرح تو کہتا ہے کھاتا ہوں، پہنتا ہوں، چلتا ہوں، پھرتا ہوں۔ تیری ہی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا ہوں یعنی جس چیز کو تو چشم مسرت سے دیکھنا چاہتا ہے، اُسی پر نظر ڈالتا ہوں۔ اور کسی پر نہیں۔ تیرے ہی کانوں سے سُنتا ہوں یعنی تیری مرضی کے خلاف کسی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ تو پھر کیا شرط انصاف ہے کہ تو مجھ کو چھوڑ کر دوسروں پر آئے۔ مجھ سے بے وفا بن کر غیروں کی وفا کا عہد باندھے۔

خبر بھی ہے۔ میں اس خدا کا بندہ ہوں جس کو شرک سے نفرت ہے۔ ہر گناہ کی اس کے دربار میں معافی ممکن ہے مگر شرک کی نہیں۔ پس میں کیونکر گوارا کروں کہ تُو اغیار کی الفت میں مبتلا ہو اور میرا حق دوسروں کو دے۔

اے دل تیرا نام ایک مجاز ہے حقیقت میں شکوہ راز و نیاز ہے۔ میری اس تحریر کو چشم حقیقت سے پڑھ اور خدارا مجھ سے محبت کر۔

اگر تو مجھ سے محبت کرنے لگے تو خدا تک تیری رسائی ہو جائے گی۔ کیونکہ میری شناخت خدا کی شناخت ہے۔ چونکہ تو خود میرا دل ہے جب میرے وجود کا عرفان حاصل کریگا۔ عرفان رب حاصل ہو جائے گا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ دلیل موجود ہے۔

مگر ہائے تو مجھکو بھول گیا۔ تو غیر کی چاہت میں میری وفا شعاریوں کو پس پشت ڈال بیٹھا۔ مجھے تجھ پر غصہ آتا ہے چاہتا ہوں اپنے سینہ کو چیر ڈالوں اور تجھ کو نکالکر پھینکدوں۔ لیکن یہ بھی محال ہے سہ نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی۔ الٰہی یہ کیسی مشکل آئی۔

اچھا تو میں دنیا والوں کو تیری کج ادائی سناتا ہوں اور ان سے کہتا ہوں کہ جس کو سینہ سے لگا کر رکھا ہوا ہے بھروسہ کبھی نہ کرنا۔ وہ تمہارا نہیں غیر کا طلبگار ہے۔ بلکہ خود تجھ سے

کہتا ہوں کہ خدا نے قدرت کا کارخانہ یونہی بنایا ہے کہ میں تجھ پر مروں اور تو دوسروں پر۔ لہذا تو جن پر مرتا ہے وہ بھی تجھ سے بے وفائی کریں گے اور تجھ کو اسی طرح آتش فراق میں جلنا ہوگا جس طرح میں جلا کرتا ہوں۔

تو مجھ کو چھوڑ کر ماسوا پر فریفتہ ہوا۔ دیکھو ایک دن ماسوا تجھکو چھوڑ کر ایکدوسرے ماسوا کا اسیر ہوگا۔ پھر تو ہوگا اور دردبھری آہیں۔ وہ آہیں جن کا کچھ نتیجہ نہ نکلے گا کیونکہ دوزخ کا عذاب ابدی اور غیر فانی ہے۔

---

# سوہنے دی یاد وچ

# ہچکی

توکیوں آتی ہے، میرا سجنا تو یاد نہیں کرتا؟ میرے من موہن سُندر کے دل میں میرا خیال تو نہیں آیا؟

پھر آئی، ہچکی نہ ستا۔ میرا سینہ ناتوان ہے۔ اس میں جگہ جگہ پھانسیں چبھی ہوئی ہیں تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے۔ اس کے زخم دکھنے لگتے ہیں۔ سانس رکا جاتا ہے۔ جب تو آتی ہے گردن کو جھٹکا دیتی ہے اور ناف سے سر تک پٹھوں اور رگوں کو ہلا ڈالتی ہے۔ میرا جی سانس سے گھبراتا ہے اور پیا پیارے کی یاد میں بے قابو ہوا جاتا ہے۔

ہائے میں نے کیسے کیسے درد بھرے خط بھجوائے۔ لکھنا نہ آتا تھا، دوسروں سے لکھوائے مگر اس نے کاغذ کا ایک پرزا نہ بھیجا۔ دو حرفوں میں بھی بخیلی کی۔ کس سے کہوں میری نہ کوئی سکھی ہے نہ سہیلی ہے۔ اپنا ہے نہ پرایا ہے۔ کاش مجھ پر کوئی لعن طعن

ہی کرنے والا ہوتا۔ اسی بہانہ سے دل بہلتا اور اس کا ذکر سننے میں آتا۔ میں نے اس کی خاطر رسوائیاں برداشت کیں۔ دنیا نے کیا کچھ نہ کہا لیکن اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ میں بھی کوئی ہوں۔ اب یہ ہچکی آئی ہے۔ کیا (مو ہینے ڈا سینہا) پیام یار لائی ہے۔ اگر یہ اس کا خط ہے تو کس سے پڑھواؤں۔ خیال کی ڈاک میں سانس کا ڈاکیہ لایا ہے۔ وہی پڑھے گا۔ مگر آہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں تلھ (پیارے) مجھے بتا تو کیوں روندا (روتا) ہے۔

میرا ساجن تو اچھا ہے؟

یہ ہچکی موت کی خبر لاتی ہے۔ اس کے نہ دیکھنے کا ارمان دل میں رہا جاتا ہے۔ دنیا کا آسمان اب تک اونچا نظر آتا ہے۔ زمین اسی طرح بچھی ہوئی ہے۔ چولھے کی آگ ویسی ہی زبانیں نکال نکال کر جل رہی ہے۔ میرا دل اب تک تڑپ رہا ہے۔ گواہ رہو۔ میرا خاتمہ دل و جان کے نام پر ہوتا ہے جس کا ہمیشہ کلمہ پڑھا۔ مجھے قبر کا کچھ ڈر نہیں۔ اس کی تاریکی کا اندیشہ کیا کروں۔ فرقت کی رات سے زیادہ اندھیری نہ ہوگی اور میں نے ساری عمر انہی راتوں میں بسر کی۔ میں منکر نکیر کا کیا خوف کروں۔ پیارے کا نام یاد ہے۔ اس کی گلی کا پتہ یاد ہے وہی میرا دین ہے۔ وہی میرا ایمان ہے۔

زندگی کا چراغ بجھتا ہے۔ روح کا پروانہ دوسری شمع کے گھر جاتا ہے۔ اب گھر کے بستروں کو لپیٹو۔ آئینے توڑ دو۔ کسی کو بلاؤ۔ جو میرے غم میں گریباں چاک کرے۔

آخری ہچکی آنے سے پہلے مجھے بیان کر لینے دو کہ میرا صیّاد بڑا ہرجائی ہے۔ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں اس کی سمائی ہے۔ نہیں آتا تو ایک میرے پاس۔ اس واسطے اے دنیا کے لوگو! تم اگر اس کوچہ میں آؤ اور اس سے جی لگاؤ جس کو خدا کہتے ہیں تو ذرا سوچ سمجھ کر ایسا کرنا۔

# آغوشِ محرم میں شبِ عید

از نظام المشائخ ۔ نومبر ۱۹۱۴ء

آنکھوں نے رونا چھوڑ دیا، دلوں سے آہوں کی صدائیں نہیں آتیں۔ اب کہیں سے سبکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں اب کوئی عشق بازی کے کوچہ میں قدم نہیں رکھتا۔ یار کی گلیاں سنسان پڑی ہیں گویا ان گلیوں کے یار سب جنگ یورپ میں چلے گئے۔

آج وہ وقت ہے کہ زلف و کمر کا خیال ایک بڑا گناہ مانا جاتا ہے۔ جناب حالی اس کے مفتی اعظم ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ انہوں نے لاانتہا شاگرد وہم و خیال پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک جانب مولینا اشرف علی اصلاح خیال کے در پے ہیں، ایک طرف خواجہ غلام الثقلین اصلاح تمدن کا ترانہ گاتے ہیں۔ انہی کے پڑوس میں اسوۂ حسنہ کی صدا بلند ہوئی ہے۔ نظام المشائخ بھی لمبی لمبی آیات و احادیث و اقوال اولیاء لکھنے لگا حسن نظامی تک اس گلی میں نہیں آتا۔ جو اس گلی کے سو سو پھیرے کرتا تھا۔

اب عشق بازِ زندگی کا کیا انجام ہوگا جس کی روح خدا ہے جس کو شیکسپیئر نے مجسم خدا کہا اور جس کی حقیقت سمجھنے سے وہ عاجز ہوگیا جس پر مولانا رومؒ کو حال آتا تھا، جس کو دیکھ کر حافظ شیراز رح کا دم دنیا سے گھبراتا تھا جس پر شیخ سعدی جان دیتے تھے۔

اب پروانوں کی پرستش نہیں ہے۔ اب شمع کی یادگاریاں مٹ رہی ہیں۔ اب بلبل کی بدمستیاں خواب و خیال ہوئی جاتی ہیں۔ اب شاخ گل کا جھومنا کوئی نہیں دیکھتا۔ اب گل کی چشم سرمگیں سے کسی کی آنکھیں نہیں لڑتیں۔ آج تو آنکھوں میں سرمہ لگانا بھی عیب سمجھا جاتا ہے اور عشق بازی کون کرے جب کہ ہر وجود روٹی اور عزت کے دام میں گرفتار ہے ہر ہستی کو بال بچوں کی پرورش کا آزار ہے۔ جناب حافظؒ کے مطرب و مے کو کون پوچھے؟

کرۂ دہر کا معمہ نوالے کھانے والوں نے کیسی حکمت سے حل کر لیا ہے۔

کباب کھانے والے گذر گئے۔ شراب پینے والے تباہ ہو گئے۔ سرمد تک راہی عدم ہوئے۔ جو سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر اوقات بسری کر لیا کرتے تھے۔ جرمنی کی سالہا سال کی تیاریاں بھی جنگ میں آئیں اور گذر رہی ہیں۔ یورپ کی نبرد آزمائیوں کے ولولے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ توپوں کے گولے بندوقوں کی گولیاں سنگینوں کی نوکیں سب اپنی زندگی کے دن آگے بڑھ بڑھ کر پورے کر رہی ہیں۔

آج محبت کو دنیا میں رہنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔ الفت کو اس دورِ حیات میں آنے سے روکا جاتا ہے۔ مولانا رومؒ نے خمار گندم کا الزام لگا کر مجاز کو خوفناک بنا دیا کیا حقیقت والے گندم نہیں کھاتے۔ کیا انکے جذبات میں گندم کے دانے آگ نہیں لگاتے۔

مجاز اور حقیقت دو لفظ ہیں جو ذہن انسانی کے برزخ خیالی ہیں۔ ورنہ نہ حقیقت کی کچھ ہستی ہے نہ مجاز کی۔ سوز کا کچھ نتیجہ ہے نہ ساز کا۔

آؤ! محبت کی ایک نئی دنیا آباد کریں آؤ! عشق کا ایک نیا آسمان و زمین بنائیں۔ آؤ! اب وقت آگیا ہے کہ ان پیٹ پیٹ پکارنے والوں، اور دولت و عزت کے متوالوں کو بائیکاٹ کریں۔ یہ ہم کو جینے نہ دیں گے۔ ان کو کالج و اسکول بنانے دو، ان کو انجمن و کانفرنس میں غل مچانے دو۔ یہ اور ان کے سب حالی موالی یہاں رہیں۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم کو ایک سانس بھی ان کے ساتھ لینا دوبھر ہے۔

انھوں نے بہت لکھنے والے بنائے ہیں جو بھاپ کی مشینوں کی طرح انجان اور بے خبر رہ کر لکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے بولنے والے تیار کئے ہیں جو گراموفون کے ریکارڈوں کی مثل گاتے بجاتے ہیں اور عالم بےچارگی میں دوسرے کے ہاتھ سے البم میں بند کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں ہم کو زکام ہو۔ تو ان کو بنفشہ گاؤزبان یاد آتی ہے سرسام کا خطرہ ہو تو سر کے بالوں کو نظر لگاتے ہیں۔ سردی آئے تو لحاف توشک سے جی بہلاتے ہیں۔

گرمی آئے تو برف او رپنکھے کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

یہ مقدموں میں وکیلوں کے محتاج ہیں۔ یہ چلنے میں جانوروں اور کوئلہ پانی کے محتاج ہیں۔ ان کو لباس کے لئے بھیڑ کی اُترن اُون درکار ہوتی ہے۔ ان کا سہارا جھوٹ و مکر ہے۔ ان کی پشت و پناہ دغا و جفا کاری ہے۔

یہ خدا کو کیا جانیں، یہ اس کی امانت محبت کی کیا قدر کریں۔ منہ سے شرک خفی و جلی پکارتے ہیں مگر آنکھوں، ہاتھوں اور خیال و ارادہ سے خود ہی اس کا ارتکاب کرتے ہیں اب ہم ان میں ایک دم بھی نہیں گزار سکتے۔ اب ایک لمحہ بھی ان میں رہنا دشوار ہے۔ چلو چلو کہ اُن سے علیحدگی میں بیڑا پار ہے۔

اس دنیائے جدید کی کیا بات ہے۔ عید قرباں کی ستائی رات ہے۔ ہوٹل کا اکیلا کمرہ ہے۔ سامنے کمپنی باغ ہے۔ میز پر آئینہ کے سامنے لیمپ جل رہا ہے۔ پرانی دنیا کا کوئی پروانہ نہیں ہے۔ نورجہاں اسی منظر کے لئے کہہ گئی تھی۔ ع

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

ہوا آتی ہے مگر عاشق مزاج مچھروں سے گستاخی نہیں کرسکتی۔ مچھر آتے ہیں، گاتے ہیں، حال میں لاتے ہیں۔ آغوش کھلا ہوا ہے۔ نہ تو مچھری نہ من مچھرم کی صدا ہے ادھر مچھر، اُدھر مچھر، نیچے مچھر، اوپر مچھر، دائیں مچھر، بائیں مچھر، ہر طرف مچھر، ہر سمت مچھر خیال میں بھی وہی، عالم مثال میں بھی وہی ظاہر میں بھی مچھر باطن میں بھی مچھر۔

آ میرے پیارے مچھر، میری آنکھوں پر، میرے رخسار پر، میرے ہونٹوں پر، میری ٹھوڑی پر۔ تو اس نئی دنیا میں عشق کا پروانہ ہے۔ تو شاخ شجر محبت کا بلبل ستانہ ہے۔ آفاقہا گردیدہ ام، بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔

میں شکل صورت کا پابند نہیں ہوں میں سیرت کے حسن و قبح کو بھی آزادخیالی کے خلاف سمجھتا ہوں۔ جو دل کو بھا جائے۔ جو تنہائی میں انیس و ہمدم بن جائے۔ جو سب کو

چھوڑ کر میرا ہو جاتے۔ جو ہوائے دہر کے مخالفانہ جھونکوں کے باوجود میرے پہلو سے جدا نہ ہو۔ وہی میرا ہے۔ اسی کا میں ہوں۔ باقی سب ہیچ ہیں۔

اس نئی دنیا کے قوانین کچھ بھی ہوں لیکن محبت اور اس کے جذبات عمیر محدود سے یہ آباد ہے۔ سن لو محبت کے پیام رساں نے کیا فرمایا۔

جو تیری دوستی کو دوسروں کی دوستی پر، میری بات کو دوسروں کی باتوں پر، تیری محبت کو دوسروں کی محبت پر ترجیح دے وہی تیرا دوست ہے۔ گویا ان کے خلاف دوستی نہیں ہے۔ میرے دلدار پھر کو دیکھ لو یہ سب اوصاف مجھ میں ہیں۔ میری بات سننے آیا ہے۔ میری دوستی میں وطن سے ہجرت کی ہے۔ میری محبت کو تمام کائنات کی ہم نشینی سے مقدم جانا ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔

میں محبت کے پیامبر کے قربان۔ کیا بات سنائی ہے۔ کیا دل کی بیکلی مٹائی ہے۔ ساری رات آنکھوں میں گزری۔ آنکھیں لال ہوگئیں۔ خمار کے ناسوت سے لاہوت تک پہنچیں۔ اندھیری رات نہ تھی۔ چاندنی نے اپنی چکٹ کی بجلیاں گرائیں۔ گملوں کے سبز پودے شرپر فتنے بنے۔ تشنہ انتظار کو کسی کی آمد کی آہٹ کا سراب دکھایا۔ ہر لحظہ کلیجہ منہ کو آیا۔ مگر دل کہتا تھا۔ کہ جب میری بستی پریم سے آباد ہے۔ تو پھر اجڑا گھر آباد ہے۔

یہ پریم میری ہر الجھن کا سلجھانے والا اور میری ہر دشواری کو آسان کرنے والا ہے۔ یہ پریم ہی ہے جس کے ستون پر آسمان کھڑا ہے اور سورج چاند قائم ہیں۔ پریم نہ ہوتا تو سب ٹوٹ پھوٹ کر گر پڑتے۔ سمندر سوکھ جاتے۔ پہاڑ زمین کے اندر دھس جاتے۔ دریا رک جاتے کنارہ بہنے لگتا۔ پانی آگ لگاتا۔ اور آگ پیاس بجھاتی۔ کیونکہ پریم و محبت کی تاثیریں دنیا جہان سے نرالی ہیں۔ عشق کی گنگا ہمیشہ الٹی بہا کرتی ہے۔ یہاں کا پانی آگ ہے اور آگ پانی ہے یہ ہر ایک کے لئے ایک آفت جانی ہے

# پریم آتما سے کچھ باتیں

میں اُس کی گود میں ہوں اور وہ میری گود میں ہے۔ میں پریم اور محبت سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ وہ محبت جس کو میں پریم آتما کہتا ہوں۔ اور جس نے مجھے یہ ارمان بھری جان عطا کی ہے۔ یہ میرا رب ہے۔ یہ میرا مولا ہے یہ میرا مالک ہے۔

حکم ہو تو آنسوؤں کے سمندر اس کے قدموں پر نثار کردوں۔ ارشاد ہو تو ایک نعرہ مجنونانہ بلند کر کے دنیائے جدید کو ان کے الطاف کی خبر دیدوں کچھ تو بولو۔ ہم بھی تو موسیٰ سے ہمکلام ہونے والے کی آواز سنیں۔ ہم کو بھی تو معلوم ہو کہ امتِ مرحومہ کے یہ درجے اور مراتب ہیں۔ آپ کے لحاظ و سکوت سے دم لبوں پر آ گیا۔ ہم اور تو کچھ نہیں چاہتے۔ فقط آپ کی تعریف کا طریقہ دریافت کرتے ہیں۔ آپ کی آواز سننے کی تمنا رکھتے ہیں۔

ہائے یہ۔ آہ یہ۔ ربنا انت۔ مولانا انت۔ ہکذا۔ مثل ہذا۔ ارے تو۔ افوہ آپ۔ اپنی قدر حضرت شما۔ نئی دنیا کے دیوانو آؤ۔ دیکھو نقاب اٹھ گئی پہلے میرے جدید محرم راز مجھ روں کو بلاؤ جو راتوں کو ان کی یاد میں بلبلایا کرتے تھے اور درد کے افسانے سریلی صداؤں میں سنایا کرتے تھے۔

دیکھیں۔ وہ یہ ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو پکارنا جن کی خاطر آج کے دن انہوں نے سر کٹائے ہیں۔ دیکھو یہ کھلم کھلا میرے گھر میں آئے ہیں۔ تم نے جان کھوئی اور یہ جان لینے سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ کیسے بچارے انجان بنتے ہیں۔ دوسروں کی گردن پر چھریاں پھر گئیں اور یہ بے خبر بنے کھڑے ہیں۔ یہ تمہارے ہی کھلونے تھے۔ تم ہی پر صدقے ہو گئے آؤ ذرا آنکھوں میں تو آؤ۔ ذرا کلیجہ تو ٹھنڈا کرو۔ اور ذرا اس سوال کا جواب تو دو۔ کہ عید کیا چیز ہے اور محبت کی کتاب میں اس کا کیا حال لکھا ہے۔ اور پھر عید میں قربانیاں کیوں کی جاتی ہیں۔

# تیسری منزل

## عشق و محبت کے اشارے

### آنسو کی سرگذشت

(از رسالہ زمانہ کان پور ۱۹۰۲ء)

جس دل میں درد نہیں اس کو انسان کے سینہ میں نہ رہنا چاہیئے۔ آنسو نشان درد ہے اور مجھکو اس کی سرگذشت بہت بھاتی ہے۔ زمانہ کی خاطر اس کو قلم بند کر دیا گیا۔ تا کہ سب درد آشنا دل دید کا لطف اٹھائیں۔

بچارا آنسو اس گھر میں پیدا ہوا جہاں خوشی کی چہل پہل اور شادی کی خوب گہما گہمی تھی۔ چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آرہی تہیں مگر جس تہہ سے دل میں اس کا ڈیرہ تھا۔ اس کو شکم مادری کی یاد نے گھیر رکھا تھا۔ آنکھیں بار بار اس وطن تاریک کو ڈھونڈھتی تھیں اور مایوس ہو کر رہ جاتی تھیں۔ آخر دل نازک کو تاب نہ رہی۔ اس میں درد کا ایک دھواں اٹھا اور آنسوؤں کو زبردستی آنکھوں تک کھینچ لایا۔

یہ کشمکش مدتوں آنسو کو درپیش رہی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ بھرے پُرے گھر میں بربادی شروع ہوئی۔ پہلے باپ مرا اور پھر ماں بھی رخصت ہوگئی۔ ایک جوان لڑکی اور چھوٹا سا لڑکا زندہ بچا۔ باقی سب کا خاتمہ ہوگیا۔ لڑکی ہوشیار تھی بار بار بیکسی و لاچاری کا خیال آتا اور غم دہ دل پر ایک ٹھیس سی لگتی۔ آنسو امنڈ امنڈ کر آتے حسین و غمگین آنکھوں میں تیرنے لگتے۔ مگر یہ دکھیاری ان کو زبردستی پی جاتی تاکہ معصوم بھائی نہ دیکھ لے اور اس کے شکستہ دل کو صدمہ نہ پہنچے

کچھ دن تو یونہی گذرے۔ اس کے بعد لڑکی کی شادی ہوگئی۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی، تعلیمیافتہ خاوند کو بہت عزیز ہوئی اور دونوں میں اخلاص و محبت کا مضبوط رشتہ قائم ہوگیا یہ صورت دیکھ کر آنسو خلوت میں سدھارے اور ان کی سرگذشت کا سلسلہ ملتوی ہوگیا۔

یکایک زمانہ نے اپنی نیرنگی کا ورق اُلٹا اور پیاری کا پیارا ساجن طاعونی شکار ہوگیا۔ شوہر کیا مرا یہ خود مر گئی۔ ہندو دھرم اور راجپوتی شرم کے پیام آنے لگے کہ زندگی ختم ہوئی۔ اب اس آباد دنیا میں تیرا کچھ بھی حصہ نہیں رہا اپنا چت چتا کی سلگتی آگ میں لگا۔ یہی تیرے دکھ کا خاتمہ کریگی۔ چندرمان کی سہانی چاندنی کو مت دیکھ اور برکھا رت کی مستانہ ہواسے اپنے دامن بچا اور یقین کر کہ خوشی کے دن تیرے ساجن کے ساتھ چل گئے۔ بپتا کی ماری لڑکی دم بخود چپکی سن رہی تھی کہ دل میں ایک سناٹا آیا۔ دماغ کی ہلکی ہلکی چپک ہونے لگی اور برسوں کے رُکے ہوئے آنسو اُبل پڑے۔ یہ آنسو نرالی شان کے تھے۔ اندرونی سوزش نے ان کی رنگت نکھار دی تھی۔ سیاہ پلکوں سے ڈھلک کر زرد رخساروں پر بہنا اور چمکنا ستم ڈھا رہا تھا۔ اب آنسوؤں کا دور دورہ تھا اور انہیں کا عمل دخل۔ اندھیری رات میں بیچاری جوان بیوہ کا کوئی ساتھ نہ دیتا۔ غریب اکیلی پڑی سسکیاں لیا کرتی تھی۔ مگر اس کے اصلی رفیق آنسو اس سے ایک لحظ کو بھی جدا نہ ہوتے تھے۔

ایک دفعہ ہولی کے موسم میں ارمان بھری بیوہ اپنے رنگیلے پریتم کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھی اور اس کی سہاگن ہمجولیاں رنگ اچھالتی کلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور اس کی حالت زار پر کسی کو بھی رحم نہ آتا تھا۔ یہ بے ترسی دیکھ کر اسے خیال آیا کہ مہاتما بدھ نے سچ فرمایا تھا کہ کل سنسار خود غرض اور دکھ کی پوٹ ہے۔ اس کی فانی خوبی پر نہ ریجھنا۔ اپنی ہستی کے مطالعہ میں دل لگانا جو اصلی سکھ اور آنند ہے۔ یہ خیال آتے ہی بدنصیب لڑکی نے جی میں ٹھان لی کہ اب اس جوتی سروپ سے دل لگانا چاہیئے جس نے ان نیرنگیوں کو ظاہر کیا ہے یہ سوچ کر ایک رات گھر سے نکل گئی اور گنجان جنگل میں آسن جما کر جا بیٹھی اور کسی کا دھیان جما لیا

جب وہ آنکھ بند کئے سانس روکے کسی کی یاد میں تھی۔ اُس نے دیکھا کہ خوشی کی مورت آسمان سے اتر رہی جو زور رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی کہ یہ دنیا خوش رہنے کے لئے بنی ہے مگر کوئی خوشی آنسو کی کیرن اور جھالر کے بغیر خوبصورت اور خوشنما نہیں ہو سکتی۔ اس لئے آنسو زندگی کے لئے زیبائش بنائے گئے ہیں۔

---



از رسالہ زبان ۱۹۰۵ء

اب ہر ملک میں چراغ اور شمع کے بدلے لمپ کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان تاریکی دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ جانتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں سب کام آسانی سے پورے کر لیتے جاتے تھے۔ ہندوستان کی نسبت سنا ہے کہ جب کسی رشی کو رات کے وقت کوئی تحریر پڑھنی ہوتی تو جنگل کی گھاس وغیرہ جلا کر پڑھتا تھا یہی حال عرب کا تھا۔ دہاں بھی چراغ کا دستور نہ تھا۔ وہ لوگ بھی خاص ضرورت کے وقت لکڑیاں روشن کر کے کام نکال لیتے تھے۔ اس کے بعد انسان تمدن میں آگے بڑھا اور مٹی کا چراغ بنایا۔ سینکڑوں برس خاکی چراغ نے خاکی انسان کے گھر کو روشن رکھا اور اس کی روشنی میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ جب نفاست بڑھی تو مومی اور کافوری شمع بنائی گئی اور اس کے لئے مختلف وضع کے فانوس تیار ہوئے تاکہ ہوا اور پروانوں کی آفت سے محفوظ رہے۔

فانوس عموماً شمعوں کے لئے بنائے جاتے تھے۔ چراغ کے واسطے بہت کم چیزیں تھیں جو بے چارے کو ہوا کے جھونکوں سے بچا سکتیں۔ ترقی کے زمانہ میں مٹی کے بدلے تانبہ اور پیتل کے چراغ بنائے گئے۔ مندروں، مسجدوں اور خانقاہوں میں ان پیتلی چراغوں کا بہت رواج ہو گیا۔ چنانچہ باوجود اعلیٰ ترقی کے آج تک مذہبی مقامات میں یہی پیتل اور تانبہ کے چراغ پائے جاتے ہیں۔ یورپ نے جس کو نئی روشنی کا استاد بیان کیا جاتا ہے چراغ جی

کے فن میں بڑا کمال پیدا کیا ہے۔ اس نے اول ٹین کی ڈبیاں روشن کیں۔ اسکے بعد کانچ کی چمنیاں ڈھالیں اور لمپ تیار کیے۔ کانچ کی چمنیاں ایک طرح کے فانوس ہیں جو روشنی کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

انسان ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ اس کو پرانے زمانے کے وہ چراغ چاند و سورج نظر آئیں گے جو اپنی قدیمی حالت پر جوں کے توں قائم ہیں۔ زمین پر مٹی کے چراغ سے لیکر بجلی چراغ، شمع کافوری، شمع مومی، مٹی کے تیل کا لمپ یہانتک کہ بجلی کا لمپ بن گیا۔ مگر آسمان پر وہی پرانا قاعدہ جاری ہے۔ کیا مجال جو ذرا تغیر و تبدل ہو۔

مگر زمین کی ترقی نے جو روشنی کے معاملہ میں ہوئی، بجائے اس کے کہ انسان کو فائدہ پہنچاتی، الٹا نقصان پہنچایا۔ آجکل آدمی اس نئی روشنی کی بدولت طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہے۔ اول تو خرچ کی زیادتی، پہلے تھوڑے خرچ میں بہت سا کام نکل جاتا تھا۔ اب کروڑوں روپیہ نمائشی اور فضول روشنی میں برباد ہوتا ہے۔ غریب ہندوستان بھی امیر یورپ کی دیکھا دیکھی ان فضولیات میں مبتلا ہو گیا اور اپنی محنت کی کمائی یورپ کے لیمپوں کی نذر میں مفت گنوا رہا ہے۔

مسلمانوں کے مشہور پیشوا اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ جب وہ رات کیوقت ملک کا کام کرتے کرتے کسی کام کو باہر جاتے تو چراغ گل کر دیا کرتے تھے اور فرماتے کہ میں نہیں چاہتا قوم اور ملک کا تھوڑا سا تیل بھی بیکار جائے اسواسطے چراغ گل کر دیتا ہوں کہ فضول روشن نہ رہے۔ بخلاف اس کے آجکل پبلک کے روپیہ کی جیسی قدر کی جاتی ہے ظاہر ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کی طرف سے شہروں میں روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے مگر اس میں ذرا سی ہمدردی روا نہیں رکھی جاتی۔

لمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے خواہ وہ لوہے کی ہو یا کانچ کی، اس میں تیل بھر دیتے ہیں اور بتی

جب وہ آنکھ بند کئے سانس روکے کسی کی یاد میں تھی۔ اُس نے دیکھا کہ خوشی کی مورت آسمان سے اتری جو رو رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہ دنیا خوش رہنے کے لئے بنی ہے مگر کوئی خوشی آنسو کی کیرن اور جھالر کے بغیر خوبصورت اور خوشنما نہیں ہو سکتی۔ اس لئے آنسو زندگی کے لئے زیبائش بنائے گئے ہیں۔



از رسالہ زمانہ ۱۹۰۵ء

اب ہر ملک میں چراغ اور شمع کے بدلے لیمپ کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان تاریکی دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ جانتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں سب کام آسانی سے پورے کرلئے جاتے تھے۔ ہندوستان کی نسبت سنا ہے کہ جب کسی رشی کو رات کے وقت کوئی تحریر پڑھنی ہوتی تو جنگل کی گھاس وغیرہ جلاکر پڑھتا تھا یہی حال عرب کا تھا۔ وہاں بھی چراغ کا دستور نہ تھا۔ وہ لوگ بھی خاص ضرورت کے وقت لکڑیاں روشن کرکے کام نکال لیتے تھے۔ اس کے بعد انسان تمدن میں آگے بڑھا اور مٹی کا چراغ بنایا۔ سینکڑوں برس خاکی چراغ نے خاکی انسان کے گھر کو روشن رکھا اور اس کی روشنی میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ جب نفاست بڑھی تو مومی اور کافوری شمع بنائی گئی اور اس کے لئے مختلف وضع کے فانوس تیار ہوئے تاکہ ہوا اور پروانوں کی آفت سے محفوظ رہے۔

فانوس عموماً شمعوں کے لئے بنائے جاتے تھے۔ چراغ کے واسطے بہت کم چیزیں تھیں جو بے چارے کو ہوا کے جھونکوں سے بچا سکتیں۔ ترقی کے زمانہ میں مٹی کے بدلے تانبہ اور پیتل کے چراغ بنائے گئے۔ مندروں، مسجدوں اور خانقاہوں میں ان برنجی چراغوں کا بہت رواج ہوگیا چنانچہ باوجود اعلیٰ ترقی کے آج تک مذہبی مقامات میں یہی پیتل اور تانبہ کے چراغ پائے جاتے ہیں۔ یورپ نے جس کوئی روشنی کا استاد بیان کیا جاتا ہے چراغ جی

کے فن میں بڑا کمال پیدا کیا ہے۔ اس نے اول ٹین کی ڈبیاں روشن کیں۔ اسکے بعد کانچ کی چمنیاں ڈھالیں اور لیمپ تیار کیے۔ کانچ کی چمنیاں ایک طرح کے فانوس ہیں جو روشنی کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

انسان ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ اس کو پرانے زمانے کے وہی چراغ چاند و سورج نظر آئیں گے جو اپنی قدیمی حالت پر جوں کے توں قائم ہیں۔ زمین پر مٹی کے چراغ سے لیکر بجلی چراغ، شمع کافوری، شمع مومی، مٹی کے تیل کا لمپ یہاں تک کہ بجلی کا لمپ بن گیا۔ مگر آسمان پر وہی پرانا قاعدہ جاری ہے۔ کیا مجال جو ذرا تغیر و تبدل ہو۔

مگر زمین کی ترقی نے جو روشنی کے معاملہ میں ہوئی، بجائے اس کے کہ انسان کو فائدہ پہنچاتی، الٹا نقصان پہنچایا۔ آجکل آدمی اس نئی روشنی کی بدولت طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہے۔ اول تو خرچ کی زیادتی، پہلے تھوڑے خرچ میں بہت سا کام نکل جاتا تھا۔ اب کروڑوں روپیہ نمائشی اور فضول روشنی میں برباد ہوتا ہے۔ غریب ہندوستان بھی امیر یورپ کی دیکھا دیکھی ان فضولیات میں مبتلا ہو گیا اور اپنی محنت کی کمائی یورپ کے لیمپوں کی نذر میں مفت گنوا رہا ہے۔

مسلمانوں کے مشہور پیشوا اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ جب وہ رات کو وقت ملک کا کام کرتے کرتے کسی کام کو باہر جاتے تو چراغ گل کر دیا کرتے تھے اور فرماتے کہ میں نہیں چاہتا قوم اور ملک کا تھوڑا سا تیل بھی بیکار جائے اسواسطے چراغ گل کر دیتا ہوں کہ فضول روشن نہ رہے۔ بخلاف اس کے آجکل پبلک کے روپیہ کی جیسی قدر کی جاتی ہے ظاہر ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کی طرف سے شہروں میں روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے مگر اس میں ذرا سی ہمدردی روا نہیں رکھی جاتی۔

لمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے خواہ وہ لوہے کی ہو یا کانچ کی، اس میں تیل بھر دیتے ہیں اور بتی

پنج میں اٹکا دیتے ہیں، پھر اس پر کانچ کی چمنی لگا دی جاتی ہے۔ یہ روشنی کا حجاب ہے۔ اس کے اندر بی بتی نئی روشنی کا تاج سر پر رکھ کر ملک ظلمات فتح کر کے حکومت کرتی ہیں۔

پروانے بیچارے اس روشن تاج کے دیوانے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور کانچ کے سفید پردے سے ٹکرا کر گر پڑتے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں شمع کے رخ پر جو حجاب لٹکایا جاتا تھا وہ دُور سے اور نزدیک سے پردہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر آج کل چونکہ دنیا ہی دھوکہ کی ہے، یہ پردہ بھی دھوکہ کی ٹٹی ثابت ہوتا ہے۔ سنہیے سے پرندہ کو روشنی بے حجاب نظر آتی ہے لیکن جب قریب جاتا ہے تو غریب مایوس ہو کر گر پڑتا ہے اور منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

گورنمنٹ کی مہربانی ہے کہ اس نے رعیت سے ہتھیار لے لئے تاکہ لوگ خودکشی سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح ان دیوانے عاشق مزاج پرندوں کی حفاظت جان بھی سرکار کو منظور تھی۔ اس لئے سفید کانچ کے پہرہ دار کھڑے کر دیئے ہیں۔ اب ان طالبان مرگ کی آرزو کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ مگر کیا تعجب ہے کہ پروانے بھی انسانوں کی طرح حجاب درمیانے کی کوئی نئی صورت نکالیں اور بقا و فنا کی منزلیں آسان ہو جائیں۔

# مٹی کا تیل

از رسالہ زبان ۱۹۰۵ء

خاکساران جہان را بحقارت منگر — تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اللہ میاں نے اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی جو بیکار ہو یا حقیر و ذلیل سمجھی جا سکے۔ چار عنصر آگ، ہوا، پانی، خاک۔ میں سب سے زیادہ بے حقیقت خاک ہے جو تمام مخلوقات کے پاؤں میں روندی جاتی ہے۔ پانی کے زور کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ ہوا کے جھونکے سے اُڑ جاتی ہے اور آگ کی تمازت سے جلا کرتی ہے مگر اُف نہیں کرتی۔ دیکھنے میں اس کی بیچارگی اور ذلت پر ترس آتا ہے لیکن خود اس سے سوال کیا جائے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرے گی۔

کہ میری شان سب سے بڑی اور نرالی بنائی۔ ہر چیز کا خمیر میرے وجود سے تیار کیا۔ خاص کر انسان، جو اشرف المخلوقات ہے، مجھ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھ ہی میں فنا ہو جاتا ہے۔

اس ناچیز خاک کی تہہ میں وہ نایاب خزانے قدرت کے دبے ہوئے ہیں جنکو کام میں لا کر انسان آدمی کہلاتا ہے ورنہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ خیر اور چیزیں تو اپنی جگہ ہیں، مٹی کے بعض ٹکڑوں کی تہہ میں ایک قسم کا چکنا بدبودار پانی ہوتا ہے جس کو لوگ مٹی کا تیل کہتے ہیں۔ مقابلہ کر کے دیکھو تو چنبیلی کا تیل۔ موتیا کا تیل اپنی خوشبو کے سبب اس بدبودار تیل سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت اور نازک دماغ لوگ چنبیلی وغیرہ کے تیل کو سر چڑھائے رکھتے ہیں اور جہاں مٹی کا تیل آیا اور ناک ڈھکی۔ مگر ضرورت کے لحاظ سے یہ گندا سڑا پانی تمام تیلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ آجکل تمام دنیا میں اسی کے دم سے اُجالا ہے اگرچہ گیس اور بجلی کی روشنی نے اب مٹی کے تیل کو بھی مات کرنا شروع کر دیا ہے تاہم اس کا عالمگیر اثر ابھی تک باقی ہے۔ متوسط درجہ اور ادنیٰ درجہ کے آدمی، جو دنیا میں زیادہ تعداد رکھتے ہیں، مٹی کے تیل کے سوا اور کچھ نہیں جلا سکتے۔ یہی تیل روشنی میں لڑکوں کو سبق یاد کراتا ہے، جوانوں کو حسن افروزی کے جلوے دکھاتا ہے اور بوڑھوں کو ٹھوکروں سے بچاتا ہے۔ اسی کی روشنی میں نمازی نمازیں پڑھتے، پجاری پوجا کرتے، وعظ اور کتھا کے جلسے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تیل ہے کہ چور کو چوری میں مدد دیتا ہے اور پولیس کو چور پکڑنے میں لالٹین دکھاتا ہے غم کی رات میں، جدائی کی رات میں جب مونس و غمگسار پاس نہ ہو تو مٹی کا تیل جل جل کر اپنا وجود فنا کر دیتا ہے اور انسان کا شریک غم بن کر باعث تسلی ہوتا ہے۔

امریکہ کا راک فیلر اسی خاک کے نیچے رہنے والے تیل کی بدولت لاتعداد دولت کا مالک ہے۔ یہی تیل دوسرے ملک کے ہاتھ میں رہنے کے باعث ہندوستان کی دولت غیروں کو بانٹ رہا ہے۔ یہی تیل دنیا کی تمام کلوں میں کام آتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بل پر دنیا کی مشہور سواری موٹر کار زمین پر دوڑتی پھرتی ہے۔

اسے خاک نشین تیل! ہم کو تیری یہ ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی اور تو مشتعل ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلۂ زار بنکر مقبول ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے پہاڑوں، دریاؤں میں سرگردان پھرتا ہے مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے۔

تو اتنا بے غرض و بے تعلق کیوں ہے؟ تیری روشنی میں شراب خواری ہو، زنا کاری ہو یا عبادت الٰہی، تجھے روشنی دینے سے کام۔ کیا تو محتسبی نہیں کر سکتا جو لوگوں کو گناہ سے بچائے یا کم سے کم ان کو گناہ کرنے میں مدد نہ دے۔ کیا تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے آتشی طمانچے سے خبردار کر دے۔ بیشک تجھ میں سب طاقتیں خدا نے رکھی ہیں۔ مگر تو اچھی طاقتوں کو کام میں لاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف یا کسی کی دل آزاری نہو البتہ انسان اپنی نیک قوتوں کو بھول جاتا اور بُری طاقتوں کو کام میں لا کر خود تکلیف اٹھاتا اور دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ اگر وہ تیری صلح کل پالیسی پر عمل کرے تو دنیا میں ایسا ہی امن قائم ہو جائے جس طرح لمپ کی روشنی میں سب لوگ خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

# عشقیہ آتشبازی

## پھلجھڑی، انار، مہتابی

یہ شب برات آتشبازی کے دن آگ جلائے گی ہستیاں مٹائیگی۔ فنا کے پھول بہار دکھائیں گے۔ بچے پھلجھڑیوں کے لیئے ضد کرتے ہیں ان کو دلوائی جاتی ہیں۔ آؤ ہم بھی نادان بن کر ان کے نورانی کھلونے مانگیں اور جی بہلائیں۔

پھلجھڑی کیونکر بنتی ہے، کا ہے سے بنتی ہے؟ یہ سب کو معلوم ہے۔ گندک ہوتی ہے تاکہ آگ قبول کرے۔ شورہ ڈالا جاتا ہے تاکہ تیزی اور شورش پیدا ہو۔

کوئلے جن کی ایک ہستی آگ پہلے بگاڑ چکی ہے، پھلجھڑی کا جزو اعظم ہیں۔ اور یہ پھول لوہے کے بُرادے سے بنتے ہیں اور اس لئے اس کی آمیزش بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔

بس یہ پھلجھڑی کی کائنات ہے جس پر کاغذ کا خول چڑھا کر بازاروں میں پھلجھڑی کے نام سے بیچا کرتے ہیں۔ ہم ایسی پھلجھڑی چاہتے ہیں جس میں گندھک نہ ہو تو اس جیسا آگ قبول کرنے والا مادہ ضرور ہو۔ نمکین شورہ نہ ملے تو کوئی دوسری جلی بھنی چیز شامل کرلیں اور وہاں لوہ چون و ذراتِ آہن، جن پر پھولوں کی ہستی کا مدار ہے، ڈھونڈھنا ضروری ہے، تو کیا پھول ایسی سخت دھات کے ذرّوں سے بنتے ہیں۔ نہیں نہیں خاک کے ذرے بھی چمک دمک دکھانے میں کم نہیں۔ وہی ڈال دینا۔

آہا ہا۔ عشق کی دیاسلائی انسانی پھلجھڑی میں لگا دی۔ آنکھوں کی راہ پھلجھڑی کے اندر کا مسالہ جل جل کر نکل رہا ہے۔ آنسوؤں کے پھول جھڑ رہے ہیں۔ کوئی دم کا یہ تماشہ ہے پھلجھڑی جل چکے گی اس کا خول راکھ ہو کر گر پڑیگا۔ اہا ہا کا غل و شور خود بخود بند ہو جائے گا اور جلی ہوئی راکھ اندھیرے میں زمین پر گر کر پامال ہونے لگے گی۔

نہیں جناب ہم ایسی پھلجھڑی نہیں چاہتے جس کے جلنے کے بعد اندھیرا ہو جائے جس کا تماشہ تھوڑی دیر کا ہو جس کی بہار عارضی نظر آئے۔ ہماری ضد پوری کرنی ہے۔ ہمارا دل رکھنا ہے تو ایسی پھلجھڑی منگا کر دو جو ایک دفعہ سلگنے کے بعد پھر کبھی نہ بجھے جس کے پھولوں کا مینھ برستا رہے جس کی بہار کبھی ختم نہ ہو۔ دیکھو ہم کو منگا دو۔

پھلجھڑی نہیں تو کوئی اور آگ کا کھلونا دلا دو۔ کہتے ہیں یہ دن آگ بازی کے ہیں۔ آج کی رات اللہ میاں پہلے آسمان پر آئیں گے۔ اچھا تو ہم ان سے کہیں گے کہ ہم آپ کے بندے ہیں۔ سب کو آگ کے کھلونے مل گئے۔ ہم کو بھی دلوا ئیے۔ دل کے انار میں بارود بھری ہوئی ہے۔ مگر ایسی آگ نہیں ملتی جس سے یہ انار چھوٹ جائے۔ آپ ہی کوئی چنگاری دے دیجیے تاکہ انارِ قلب کی چند لمحہ بہار دیکھ لیں۔ مہتابی بھی خوب ہوتی ہے۔ روشن اور منوّر

ظلمت کو کافور کرنے والی، آسمانی ماہتاب کی ماجائی. مگر اس میں بھی وہی عیب ہے .جل کر خاموش ہو جاتی ہے .مہتابی وہ اچھی جو ہمیشہ چمکتی رہے .ہر وقت نورافشانی کرے .ظلمت کو فتح کر کے کبھی مفتوح نہ ہو .بھلا وہ گوراکس کام کا جو کالے کو فتح کر کے پھر اس کا مفتوح ہو جائے ہمارا نسخہ بن گیا تو دکھا دیں گے کہ جس وقت مہتابی روشن ہوئی تو پھر کبھی نہ بجھے گی .یہاں بھی نور، وہاں بھی نور، ادھر بھی نور، اُدھر بھی نور، جہاں سنو یہی آواز آئے گی ۔

خیر اگر ابکی شب برات میں یہ عاشقانہ آتشبازی میسر نہ آئی تو آیندہ کی امید رکھنی چاہیئے .کہتے نہیں دُنیا بامید قائم ۔

# دیاسلائی

ازرسالہ زبان ۱۹۰۹ء

آپ کون؟ ناچیز تنکہ .اسم شریف؟ دیا سلائی کہتے ہیں. دولت خانہ؟ جناب دولت خانہ کہئے اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا مگر چند روز سے آحمد آباد میں بستی بسائی ہے اور سچ پوچھیئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے، میرا موجودہ ٹھکانہ ہے.

یہ آحمد آباد ناروے یا سویڈن کے پاس کوئی نیا مقام ہے؟ کیونکہ آپ کی بستیاں تو انھی علاقوں میں سجی جاتی ہیں.

نہیں جناب آحمد آباد ہندوستان میں ہے. آپ دیکھتے نہیں میری رنگت کالی ہے. یہ اسی ملک کی نشانی ہے. ورنہ ناروے سویڈن کی دیا سلائی گوری چٹی ہوتی ہے مجھ غریب کو اس سے کیا نسبت؟

آہا. تو آپ ہمارے ملک کی دیا سلائی ہیں تب تو گو آپ کا رنگ سانولا ہے مگر ہماری نگاہ میں سب دیاسلائیوں کی رانی ہو. ذرا مہربانی کر کے مجھ کو "رانی" نہ فرمائیے بیگم کہیئے

میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے۔ منشی فتح خاں نے مجھے بنایا ہے۔

بہت اچھا میاں تنکہ ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر تم کو بھی یہ دن لگے کہ "رانی" اور "بیگم" میں تمیز کرتے ہو۔ "کے آدمی کے پیر شدی"۔ وہ وقت بھول گئے کہ زنجیروں میں باندھ کر مشین کے آرہ کے نیچے رکھے جاتے تھے اور آرا آن کی آن میں تمہارے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ اس کے بعد جیسی گت بنتی تھی تم خود خیال کر کے گریبان میں منہ ڈال سکتے ہو۔ تمہارے تراشیدہ کندوں کا ظلماتی گرم چشمہ میں ڈالا جانا اور اس کھولتے ہوئے پانی میں تمہارا تلملانا، کبھی سطح آب پر آنا کبھی پھر تہہ میں چلا جانا یہاں تک کہ اسی دار و گیر اور پیچ و تاب میں تمہاری کھال تک اتر جاتی تھی۔ اس وقت کچھ دیر کے لئے باہر نکال کر تم کو دم دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر مشین میں کس دیا جاتا تھا اور مشین چھیل چھیل کے تمہارے لمبے لمبے پرت بنا دیتی تھی، اور پھر وہ پرت دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح اس حمام میں تم جیسی ہزاروں ہستیاں عالم وجود میں آجاتی تھیں۔ زرد گندھک اور سرخ مصالحہ کا لباس بھی کچھ عزت سے نہیں پہنایا جاتا تھا بلکہ سرنگوں کر کے گرم گرم گندھک اور مصالحہ میں تمہاری ناک ڈبو دی جاتی تھی۔ اس پر یہ مزاج کہ بیگم کہلانے کی آرزو۔ کھچی کی ڈبیا میں رہتے رہتے یہ دماغ ہو گیا۔ ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے منڈیا رگڑ کر پھینکدیگا۔ پھر جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا۔

حضرت! آپ کو تو غصہ آگیا خفگی کی کیا بات ہے۔ جو چیز جہاں ہو اسی سے منسوب ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں۔ اگر "رانی" کے مقابلہ میں "بیگم" کے لفظ کو پسند کروں تو کیا گناہ ہے۔ یہ سب نام کی بحث ہے، کام دیکھنا چاہیئے۔ سو جیسا مسلمانوں کا کام کرتی ہوں، بے کم و کاست ہندوؤں کا بھی بجا لاتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرے مشرب میں دیسی بدیسی، گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتی ہوں، اور ایک غریب کے

جھونپڑے میں بھی میرے سبب اجالا ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بے حقیقت ہوں اور بے بسی کے عالم میں انسانی کلوں سے عرصہ تک بیکل رہی ہوں تو یہ کچھ مجھی پر منحصر نہیں ہے۔ آپ پر بھی یہ بپتا پڑ چکی ہے بلکہ آپ کی مجھ سے زیادہ درگت ہوئی ہے۔ کیا یاد نہیں کہ پریم کی آری نے شجر راز سے کاٹا اور نو مہینے شکم مادر کے چشمہ میں آپ بھی جوش کھاتے بہے اور پھر برسوں پرت در پرت کے چکر میں گردش رہی۔ میرے "رانی" اور "بیگم" کے لفظ سے اتنے چونکے ذرا اپنی ہٹ دھرمی کو دیکھئے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ جو کالا کرتا ہے وہ گورا کرنا نہیں چاہتا۔ جو مسلمان کو پسند ہے اس سے ہندو کو نفرت ہے۔ اور غریب و کمزور ہونا تو گویا دائرہ آدمیت سے خارج ہو جاتا ہے اس کو دنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق ہی باقی نہیں رہتا۔

بس بس۔ خاموش رہو بی فتنی۔ ہو تو اتنی ذرا سی مگر زبان بارہ ہاتھ کی ہے۔ لگیں حد سے گزرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زاد کی کیا عالی شان ہے۔

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سنا ہو گا کہ خدا نے آدمی کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تمام اسرار کا علم اس کو بخشا ہے۔ بس یہ جو کچھ کرتا ہے عین منشائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اس کو معلوم ہے۔

اوہو! آپ کو یہ غرہ بھی ہے۔ بیشک آپ خلیفۂ خدا ہیں مگر سب چیزوں کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں تو یہ آیا ہے کہ آدمی کو سب چیزوں کے نام بتائے گئے تھے۔ یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی گئی تھی۔ اگر اصلیت اور حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ کہ بجلی کیا چیز ہے؟ وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے اور اس کی تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے۔ مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور چند حرکتوں سے کیونکر ظاہر ہو جاتی ہے۔

خیر بجلی تو بڑی چیز ہے، تنکہ کے اسرار سے بھی آپ ناواقف ہیں کہ ذرا سی رگڑ میں

یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے. محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے۔ پانی اور روشنی عام ہے جنگل اور دریا عام ہیں۔ مگر آپ کی ذاتِ شریف ان سب چیزوں کو اپنے لئے مخصوص کرلینا چاہتی ہے۔ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی۔ پانی۔ ہوا سب میرے قبضہ میں ہوں جس کو چاہوں دوں جس کو چاہوں محروم کردوں۔ ایک آدمی کروروں روپے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مرجاتے ہیں مگر وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا۔ اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں۔ نام اور نشان کے شوق میں لاکھوں ہمجنسوں کو فنا کرڈالتا ہے تو کیا خدائی خلافت کا انہی اعمال سے دعوے کیا جاتا ہے اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں؟ حضرت آپ ہزاروں لاکھوں سجدے کرتے ہیں، مگر آپ کا سرکش وجود ویسا کا ویسا ہی باقی موجود رہتا ہے۔ مجھ کو دیکھیے کہ ایک ہی سجدہ میں مقبول ہوجاتی ہوں اور تجلی اس چھوٹی سی شکل کو جلاکر خاک کردیتی ہے۔

خدا تمہاری طرار زبان کو چلاتا رکھے۔ میں ہارا تم جیتیں۔ اچھا تو لاؤ اندھیرا زیادہ ہوگیا۔ میرے کلبۂ تاریک کو تجلی راز سے روشن کردو۔

# کھٹکا

از رسالہ صوفی ۱۹۰۹ء

لوگ کہتے ہیں کہ زندگی وہ اچھی جس میں کسی بات کا کھٹکا نہ ہو بلکہ ایسی زندگی کو بہشت سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ کیونکہ بہشت میں فکر و تردد کا کھٹکا نہ ہوگا مثل ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد  کسے را با کسے کارے نباشد

ہر شخص کا اپنے کام میں مست و سرشار رہنا اور کسی سے کچھ علاقہ نہ رکھنا بہشتی زندگی ہے۔ مگر اس جہان کو اختلاف سے زیبائش ہے ایسے آدمی بھی اس دنیا کے پردہ

پر رہتے ہیں جو بے کھٹکہ رہنا عیش سمجھتے ہیں اور ایسا گروہ بھی یہاں موجود ہے جو

## کھٹکہ دار گزران

کا شیدائی ہے اس کو جینا مرنا۔ چلنا پھرنا۔ ہنسنا بولنا، کھانا پینا۔ الغرض کوئی بات ہو کھٹکہ کے بغیر بے مزہ اور پھیکی معلوم ہوتی ہے اور انصاف یہ ہے کہ کھٹکہ پسند جماعت حق بجانب ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کارخانہ کھٹکہ پر چل رہا ہے۔ موجودات محسوسات ذرا اور آگے بڑھکر حیوانات وغیرہ کی تمام نوعیں کھٹکہ سے ظاہر ہوتیں، کھٹکہ سے قائم رہتیں اور کھٹکہ ہی سے فنا ہو جاتی ہیں حیوانات میں انسان کو دیکھیئے کھٹکہ اس پر بھی محیط ہے ہر سانس میں کھٹکہ کا سلسلہ موجود ہے۔

## کھٹکہ کی خارجی مثالیں

کسی بڑے تارگھر میں چلے جایئے۔ ہزاروں کھٹکے سُنائی دینگے۔ انسانی انگلیاں حرکت کر رہی ہوں گی اور کھٹکہ کی گونج ان سے نکل رہی ہوگی۔ آواز سب کی ایک، انگلیوں کی حرکت بھی یکساں لیکن کاغذی نقوش کو ملاحظہ کیجئے۔ یہاں آکر یہ کھٹکہ رنگ برنگ کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں لکھا ہے زید کو لاکھ روپے کا فائدہ ہوا، کسی میں درج ہے عمر دہلاک ہوگیا۔ الغرض ایک کھٹکہ سے کے مختلف ظہور اور نتیجے کاغذ پر ہویدا ہوتے ہیں جن لوگوں کو اس

## برقی کھٹکہ کا عرفان

ہے وہ تو صرف آواز سن کر ٹنک ٹک وبد کا فرق محسوس کر لیتے ہیں مگر ناواقف حیران ہوتے ہیں اور بعض اوقات شک وشبہ کرتے ہیں کہ ایک ہی کھٹکہ سے مختلف خبریں کیونکر

بن گئیں جو کھٹ کھٹ خوشی کے تار میں سُنائی دی تھی وہی غم کی اطلاع میں سُنی گئی۔ اتنا بیّن فرق کس طرح ہو گیا حقیقت آشنا تار بابو ان نادان لوگوں کے شک و شبہ کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

اسی تار کے کھٹکہ میں وحدت و کثرت کا سبق موجود ہے جس میں آج کل کے بعض کم فہم انسان اُلجھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ واحد کثرت میں ظاہر ہو کر واحد کیونکر رہ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ اگر ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ دہلی سے کلکتہ تک دو سو تار گھر ہیں۔ ایک بابو دہلی میں بیٹھ کر کلکتہ کو تار دیتا ہے۔ بس جس وقت اس کی انگلی حرکت کرتی اور ایک کھٹکہ پیدا کرتی ہے تو کلکتہ تک ہر تار گھر میں وہ کھٹکہ پیدا ہو جاتا ہے وہی کھٹکہ دہلی میں، وہی کلکتہ اور وہی درمیانی تار گھروں میں کسی کھٹکہ میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کھٹکہ سے دو سو کھٹکے پیدا ہو گئے مگر حقیقت میں وجود ایک ہی ہے۔ احمق سے احمق آدمی بھی جس کو تار کے معاملہ سے تھوڑی سی آگاہی ہے نہیں کہہ سکتا کہ کھٹکہ تقسیم ہو گیا اور اس کی وحدت میں کچھ فرق آگیا۔ پھر ذاتِ واحد کے کثرتی ظہور سے اس کی وحدت میں کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

## گھڑی کا کھٹکہ

یہ سامنے والی دیوار کے سہارے دم لینے والی گھڑی بھی دیکھی۔ سانس کا کھٹکہ چل رہا ہے اور سوئی کی گردش وقت کاٹ رہی ہے، ہر کھٹکا فنر کی پیچیدہ طاقت کا ایک حصہ کم کر دیتا ہے یہاں تک کہ ایک دن یہی ننھا منّا کھٹکہ گھڑی کی سب طاقت ختم کر کے اس کو خاموش کر دے گا۔

رات کے اندھیرے میں جب کوئی مونس و غمخوار پاس نہ ہو۔ کھٹکہ دار گھڑی

کو پاس رکھ لیجئے۔ دیکھیئے یہ کھٹکہ کیا لطف دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ گھڑی کی زندگی بھی کھٹکہ سے معلوم ہوتی ہے اور موت کا باعث بھی یہی کھٹکہ ہوتا ہے۔ انسان کو گھڑی سے تشبیہ دی جائے تو مشابہت بہت ہی ٹھیک اور موزوں ہوگی۔ گھڑی کی بناوٹ اور کل پرزے سب انسانی اعضاء کی ساخت سے نکلے ہیں۔ پھر بھلا عقل تو کھٹکہ سے بچئے، کھٹکہ سے مرے اور اس کے کھٹکہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اور اصل یعنی انسان کھٹکہ سے محروم سمجھا جائے اور بے کھٹکہ زندگی کو بہشتی کہا جائے، یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔

## گراموفون کا کھٹکہ

غیبی آواز سے خود بخود بولنے والا باجہ گراموفون، جو نئے زمانہ کی لاثانی اور عجیب ایجاد تصور کیا جاتا ہے، نوک دار کھٹکہ سے بولتا ہے۔ ایک سوئی کی نوک ریکارڈ کی چکرانے والی تختی پر کھٹکہ دار ضربیں لگاتی ہے اور موی پیکر کی مخفی آواز کو عیاں کر دیتی ہے۔ پھر دیکھیئے کہ کیا کیا عجیب و غریب صدائیں نکلتی ہیں۔ آجکل کے خوش باش انسان گراموفون کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ مگر ان میں کسی کو اس کھٹکہ پر توجہ نہیں ہوتی جس کے طفیل باجے کا کاروبار چلتا ہے۔ حالانکہ ہر بار سوئی انسان خود ہی بدلتا ہے۔ اگر وہ ادھر توجہ کرے تو اپنے وجود کے کھٹکہ کا حال بھی ایک دن معلوم کر لے۔

## انسانی کھٹکہ

ان خارجی مثالوں کے بعد خود انسان کے اندرونی کھٹکہ کو دیکھنا چاہیئے کہ یہ ناوان بے کھٹکہ زندگی پر مرا جاتا ہے حالانکہ زندگی بغیر کھٹکہ کے بالکل نکمی

اور بیکاو ہے۔ آدمی کے تمام دینی و دنیاوی افعال کسی سبب سے ہوتے ہیں نوکری کرتا ہے تاکہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے۔ اسی طرح دنیا کے سب دھندے کسی سبب کے ماتحت ہیں، تو یہ سبب اس شخص کے لئے ایک کھٹکا ہے۔ بظاہر تو یہ کھٹکا اس کو ناگوار معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ کھٹکا نہ ہو تو جاہل آدم زاد ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور کچھ کام نہ کرے۔

دینی امور کا بھی یہی حال ہے۔ دوزخ کے خوف، بہشت کے لالچ، خدا کی رضامندی کی طمع، غرض اس کے اعمال کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے یہی اس کے لئے کھٹکا ہے جس کے بغیر یہ سب اعمال، جن سے انسان کی روحانی زندگی وابستہ ہے، چل نہیں سکتی۔

## کھٹکہ کے باطنی اسرار

جو اسرار کھٹکہ کے وجود میں پائے جاتے ہیں، ان تک رسائی ممکن ہے مگر ان کا بیان کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر کیفیت اور حال سے ہے جو قال اور الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ اس لئے ہم باطنی کھٹکہ کا صرف ایک حصہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

## زندگی کا مسلسل لطف

آدمی جگہ جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے اور اپنے اندر کی طلسماتی زنجیر کو حاصل نہیں کرتا۔ جس میں اس کو ساری دنیا کی مزیدار کیفیتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہر سانس جو جسم کے اندر جاتا اور باہر آتا ہے، اگر اس کی قدر کی جائے تو لازوال نعمت ہے بشرطیکہ اس میں لوچ دار کھٹکا بھی پیدا ہو جائے۔

جوگی حبس دم وغیرہ طریقوں سے اس سانس کو اپنے قابو کا بنا لیتے ہیں اور پھر ساری خلقت سے بے پرواہ ہو کر جنگل میں منگل کرتے ہیں اور آنند کے تار بجاتے ہیں۔ مسلمان درویش باوجود فقر و فاقہ کے مست و سرشار رہتے ہیں محض اس سانس کی بدولت جس میں ذکر الٰہی لہرایا کرتا ہے اور ان کو ہر وقت سرور رکھتا ہے کیونکہ وہ اپنے سانس میں ذکر الٰہی کا کھٹکا سنتے رہتے ہیں۔

پوچھا جائے گا کہ کس طریق سے سانس میں لوچ پیدا ہوتا ہے اور کیونکر یہ مزیدار کھٹکا حاصل ہو سکتا ہے؟ مگر یہ سوال بھی ایسا ہی ہے جیسے باطنی کھٹکہ سے بے خبری۔ اخباروں کے مضمون میں یہ باتیں لکھنی دشوار ہیں مختصر یہ ہے کہ ذکر جہر اور ذکر خفی جس کو پاس انفاس بھی کہتے ہیں، سانس میں پرلطف کھٹکا پیدا کر دیتا ہے اور پھر انسان مسلسل لطف کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

جس وقت یہ کھٹکا انسان کے دم سے وابستہ ہو جاتا ہے پھر زندگی بے کھٹکہ گزرنے لگتی ہے جس کی اکثر لوگوں کو خواہش ہے۔

# خدائی گراموفون

از رسالہ صوفی ۱۹۰۹ء

مسٹر ایڈیسن کو دعوےٰ ہے کہ اس نے گراموفون ایجاد کر کے ثابت کر دیا کہ انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ بیجان کا بولنا ایک زمانہ میں معجزہ اور دوسرے عہد میں کرامت شمار ہوتا تھا۔ آج ایڈیسن معجزہ و کرامت کا انکار کر کے یہ عجیب چیز پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض عقل انسانی کا ظہور ہے۔ کسی غیبی طاقت کو اس میں دخل نہیں۔" کیونکہ عقل و سائنس غیبی چیزیں نہیں ہیں

ہم ایڈیسن سے دریافت کرتے ہیں کہ عقل انسان کہاں سے آئی جس نے

یہ کرشمہ ظاہر کیا۔ اس کا دارومدار بھی ایک پراسرار طاقت پر ہے۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ جس کرشمہ کا نام ایک وقت میں معجزہ، دوسرے وقت میں کرامت تھا۔ آج کل کے زمانہ میں اس کا نام ظہور عقل یا سائنس کا تماشا ہے۔ تینوں ناموں کے باطنی معانی میں کچھ فرق نہیں۔

اصل میں خود انسان حضرت ایزد کا گراموفون باجہ ہے۔ جب اس سراپا عقل و سائنس خدا کو منظور ہوا کہ آواز ہو اپنے کان سے سُنے۔ اس نے خاکی ریکارڈ بنائے اور ان میں اپنے دیکھنے دکھانے اور سننے سُنانے کی صدا ابھر دی اور پھر اس کو ایڈیسن کے مومی ریکارڈ کی طرح ایک گردش میں مبتلا کر دیا۔

بعض ریکارڈ ہیں جن میں سنسکرت زبان سے روحِ الٰہی ظاہر ہوتی ہے اور وید کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ بعض ہیں جو عبرانی و عربی کے ذریعہ سے انجیل و توریت، قرآن کہلاتے ہیں۔ غرض خیر و شر، خشک و تر، مہذب و غیر مہذب، سب کچھ ان ریکارڈوں میں موجود ہے خود میاں ایڈیسن بھی خدائی باجہ کے ایک ریکارڈ ہیں۔ ذرا غور کریں تو ان کو بھید مل جائے گا۔

## مچھر

از رسالہ صوفی سنہ ۱۹۱۰ء

یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلہ کے لئے مہمیں تیار ہوتی ہیں، جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مصالحے بھی بناتا ہے کہ ان کی بُو سے مچھر بھاگ جائیں لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بیچارا آدمزاد حیران رہ جاتا ہے۔ اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

امیر۔ غریب۔ ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ بچے۔ بوڑھے، عورت۔ مرد۔ کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی ان کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مچھر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسّو کے ذریعہ سے پھیلتا ہے، ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہولناک وبا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اُس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو، مچھروں کو کچل ڈالو، مچھروں کو تہس نہس کر دو۔ اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے "پانیر" کو آکر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اُس خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے قاعدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے۔ کرکٹ میل کچیل سے پیدا ہوتا اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے، اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سوجاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا۔ بے خبر کے چرکے لگانا مردانگی نہیں انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں بے ڈول چہرہ۔ اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے۔ خوش وضع۔ پیاری ادا کی دشمنی، بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجئے۔ ذات صفات نہ دیکھئے۔ میں کالا سہی، بد رونق سہی، پنچ ذات اور کمینہ سہی۔ مگر یہ تو کہیئے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیونکر آپ کا ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر نا انصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر "الٹی میٹم" دیدیتا ہوں کہ ہوشیار ہوجاؤ اب حملہ ہوتا ہے، تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کردے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں والا بے ڈول فتحیاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردہ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے جو خدائی کا دعوے کرتا تھا اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا۔ کون اس پر غالب آیا، کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی، اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجئے یا مجھسے سُنیئے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کئے لیتے ہو۔ میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو۔ دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالم ذوق میں اپنے ایک مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے، باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیئے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کرے اور حمد و شکر کے گیت گائے۔ اس لئے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے اٹھو میاں اٹھو جاگو جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئیگا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقعہ ہے۔ مگر انسان اس طرح نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر غصہ میں آجاتا ہے اور اسکے چہرہ اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پر واہ رے انسان آنکھیں بند کئے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارہ مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جناب عالی! کَے سکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سن کر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں دل ہی میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے

دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹنا تھوڑی ہے، قدم چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں لیکن حاصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دُور نہیں ہوتی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

سو اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کرلیں جیسا کہ صوفی صاحب نے کیا تو یقین ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے۔ لطف سے جینے نہ دوں گا اور بتا دوں گا کہ کمین اور نیچ ذات اعلیٰ ذات والوں کو یوں پریشان اور بے چین کرسکتی ہے۔

# لا

(از رسالہ نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء)

انگریزی زبان میں اس سرمایہ لفظ کے معنی قانون اور ضابطے کے ہیں۔ عرب والے انکار اور نفی کے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اہلِ اُردو تحکمانہ طلب کے موقعہ پر لا بولتے ہیں۔ مگر لام الف دو حرفی لفظ کی اصلی شان پر بہت کم لوگوں کو توجہ ہوتی ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ آج دو چار ساعت اس کی حقیقت پر غور کریں۔

اول تو ذرا اس لفظ کی ظاہری صورت پر نظر ڈالئے کیسا مغرور اور متکبر وجود ہے۔ شاعرانہ مدح سرائی کرنی ہو تو سرو بالا قد کہہ کر جی خوش کر لیجیے مگر حضرت لا میں سرو کی سی لچک کہاں۔ سرو گو خود سر درخت ہے تاہم ہوا کے جھونکوں سے اس کے ننھے ننھے پتے جنبش میں آجایا کرتے ہیں۔ برخلاف لا کے کہ کسی ہوا کے جھونکے سے نہیں ہلتا اور مضبوطی سے بے حس و حرکت قدم جمائے کھڑا رہتا ہے۔ لا نہیں جانتا کہ اس کے پیروں میں کون پڑا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا سر نخوت سے اونچا رکھتا ہے۔

انگریزی زبان میں جس کام کے لئے یہ مستعمل ہے اس کی ضد اور ہٹ کو کون نہیں جانتا
سارا زمانہ ایک منہ ہو کر چیخے چلائے مگر میاں لا کے حکم کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔
جو لوگ جناب لا کے حقائق و معارف سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں وہ اول تو برسوں اسکول
و کالج کی خانقاہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر لا کے ذکر اذکار میں مشغول رہتے ہیں۔ اسکے
بعد لندن کی سب سے بڑی خانقاہ میں جا کر وہاں کے حلقہ ذکر میں تین سال گذارتے
ہیں جب کہیں جا کر ان کو خرقہ لا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ یہ خرقہ اور سند خلافت لیکر اپنے
ملک میں آتے ہیں اور آبادی سے الگ ایک خلوت خانہ لیکر رہتے ہیں۔

اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ نہ پوچھیے ورنہ مسٹر لا، کا نیا تازیانہ سامنے آجائیگا۔
اگر آپ اس کوڑے سے نہیں ڈرتے اور آزادانہ تحقیقات چاہتے ہیں تو سن لیجئے کہ
خرقہ پوشان لا، اپنے خلوت خانوں میں ہزاروں مکرو فریب کی کمندیں بچھاتے ہیں اور انجان
بھولی بھالی چڑیوں کو جال میں پھانستے ہیں۔ لا کی قینچی سے جیبیں کترتے ہیں۔ لا کے استرے
سے سر مونڈتے ہیں اور ممکن ہوتا ہے تو لا کے پستول کی گولی سے بے زبان جانور کو شہید کر ڈالتے ہیں
لا کے سیاہ خرقہ والے بزرگ کے کمالات اور کرامتیں اس قدر زبردست اور مستند ہیں
کہ کوئی دہریہ اور ملحد ان کے انکار کی مجال نہیں رکھتا سب مانتے ہیں کہ لا کے تصرفات
باطنی بالکل سچے اور یقینی ہیں۔ لا دن کو رات اور رات کو دن بنا سکتا ہے۔ لا ظالم کو مظلوم اور
مظلوم کو ظالم ثابت کر سکتا ہے۔ لا کے ایک ادنیٰ اشارہ چشم میں بیگناہ پھانسی پر
چڑھ جاتے ہیں اور لا ہی اگر چاہے تو اصلی مجرم کو دار سے اتر والے۔

غریب کا "لا" صور اسرافیل ہے۔ انگریزی لا کی اس کے سامنے کچھ قیمت نہیں
ایک ہی ضرب میں حکومت کا لا کو نیست و نابود کر سکتا ہے حکومت کے لا کی بساط ہی کیا ہے
جو عربی لا کے سامنے آسکے عربی لا تو وہ بلا ہے جو خداؤں پر چوٹ کرتا ہے اور ہمیشہ کامیاب
رہتا ہے کس کی طاقت ہے جو عربی کے لا کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ خدا و ذات خداوندمنات

خدا وند عزیٰ تینوں ایکدفعہ ملکر جا رز کے میدان میں اس بہادر لا کے سامنے آ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی خدائی کو اس کانٹے سے صاف کر دیں۔ مگر جونہی لا نے اپنی گرج دار آواز نکالی تینوں خدا سر کے بل اوندھے زمین پر گر پڑے۔

کہتے ہیں عرب کے اس لا میں یہ طاقت غیبی خزانہ سے آگئی ہے اور یہ وہ خزانہ ہے جو کنج وحدت میں مخفی ہے۔ اس خزانہ میں لازوال اور بیشمار دولت ہے جو الف کی تھیلیوں میں رہتی ہے۔ جب اس کنز مخفی کو لام سفرد میں زور پیدا کرنا منظور ہوا تو اس نے اپنے خزانہ کا ایک الف اس کے آخر میں لگا دیا۔ یہ اسی کی قوت ہے جس کے بل پر عرب کا لا دنیا کا بے مثل شہ زور مانا جاتا ہے عرب کے لا کو کنز مخفی کا حکم ہے کہ ہر وجود کو نابود کر دے۔ چنانچہ جب یہ حکم بجا تا ہے تو صلۂ خوشنودی میں اس لا کو دوسرا الف عطا ہوتا ہے جو لا کے اول میں چسپاں کر دیا جاتا ہے اور یہ لا سے اِلّا بن جاتا ہے۔ اور جونہی اِلّا بنا اس کے سامنے سے تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں اور کنز مخفی اس کے ذاتی ظہور کے لفظ اللہ میں وصلت کا شرف عطا فرماتا ہے اور لوگ الا اللہ کے نعروں سے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔

آپ نے سنا ہے عرب کے لا کا فسانہ۔ عرب کے کلمہ گو اور دنیا کے وہ سب آدمی جو ان کی ہمنوائی پر ایمان رکھتے ہیں، اس لا کا ورد یوں کرتے ہیں لا الٰہ الا اللہ۔ گویا ہر شخص لا کی ضرب سے سب خداؤں کی نفی کر کے ایک خدا کا وجود قائم کرتا ہے اور فنا کے بعد بقا کا تماشہ دیکھتا ہے۔

اردو کا "لا" سوائے گداگرانہ طلب کی شان کے اور کوئی شان نہیں رکھتا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ بس ان میاں کی تو اتنی ہستی ہے کہ ذرا کڑک کے بولے کہ ہم کو بھی لا کی بخشش میں لا دے آئے۔ مگر لانے کا نتیجہ کچھ نہ نکلا بس ظاہر ہوا کہ درمیانی لا خوب تھا۔ ہم کو بہت پسند آیا۔ اب خدا کرے جس دن ہم سب کے جسم سے جان نکلے تو لا الٰہ الا اللہ سانس

کے جھولے میں جھول رہا ہو کبھی جھونٹا لیکر زبان پر آئے اور کبھی دل میں جائے اور چاروں طرف وحدت کے ترانوں کا شور ہو۔ آمین۔

# مکھی

از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۱ء

دیکھنے میں بھنبھناتا ہوا ذرا سا پرندہ ہے بلکہ پرندہ کا لفظ بھی اس ننھی سی ہستی پر زیبا نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ناچیز و غلیظ و مکروہ بھنگا ہے مگر نظر تعمق سے دیکھو تو عرفان قدرت کا پر اسرار نوشتہ ہے۔

مکھیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم شہد کی مکھیوں کی ہے دوسری قسم وہ مکھیاں ہیں جو انسان کے ساتھ بود و باش رکھتی ہیں۔ تیسری قسم کی مکھیاں قبروں۔ قتل گاہوں ذبح خانوں وغیرہ مقامات میں رہتی ہیں۔

قسم اول شہد کی مکھی آدمی کو طریق تمدن سکھانے والی اور بڑی عقلمند ہے۔ قرآن شریف میں ایک سورت اس کے نام سے منسوب ہے۔ اس مکھی کے ضابطے اور قانون انسان کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے، قدامت کے اصول سے منحرف ہوتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تمام دنیا میں شخصی حکومت کا دور دورہ تھا یا اب یہ وقت ہے کہ خود مختاری اور مساوات کی روح ہر شخص میں سرایت کر گئی ہے جس کو دیکھئے "ہمچو من دیگرے نیست" کا راگ گاتا ہے۔ یورپ میں ان خیالات کا بڑا زور ہے وہاں کے باشندے آزادی کی ترنگ میں کسی کی برتری گوارا نہیں کرتے۔ اکثر مقامات میں جہاں بادشاہ کوئی چیز نہیں ہر فرد بشر اپنا آپ حاکم ہے، اور اگر کہیں بادشاہ موجود ہے تو اس کا کچھ اختیار نہیں۔ شطرنج کے مہرے کی مثل نام کو بادشاہ ہے۔

اگرچہ اہل یورپ نے عملاً اس کو ثابت کر کے دکھا دیا کہ فردِ واحد کی حکومت سے زیادہ مفید پنچائتی حکومت ہے لیکن یہ علاوہ آمد ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہ سکتا کیونکہ اصول اسی وقت تک کارگر ہے جب تک خلقت میں علم کا شوق عام ہے، اور لوگوں میں اپنے فرض کا احساس باقی ہے جس دن علمی چرچا کم ہوا اور تعیش و آرام طلبی نے جہالت کا بازار گرم کیا اسی روز دیکھ لینا کہ جمہوریت کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور پھر وہ لوگ، جن کے دماغ اور قویٰ قدرتاً شاہی و افسری کے قابل ہیں، خودمختار بادشاہ بن جائینگے۔

شہد کی مکھی ابتدا سے خودمختار بادشاہ کے ماتحت ہے۔ آدمی کی طرح رنگ نہیں بدلتی۔ ان مکھیوں کے ہر چھتے میں ایک حکمراں ملکہ ہوتی ہے جس کے حکم پر ہزاروں مکھیاں گردش کرتی ہیں۔ مکھی ملکہ کا فرمان اشاروں ہی اشاروں میں پورا ہو جاتا ہے۔ اسکو نہ گزٹ میں اعلان کرنے کی ضرورت ہے نہ وائسرائے اور ڈپٹی کمشنر کی معرفت کی تلاش۔ جب ذرا پروں کو حرکت دی اور آنکھوں کو سامنے کر کے بھنبھنائی، فوراً سب رعایا تعمیل کیلئے کھڑی ہوگئی۔ مکھی ملکہ کی خوش نصیبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے ملک میں نہ کوئی باغی ہے نہ انارکیسٹ شورش کنندہ۔ مکھیوں کی شہزادی بڑی کم خوراک ہے۔ رعایا جس قدر شہد جمع کرتی ہے، یہ اس میں سے صرف اپنے اور اپنے بچوں کی خوراک لے لیتی ہے۔ باقی رعایا کا حصہ رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی رعایا ایسی اطاعت گذار ہے کہ ملکہ خواہش کرے تو سارا شہد اس کے حوالے کر دے یا کم سے کم جو زائد ٹیکس ان پر لگایا جائے اس کو خوشی خوشی برداشت کرے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ملکہ رعیت کے حصے پر بری نگاہ نہیں ڈالتی اور قناعت سے اپنے حصہ پر زندگی بسر کر لیتی ہے۔

ذرا سننا پھولوں کی ڈالیوں سے کیسی گونج کی آواز آ رہی ہے۔ یہاں تو سوائے مکھیوں کے اور چیز نظر نہیں آتی۔ آہا سمجھ میں آگیا۔ گونج انہی مکھیوں کے پروں کی ہے۔ مگر نہیں بہت سی مکھیاں پھولوں پر بیٹھی رس چوس رہی ہیں۔ پروں میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہے۔ اسپر

بھی ان میں سے ایک آواز آتی ہے، یہ کس چیز کی صدا ہے؟ آپ کو خبر نہیں۔ یہ مکھی کا ترانہ حمد و شکر ہے۔ رزق کھاتی جاتی ہے اور رازق کا شکرانہ ادا کرتی جاتی ہے۔ اسی پر بس نہیں سال کے چھتے میں جا کر دیکھ لینا صبح وشام ایک خاص آواز سنائی دیگی وہ بھی انکی حمد و ثنا ہوتی ہے۔

## گھریلو مکھی

اب قسم دوم گھریلو مکھی کو لیجئے جس کو آپ کی اصطلاح میں مگس بے حیا کہتے ہیں۔ کیسی ملنسار اور محبت کرنیوالی چیز ہے۔ آپ دھکے دیتے ہیں، دھتکارتے ہیں اور وہ دامن نہیں چھوڑتی۔ چہرہ سے اڑایا تو وہ ہاتھ پر آ بیٹھی۔ وہاں سے جھٹکا تو قدموں میں آن گری۔ بہت ہوا تو طواف کرنے لگی اور دو چار چکر لگا کر پھر پہلو میں آ گئی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کے ایک پر میں زہر ہے اور دوسرے میں تریاق کھانے میں گرتی ہے تو پہلے زہردار پر ڈالتی ہے اس لئے حکم ہے کہ اسکو غوطہ دیکر پھینکا کرو تاکہ تریاق کا اثر زہر کو معتدل کردے۔ کون مسلمان ہے جو اس حدیث کے سننے کے بعد بے چاری مکھی پر آنکھیں نہ نکالے گا۔ مگر اس میں اس غریب کا قصور نہیں۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ ایک پر میں زہر رکھا گیا ہے اور دوسرے میں تریاق۔ جب وہ گرتی ہے تو اپنے اختیار سے نہیں گرتی، بے قابو ہو کر غوطہ کھاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ محض قدرتی حکمت کا تقاضا ہے کہ زہردار پر کے رخ پر گرائی جائے۔

## ہندو مذہب سے مکھی کی عداوت

ایک ہندو فقیر نے، جو چھوت چھات کی قید سے آزاد تھا، بڑی دلچسپ بات کہی کہ میاں ہندو مذہب والے خواہ مخواہ چھوت چھات کا غل مچاتے ہیں اور اپنے ہمسایہ

مسلمان بھائیوں سے الگ تھلگ رہ کران کے دلوں کو مکدر کرتے ہیں۔ پہلے کمبخت مکھی کا
توکچھ تدارک کریں جس نے چھوت چھات کے تمام اصول میں گڑبڑ ڈال رکھی ہے مسلمانوں
سے توان کی گوشت خوری کے سبب احتیاط کی جاتی ہے مگر مکھی کا کیا علاج جو گوشت پر
بیٹھتی ہے اور اسی وقت اڑکر برہمن کی رسوئی اور دال بھات کی تھالی میں آجاتی ہے۔ اسی
پر بس نہیں سارے جہان کے غلیظ اور میلے کچیلے مقامات میں مکھی کا گذر ہے اور اسی حالت
میں پاک صاف نہائے دھوئے ہندوؤں کے بدن۔ کپڑے۔ کھانے پر پہنچتی ہے پھر چھوت
کہاں رہی۔ اس ناہنجار نابکار نے تو گندے ستھرے کو ایک کر دیا ہے۔ اسپر طرہ یہ کہ کچھ علاج سمجھ
میں نہیں آتا مسلمانوں سے تو علیحدہ رہنا ممکن مگر اس موذی سے کسی طرح چھٹکارا اور بچاؤ ممکن نہیں
فقیر نے کہا سنتے ہیں کہ آدمؑ کے بیٹے نے اپنے بھائی کی لاش کوّے سے سیکھکر دفن
کی تھی۔ لہذا ہندو مکھی سے نصیحت حاصل کریں اور چھوت کے خیال کو چھوڑ کر مسلمانوں سے
شیر و شکر ہوجائیں۔

# مُردار خوار مکھی

مکھی کی تیسری قسم مردار خوار ہے۔ یہ عموماً قبروں اور سڑی ہوئی لاشوں اور قتل گاہوں
میں پائی جاتی ہے۔ اس کے زہر سے خدا بچائے بڑی خوفناک چیز ہے۔ میں تو جب کبھی
اس سبز رنگ کی مکھی کو دیکھتا ہوں تو موت کے بعد کا زمانہ یاد آجاتا ہے اور خدا سے پناہ
مانگتا ہوں کہ وہ مجھکو اور سب بھائیوں کو مکھی کے عذاب سے بچائے۔

# مکھی کے صوفیانہ اوصاف

(۱) جس طرح صوفی لوگ انسان کی روحانی حفاظت کیلئے پیدا کئے گئے ہیں مکھی بھی
جسمانی محافظ ہے۔ گھروں کی زہریلی چیزوں کو چوس چوس کر صاف کر دیتی ہے۔

(۲) دل میں جذبۂ الفت رکھتی ہے۔ گو پروانہ کی مانند جل مرنا اس کو نہیں آتا تاہم جس گھر میں پیدا ہوتی ہے اس سے دلی محبت رکھتی ہے۔ ہر وقت پاس رہنا چاہتی ہے ہزار تدبیریں اس کو جدا کرنے کی کیجئے مگر یہ دامن نہیں چھوڑتی۔

(۳) متوکل ہے جو مل جائے کھا لیتی ہے دربدر ماری ماری نہیں پھرتی

(۴) بہت سویرے بیدار ہوتی ہے اور اپنے محبوب انسان کو غافل دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔ اس لئے سوتے میں بار بار چہرہ پر آتی اور بار بار پر مار مار کر بھنبھناتی ہے اور زبانِ حال سے کہتی ہے۔ اُٹھ پیارے آدمی یہ وقت خدا کی حمد کا ہے۔ دیکھ کیسا سہانا سماں ہے، بیدار ہو اور دوگانہ شکر بجا لا۔ تو اب تک پڑا سوتا ہے، مجھکو دیکھ۔ بڑی دیر سے جاگ رہی ہوں اور خدا کی دی ہوئی ہوا میں اُڑتی پھرتی ہوں۔

(۵) شہادت پسند ہے۔ یعنی دانستہ مکڑی کے منہ میں چلی جاتی ہے تاکہ اس کا بھوکا پیٹ بھرے اور یہ مرتبہ شہادت کمائے۔ آپ کہیں گے اس میں مکھی کا کیا کمال ہے مکڑی تو بے خبری میں چھاپہ مارتی ہے۔ مکھی کی تو خوبی جب تھی کہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں چلی جاتی۔

یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ آجکل کے سائنسداں ڈاکٹروں نے خوردبین آلات سے مشاہدہ کیا ہے کہ مکھی کے جسم میں ہزاروں آنکھیں ہیں، تو بس جس کے دو نہیں ہزار آنکھیں ہوں وہ مکڑی کے داؤں سے بے خبر کیونکر رہ سکتی ہے۔

نہیں جناب یہ صرف مکھی کا ذوق قربانی ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر دوسرے کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ کاش ہم لوگ بھی مکھی ہی سے جاں نثاری کا سبق سیکھیں اور عشق حقیقی کے جالے میں گرفتار ہو کر فنائیت حاصل کریں۔

نوٹ:۔ مکھی کے اس مضمون میں ہندو مسلم الفاظ بھی تھے جو موجودہ زمانہ میں مناسب نہ سمجھے گئے۔ لہذا ان کو لفظ انسان و اچھوت سے بدل دیا گیا۔ حسن نظامی نومبر ۱۹۳۶ء

# اُلّو

ازرسالہ صوفی ۱۹۱۰ء

اُلّو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نحوست کو سب مانتے ہیں۔ ضرب المثل کے جملے بے چارہ اس پرندے کے وجود پر بن گئے ہیں۔ جب کسی گھر یا شہر کی ویرانی بیان کرنی منظور ہو تو کہتے ہیں کہ وہاں تو اُلّو بول رہا ہے یعنی وہ مقام بالکل اُجاڑ ہے۔ آبادی کی چہل پہل بالکل نام کو نہیں اور فقط نحوست اور ویرانہ پن ہی میں اُلّو بدنام نہیں ہے، حماقت و بے عقلی کے موقعہ پر بھی اُلّو ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ اُلّو کی آواز سے بہت بدشگونیاں منسوب ہیں۔

پس ایسے منحوس جانور کے ذکر اذکار میں کون جی لگائیگا۔ کس کو رغبت ہوگی کہ بلبل ہزار داستان اور طوطی شکر مقال کے چرچوں کو چھوڑ کر اس بدنام پرندہ کے بیان میں مصروف ہو۔ مگر دنیا کے پردہ پر سب آدمی ایک مزاج وطبیعت کے نہیں بستے۔ ہزار اُلّو کو بُرا کہنے والے ہیں تو دو چار اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی نکل آئیں گے خاصکر وہ گروہ جو موجودات کے ہر نیک و بد کو صفاتِ یزدانی کا مظہر تصور کرتا ہے۔

جو لوگ بلند آسمان، چمکدار ستاروں، روشن آفتاب و ماہتاب، لہلہاتے باغوں میں شانِ غیبی کا ظہور مشاہدہ کرتے ہیں جن کو چشمِ مستانہ میں جلوۂ راز نظر آتا ہے جو گل کی صورت میں حسنِ ازلی دیکھتے ہیں جن کی زبان سے ان نظاروں کو دیکھکر یہ نکلتا ہے۔ کہ اے خدا تو نے یہ چیزیں فضول نہیں بنائیں وہ پست زمین، اندھیری رات، سنسان بیابان، نگاہِ منحوس اور نوکدار کانٹوں میں بھی حقیقت کی نمود پاتے ہیں اور ہر چیز میں خدا کی شان نظر آتی ہے۔

ہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس جماعت کے رسالہ میں جس کا مشرب ہمہ اوست ہے، اور جو خیر و شر دونوں میں محمل لیلیٰ کے جرس کی صدا سنتے ہیں، اُلّو کی سرگذشت نہ لکھی جائے صوفی کی

روش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر اچھی بُری چیز میں منزل مقصود کو تلاش کرے۔ یہ رسالہ صوفیوں کا ہے
اس لیئے اس میں بھی جہاں عام پسند عنوانوں پر مضامین لکھے جاتے ہیں وہاں ان عنوانوں
کو بھی زیر بحث لایا جائے جن پر توجہ کرنا قاعدہ اور دستور کی نظر میں قابل نفرت ہے۔

# اُلّو کے اوصاف

اُلّو کی زندگی، بود و باش ایک باخدا، تارک الدنیا درویش کی سی ہے۔ وہ آبادی سے
گھبراتا ہے۔ اس کو خلوت تنہائی بھاتی ہے۔ عام پرندوں کی طرح رونق دار شہروں اور غل
شور کے مقام پر آشیانہ نہیں بناتا۔ سرسبز درختوں کی شاخوں پر بیٹھکر نغمہ سنجی نہیں کرتا جس سے
فرحت پسند انسان جی بہلائے۔ اُلّو سارا دن حریص پرندوں کی مثل پیٹ کی خاطر در بدر
مارا مارا نہیں پھرتا بلکہ وہ اجاڑ اور غیر آباد کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے جہاں کوئی غیر مانوس
آواز اس کی مشغولی میں خلل انداز نہ ہو۔ دن بھر صائم رہتا ہے اور شام کو سورج چھپنے کے
بعد رزق کی تلاش میں نکلتا ہے اور جونہی نکلا خدا تعالیٰ شکار کے چند لقمے دلوا دیتا ہے
جن سے روزہ افطار کر کے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد یا جھکی ہوئی دیوار پر آبیٹھتا ہے اور ہُو ہُو کے
نعرے لگانے لگتا ہے۔ اسی ذکر و شغل اور یاد الٰہی میں صبح ہو جاتی ہے اور یہ پکا اور سچا صوفی
ریاکاری کے ڈر سے خاموش ہو کر اپنے حجرہ میں گھس جاتا ہے اور حبس دم کر کے مراقبہ
میں بیٹھ جاتا ہے پھر شام تک باہر نہیں آتا۔

یہ خود پسند آدمی با دشاہی کا تاج پہن کر نوبت نقارے بجواتا ہے۔ نوبت خانوں کیلئے
اونچے اونچے مکان تیار کراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ نوبت ہمیشہ بجے گی لیکن زمانہ کا چکر چند
ہی روز میں اس سرکش کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھر دنیا والے اس کو اور اس کے نوبت
نقاروں کو بالکل بھول جاتے ہیں مگر اُلّو نہیں بھولتا مٹنے والے تاجدار کے خاکی ڈھیر
پر جاتا ہے اور نقیب و چوبداروں کی آواز کو صدائے عبرت میں مرنے والے کے

وجودِ خدا کی کو سناتا ہے اور اس کے نوبت خانہ پر بیٹھ کر ٹھیک رات کے بارہ بجے یہ نوبت بجاتا ہے کہ یہاں کی ہر چیز کو فنا ہے باقی رہنے والی بس خدا کی ایک ذات ہے۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں راقم الحروف درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں حاضر تھا۔ پچھلی رات جبکہ چاند غروب ہو رہا تھا، جی چاہا کہ قطب مینار کا نظارہ کروں۔ اسوقت عجیب پُر اثر وقت تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ درگاہ شریف سے نکل کر مقبرہ ادہم خاں کے قریب آیا تو دسویں رات کے چاند کی صورت سامنے آگئی۔ بیچارہ ماندگی کے عالم میں اُفق تنزل پر جھک رہا تھا اور اپنی افسردہ شعاعیں ویران در دیوار پر ڈال رہا تھا۔ بل کچی روشنی میں شاہی کھنڈرات کی صورت ایسی ہیبت ناک اور ڈراونی معلوم ہوئی کہ کلیجہ کانپنے لگا۔ تاہم ہمت کر کے ذرا اور آگے بڑھا۔ جوگ مایا کا مندر دُور سے نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف جو پھر کر دیکھا تو غیاث الدین بلبن اور محمد خاں شہید کے شکستہ مقبرے اور بیسیوں اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں جن پر پھیکی پھیکی چاندنی اور رات کی خاموشی نے خبر نہیں کس بلا کا اثر پھیلا رکھا تھا کہ بے اختیاری کی سی حالت پیدا ہوگئی لیکن ارادہ قطب مینار دیکھنے کا تھا۔ ان نظاروں میں تھوڑی دیر مصروف رہ کر آگے بڑھ گیا اور علاؤ الدین خلجی کے مقبرہ کے پاس پہنچا تو بے چارہ سلطان خلجی اکیلا تنہا خوفناک کھنڈر کی گود میں پڑا سوتا ہے۔ کوئی پہرہ دار نہیں، پاسبان نہیں جو اس سکندر ثانی کی خوابگاہ کے قریب جانے سے مجھ اجنبی کو روکے زندگی کی تو خبر نہیں مرنے کے بعد جب ابن بطوطہ نے اس مقبرہ کو دیکھا تھا، تو عجب شان تھی۔ زریں مخملی غلاف پڑے ہوئے تھے۔ اگر اور لوبان کی خوشبو سے مقبرہ مہک رہا تھا۔ عالی شان گنبد کے قریب بہت بڑا مدرسہ تھا جہاں سینکڑوں طلباء علوم و فنون حاصل کرتے تھے۔

آج کی رات نہ گنبد باقی تھا نہ غلاف۔ نہ خوشبو۔ نہ مدرسہ۔ نہ طلبا یہاں تک کہ

قبر کا نشان بھی ناپید تھا چونے اور پتھروں کے انبار میں خبر نہیں کس جگہ سکندر ثانی سلطان علاؤ الدین خلجی کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ اس منظر نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ بدن ساکن کر دیا۔ آنکھوں کو دریائے عبرت میں غرق کر دیا۔ محو حیرت بنا کھڑا تھا کہ سامنے کی شکستہ دیوار پر سے اُلّو کی صدا کان میں آئی جو سلطان کی گذشتہ شان و شوکت کا نوحہ رُک رُک کر پڑھ رہا تھا۔

ان سب پُر اثر نظاروں سے زیادہ میرے دل پر صدائے بوم کی چوٹ لگی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت کیا حالت ہوئی اور اب جب اس کا خیال کرتا ہوں کیا کیفیت دل کی ہو جاتی ہے تو کیا ایسے ناصح اور بیکسوں کے دمساز جانور کو آپ بُرا کہہ سکتے ہیں؟ اگر اس کی محل شناسی پر غور کیا جائے تو بیساختہ داد دینی پڑتی ہے جن کو سب بھول گئے سب نے چھوڑ دیا ان کو اُلّو نے نہیں بُھلایا اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُلّو کی آواز کو منحوس ناحق کہتے ہیں۔ ذرا دھیان سے سنو اللّٰہ ھو صاف سمجھ میں آئیگا بعض دفعہ ہو ہو بھی کہتا ہے اور بعض وقت پورا اللّٰہ ھو پکارتا ہے۔ بنگالی مینا، ہیرامن طوطا اور ننھی ننھی خوبصورت چڑیاں میٹھی میٹھی بولیوں سے آپ کا جی خوش کرتی ہیں مگر اُلّو اپنے نعرہ حق سے آپ کے دل کو لرزا دیتا ہے۔ اس لئے آپ اس کو منحوس کہتے ہیں نہیں نہیں ایسا خیال نہ کرو۔ یہ خوشنوا پرندے دل کو یاد حق سے ہٹا کر تکلفات دنیا میں مصروف کرتے ہیں اور اُلّو کی جگر خراش فریاد انجام حیات کو یاد دلاتی ہے اور کہتی ہے۔ ؎

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

آج سے آپ کو چاہیئے کہ اُلّو کی نحوست کا خیال چھوڑ کے اس کی خوبیوں پر غور کیا کیجئے اور اُلّو پر کیا منحصر ہے، عالم موجودات میں جو شے نظر سے گذرے، اچھی ہو یا بُری، اس کے اچھے معنی نکال لینے چاہیئں۔

نوٹ ۱:۔ اس مضمون میں جس قدر قرآنی فقرے تھے ان کی جگہ اردو فقرے کر دئے گئے ہیں تاکہ سب ناظرین سمجھ سکیں۔ حسن نظامی نومبر ۱۹۳۶ء

# رسول کی من بھاتی غذا



از اخبار زمیندار ۱۹۱۲ء

میرا چاہیتا زرد پوش جو کیسا پیارا پیارا ہے۔ پیدا ہوتے ہی عشقبازی کا بسنتی لباس پہن لیتا ہے اور مرتے دم تک اس کو تن سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ یہانتک کہ موت کی چکی میں پس کر نابود ہو جاتا ہے۔ اس میکیلے دانہ سے نفرت نہ کرنا۔ بھائی یہ تمہارے رسول صلعم کا منہ چڑھا دانہ ہے یہی وہ ہستی ہے جس کے آگے کسی کھانے کو سرکار رسولؐ تک رسائی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کی تعریف کون کرے۔ خلقت تو دیوانی ہو گئی ہے جس کو دیکھو

## گندم گنہگار

پر جان دیتا ہے۔ روٹی تو روٹی محبوب بھی گندمی رنگ کا تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ وہی میاں دانہ گندم ہیں جن کو نوش کر کے آدم جنت سے نکلے اور عتاب الٰہی کے سزاوار ہوئے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مولانا روم اپنی مثنوی میں ہوس پرستوں کی عشق بازی کا سبب قرار دیتے کو کہا ہے۔ کہ۔ ع این خمار از خوردن گندم بود

نہیں جناب۔ ہم کو تو اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی من بھاتی غذا جو مرغوب ہے اس کا تن بھی اچھا اور من بھی مزہ دار

## پالیسی کی تلاش

لوگ کہتے ہیں ہندستانیوں کو ایک نئی پالیسی بنانیکی ضرورت ہے۔ اگر واقعی یہ سچ ہے

توبھی میرے نزدیک پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ

# جَو کھاؤ اور جَو کی رنگت بن جاؤ

لیگ وکانگریس، اسکول وکالج، ہوش وخرد سب کو آگ لگا دو۔ گردش سے یہ وقت آگیا کہ پیٹ بھرنے کو جَو کے چار دانے بھی نہیں ملتے، تو بس یہی پالیسی بہتر ہے کہ دیوانہ وار جَو کا چھلکا اتارنے کی کوشش کرو۔

خبر نہیں میں نے کیا کہا اور آپ کیا سمجھے؟ یہ کوئی معمہ نہیں ہے جَو کو چاہتا ہوں، جَو پر مرتا ہوں۔ اسی کا نام بار بار زبان پر آتا ہے۔ مدینہ شریف سے واپس آکر دونوں وقت جَو کی روٹی کھاتا ہوں۔ اس میں صحت ہے، تندرستی ہے، طاقت ہے، لذت ہے اور وہ یاد ہے جس کے بھولنے نے قوم کو تباہ وبرباد کردیا۔ یاد رکھ، بھول مت۔ رسول جَو کھاتے تھے صحابہؓ جَو کھاتے تھے۔ تلوار چلانے والے، ہاتھ اور ملک چلانے والے، دماغ کو وہ معدہ خوراک دیتا تھا جس میں جَو کی روٹی کے سوا توس مکھن کا نام نہ تھا۔ ذرا کھا کر تو دیکھو کیسی مزہ کی چیز ہے۔ ذرا سا خمیر ملا لیا کرو روٹی نرم ہوجائے گی اور ہضم میں دیر نہ ہوگی۔ سنا ہوگا دلی میں دربار تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے مرنے والے بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی چند شہزادیاں اپنے ٹوٹے ہوئے بوریئے پر بیٹھی جَو کی روٹی کھا رہی تھیں، چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سردی چمک رہی تھی۔ سب سے چھوٹی سات برس کی عمر والی لڑکی اپنی ماں سے مخاطب ہوکر بولی کیوں بی اماں یہ انگریزوں کے بادشاہ بھی جَو کھاتے ہوں گے۔ کیونکہ تم نے پرسوں کہا تھا کہ سب بادشاہ اور ان کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ ماں اس معصومانہ سوال کو ٹالنا چاہتی تھی مگر بچی نہ مانی اور بولی اچھی بی بتاؤ۔ جواب ملا نہیں۔ جو دربار کرتے ہیں وہ جَو نہیں کھاتے۔ میں نے پرسوں تم سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ اور ان کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن

بادشاہوں کا نام فقط بادشاہ رہ جاتا ہے اور کام چھن جاتا ہے۔ ان کو جَو کے سوا اور کچھ
کھانے کو نہیں ملتا بیٹی یہ جو ٹکڑا میسر آجاتا ہے اس کو بھی غنیمت سمجھو۔ تقدیر تو اس قابل
بھی نہیں۔ آج لاکھوں روپیہ آتشبازی اور خبر نہیں کن کن بازیوں میں سرکار انگریزی
کا خرچ ہو جائے گا مگر اس سے کون کہے کہ ہم تیمور کے گھر والے جَو کی روکھی روٹی سے
بھی محتاج ہو گئے ہیں ایک بازی ہمارے نام کی بھی لگا دو۔ دلّی میں تخت بچھا ہے۔ ایک نظر ان پر
بھی ڈالو جو کل کے دن اس تخت کے مالک تھے اور آج فرش خاک پر ذلیل پڑے ہوئے
ہیں۔ مگر یوا کس کا کہنا کس کا سُنتا ہیں تم سے کہتی ہوں کہ شاہوں کے شاہ سلطان کونین حضرت
محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ ہم اور کسی بادشاہ کو کیوں دیکھیں
اپنے آقا و مولا کی مثال کیوں نہ دیں۔ کہتے ہیں دانہ دانہ پر مہر ہوتی ہے رسول نما میں جَو
کے دانہ پر قبولیت کی مہر لگنی چاہیئے۔ دیکھوں کتنے عاشقان رسولؐ گندم ترک اور جَو اختیار
کرتے ہیں یقین مانو کہ مسلمانوں کو غذا کا فیشن فوراً بدلنا چاہیئے۔ سفید چپاتی پر مرنا چھوڑ
دو۔ تم کالے ہو گوری چیز سے رشتہ جوڑو گے تو قانون گھور کر دیکھے گا۔ اگر دس بیس خدا
بندے جَو کھانے کا عہد باندھ لیں تو میں سمجھوں گا روحانی حکومت کی زندگی میں جان پڑ گئی
کیونکہ بزرگوں سے سُنا ہے کہ روح کا رنگ زرد ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد
رکھنا چاہیئے کہ روحانی حکومت کو دنیاوی حکمرانوں سے کچھ سروکار نہیں۔ ذوق و شوق
کی اقلیم پر قبضہ کرنا اور اس میں اپنا سکہ و خطبہ رائج کرنا مقصود ہے تو اس خواہش کو زرد
خطرہ نہ بنا لیا جائے۔ جیسے کہ چین و جاپان کی زرد قوموں سے ولایتی مضمون نگار زرد
خطرے کا عنوان قائم کر کے ڈرایا کرتے ہیں۔ میرا جَو اندیشہ کی چیز نہیں صاف ہے
چکنا ہے، ایسے ہی ہم اس کے چاہنے والے بھی پالیٹکس سے علیحدہ اور کسی
دوسری دُھن کے شیدائی ہیں۔ یا یوں کہو کہ گورے آدمیوں کی طرح کہتے یہ ہیں کہ ہم
سیاسی آدمی نہیں ہیں مگر آزادی کے عشق میں جَو کی طرح زرد ہو گئے ہیں۔

# پھولوں کے شکوے
# قسمت و تقدیر کی شکایتیں

از توحید۔ ۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء

میرٹھ کی نوچندی میں راقم فقیر نے پھولوں کی نمائش دیکھی یہی سارے مجمع کی جان تھی ادھر پھول، اُدھر پھول، نیچے پھول، اوپر پھول۔ چاروں طرف گل خانے ہی گل خانے نظر آتے تھے۔ آراستہ خیمے میں سفید فرش پر میزیں سجی ہوئی تھیں جن پر جداگانہ سلیقہ و ترتیب سے چینی اور شیشے کے گملوں میں رنگ برنگ کے پھول لگائے گئے تھے۔ نمائش اس کی تھی کہ کس نے نیچرل اور موزوں طریقے سے پھولوں کو چُنا ہے چننے والیاں بھی جن کو انگریز مس بابا لوگ کہتے ہیں، جگہ جگہ موجود تھیں اور فرش کے متحرک پھول ثابت ہو رہی تھیں۔ فقیر اس عالم "گل و گل" کی سیر کرتا پھر رہا تھا کہ یکایک ایک جھاؤ کی ٹوکری پر نگاہ پڑی جس میں چند نہایت خوشرنگ و خوبصورت پھول رکھے ہوئے تھے اور یہ ٹوکری زمین پر دھری تھی ان کو دیکھ کر آگے بڑھا ہی تھا کہ تصور کے کان میں ایک شیریں آواز نے کچھ کہا۔ یہ صدائے گل تھی جو اپنی قسمت و تقدیر کا شکوہ کر رہی تھی۔ اس نے کہا جب میری اور میز کے سامنے والے گلدستہ کی ایک ذات ہے، ایک رنگت ہے، ایک بُو ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اس کو شیشے کے گملہ میں شاندار میز پر لگایا ہے اور مجھکو جھاؤ کی ٹوکری میں زمین پر ڈال دیا ہے۔

پھول کے اس شکوے سے دل پر چوٹ لگی اور ڈاکٹر اقبال کا شکوہ یاد آ گیا جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کہ اتنے میں دوسرے کان میں صدائے مخفی نے اس کا

جواب دیا اور کہا کہہ دے۔ اے سننے والے! ٹوکری کے پھول گوشہ اور خلوت کے امن میں ہیں۔ دیدار بازوں کی یورش میز پر ہے۔ مگر یہ سب ہوس پرست ہیں۔ پھول کی ظاہری خوشنمائی کو دیکھتے ہیں لیکن پھول کو دیکھنے کے لئے نظر عرفان کھچی جاتی ہے۔ یہ ایسی بڑی عزت ہے جو میز کے پھول کو نصیب نہیں۔ بس اے ٹوکری کے غریب گلدستے! تجھ کو بشارت ہو کہ تیری شان کو دوام ہے اور میز کے پھول کو زوال۔

دوسری طرف پھلوں کی میزیں تھیں۔ ہمہ قسم کے میوے اور پھل چنے ہوئے تھے ان میں بعض پھلوں کو تراش کر دکھایا گیا تھا۔ ایک ترشے ہوئے پھل نے کہا۔ مجھکو زخمی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب آیا۔ تیرا باطن اہل ظاہر کو نظر آجائے اور وہ بھی اپنے اندرون کو چیر کر دیکھیں کہ اس میں اور ظاہر میں کچھ فرق تو نہیں ہے؟

# ہولناک لیکچر

از توحید ۱۶ مئی ۱۹۱۳ء

کل رات کو ۲ بجے ۲۶ جمادی الاولیٰ کا چاند شب اول کے ہلال کی مثل ستاروں میں جھلملا رہا تھا۔ یہ آخری تاریخ تھی۔ اب دو روز تک یہ چاند مخفی رہے گا اور ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کو نمودار ہوگا مگر جمادی الاولیٰ کے نام سے نہیں جمادی الآخری نام لیکر۔

راقم فقیر آسمانوں والے، زمینوں والے، پہاڑوں اور سمندروں والے، نور و ظلمت کے رکھوالے خدا سے کچھ مانگ رہا تھا کہ احساس اور ادراک کے کان میں ایک نطق، ایک خطبہ، ایک لیکچر، ایک تقریر کی آواز آئی۔ ہوش نے اپنے گوش ادھر لگائے اور سنا۔

افسردہ اور اداس چاند ستاروں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ستارے دل لگائے

سن رہے تھے۔ بیان ہولناک تھا۔ لہجہ اندیشہ خیز تھا۔ دل نے کہا زمین کے قانون بنانے والے سنتے نہ ہوں۔ صوت سرمدنے جواب دیا۔ نہیں وہ سب سوتے ہیں خفیہ پولیس کارِخاص کے اہل کار نسیم سحر کی آغوش میں مدہوش پڑے ہیں۔ پہرہ پر کوئی نہیں۔ چاندنے کہا:-

ستارو! سنتے ہو۔ اب ہم تم چند ساعت کے مہمان ہیں۔ آفتاب افقِ مشرق سے طلوع ہونے والا ہے۔ نورکو انوار زیر و زبر کرنے آتے ہیں۔ آج کی رات ہمنے تاریکی کا مقابلہ کیا۔ اس سے لڑے۔ اس کو شکست دی مگر اہل جہاں سوتے رہے۔ ہماری معرکہ آرائی کی سیر نہ دیکھی۔ اب سورج کی جنگ دیکھنے کے لیے سب کی آنکھیں کھل جائینگی

میرے درخشندہ بھائیو! آسمان کی خاموشی دور ہونے والی ہے۔ زمین کا سکوت ختم ہونے کے قریب آگیا ہے اس لئے میں اپنی مہینہ بھر کی روشن گویائی کو تمام کرتا ہوں اور حجرۂ خلوت میں جاتا ہوں۔ کل کی رات اور پرسوں کی رات اور شاید اس کے بعد ایک اور رات مجھکو میدان فلک میں نہ پاؤگے۔ تمہارا کمانڈر غروب ہوتا ہے، تمہارا سردار تلوار میان میں کرتا ہے۔ تنہائی میں ہمت نہ ہارنا ظلمتِ شب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا۔ وہ دیو ہیکل ہے۔ تم نازک اندام ہو۔ ڈر نہ جانا۔ سیاہ باطن کور دیدہ کا فتح کر لینا دشوار نہیں۔ جب تاریکی کے لشکر سمندروں، پہاڑوں اور زمینوں کے غاروں سے نکل کر آسمان کے کناروں پر حملہ آور ہوں تو مریخ اپنا منور دستہ لیکر میمنہ کو سنبھالے، مشتری میسرہ کو روکے۔ زحل قلب میں جم جائے زہرہ اور عطارد کمسرپٹ کی نگرانی کریں۔ باقی افسر کمینگاہوں میں رہیں۔

شہاب ثاقب کی سرچ لائٹ سے دیکھ بھال رکھنا۔ سبیخبری بری بلا ہے اور اس کے بعد فائر ہو۔

نورانی گولے اندھیرے پر برسائے جائیں شعاع کی سنگینیں چلیں۔ کرنوں کی

گولیاں سن سن کرتی نکلیں۔

جب دشمن کا پاؤں ڈگمگائے شکست کے آثار نمودار ہوں سب سپاہی چمکیں دمکیں اور ایک آخری حملہ کرکے اس کا کام تمام کردیں۔

جب آسمان کا ملک صاف ہو جائے گا، تاریکی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے گا تو فرشتے فتح کا جشن رچائیں گے پروردگار کی نصرت غیب کا ترانہ گائیں گے۔ تم بھی اپنی زبان کھولنا۔ حمد سبحان ذی شان میں فرشتوں کی شرکت کرنا۔

## ستاروں نے کہا:-

اے عثمانی ہلال کی صورت کے قمر! ہم کیا ہماری بساط کیا۔ غریب غروب ہونے والے تارے ہیں۔ تو بھی چھپ جانے والا کرۂ نور ہے۔ دن کا صف شکن آفتاب ہم سب میں بڑا ہم سب سے زیادہ شہ زور ہے۔ مگر رات کو نا پید ہو جاتا ہے۔ اس پر کیا گھمنڈ اور غرور کریں۔ تاریکی بھی خدا کی پیدا کردہ ہستی ہے اس سے کیوں لڑیں۔ خوں ریزی و سفاکی اپنا کام نہیں۔ خاموشی میں پیدا ہوئے، خاموشی میں مر جائیں گے۔ پھر اس غل شور فتنہ و فساد سے کیا سروکار۔ کچھ اور سنا کوئی اور بات کہہ۔ زہرہ کا ایک گیت سن نغمۂ ربانی میں جی لگا۔ گود میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ ایسی نصیحت کر جو یادگار زمانہ ہو۔ اور آسمانی نصیحت اور آکاش بانی کہی جائے۔

چاند مسکرایا۔ اپنی جگہ سے سرکا اور جھک کر ستاروں کے کان میں کچھ کہا جس سے وہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور ایک ایک کرکے نابودی کی رزم گاہ میں گھس گئے اور ان کے پیچھے چاند بھی کن انکھیوں سے دنیا کے سونے والوں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ چلا اور آخر کہیں غائب ہو گیا۔

یہ کیا کہا؟ اس کو کون سمجھا۔ نا سمجھ کہیں گے چند الفاظ جوڑ کر رکھ دئیے ہیں جن کا مطلب کچھ بھی نہیں ہے۔ اُن سے کہو بے مقصد اس دُنیا میں نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی حرکت ہے پھر یہ بے مطلب کیونکر ہے؟

# خاکی جام

## فنا کے بعد بقا

# عشق کی خیالی داستان

ازتوحید۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء

جب فراق کی بے چینی آدم زاد سے برداشت نہ ہوسکی، جب ہجر کی بے قراری انسان کے وجود خاکی کی تاب و توانائی سے بڑھ گئی تو مایوس ہستی نے زہر کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیا۔ آسمان کو دیکھا اور کہا۔ پیدا کرنے والے خدا۔ یہ مشت خاک اتنی بڑی امانت کے قابل نہیں ہے اپنی امانت واپس لے۔ میرے بازوؤں کو اس بوجھ سے ہلکا کر اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا، یا نہیں کرنا چاہتا تو میں خود اس بار سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر زہر کا پیالہ پی لیا اور تھوڑی دیر میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اس کے بعد رسموں کے پابند لوگ آئے بے جان لاش کو نہلایا اور سفید کفن کا جوڑہ پہنا کر جنگل بیابان میں ایک گہری قبر کے اندر لیجا کر دفنا دیا۔ کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ ہمارے اس ہم جنس پر کیا گزر گئی اور ہم کیوں اس معدوم ہستی نا پیکر کو خاک میں ملاتے ہیں۔

(۲)

بڑے زور کی آندھی آئی۔ بادل کڑکے بجلی چمکی۔ طوفانی بارش ہوئی۔ جنگل میں پانی زور شور سے بہنے لگا۔ پہاڑی ندی میں سیلابی کیفیت پیدا ہوئی جس کی زد میں پرانا قبرستان بھی آگیا **شہید محبت** کی قبر ذرا اونچے مقام پر تھی سیلاب سے بچ گئی

تاہم سامنے کے غار میں کچھ دن کے بعد معہ پٹاؤ کے یہ بھی گر پڑی اور گڑھے کے اندر مٹی کا انبار بنی رہی۔ اس کو بھی ایک سال گذر گیا۔ اتنے میں ایک اور طوفان آیا سردی کا موسم تھا۔ اس زور سے اولے برسے کہ تمام صحرا سفید ہو گیا قاعدہ ہے کہ اولے جب برستے ہیں تو پانی ان کو سمیٹ سمیٹ کر نشیبی مقامات میں جمع کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس گڑھے میں ہمارے مردہ عشق کی خاک پڑی ہوئی تھی وہاں بھی اولوں کا انبار لگ گیا۔ یہ قصہ رات کا ہے صبح کو جبکہ اولے گھل کر اور پگھل کر مٹی میں جذب ہو چکے تھے۔ ایک کمہار اپنے گدھوں کو لیئے ہوئے اولوں کی مٹی کی تلاش میں آیا۔ یعنی جن گڑھوں میں اولے جمع ہوئے تھے وہاں کی مٹی کھود کھود کر بوروں میں بھر لی۔ ہمارے مرحوم عاشق کی مٹی بھی ایک بورے کے حصہ میں آئی اور کشاں کشاں کمہار کے گھر میں پہنچی۔ مشہور ہے کہ جس مٹی میں اولے ملے ہوئے ہوں۔ اس کے برتن میں پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں دنیا والے اس کی بہت قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ کمہار نے اس مٹی کے بہت سے برتن۔ مٹکے ٹھلیاں۔ گلاس صراحیاں وغیرہ بنائیں۔

(۳)

برسات کا موسم تھا۔ سخت گھس اور گرمی کے بعد ابر گھر کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا درختوں میں لہرا رہی تھی۔ سبز ٹہنیاں آبادیوں میں ہوا پاشی کر رہی تھیں۔ یکایک دیکھا کہ ایک آراستہ کمرہ ہے جس میں ایک پری جمال حور لقا مستی نشۂ شباب میں مخمور انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھی اور نوکر کو حکم دیا کہ کمہار کے ہاں سے ایک صراحی اور جام لے آئے مگر یہ صراحی اور جام اولوں کی مٹی کے ہوں۔ تعمیل کی گئی۔ گنہ گار ہاتھوں نے شراب کی بوتل کھولی۔ صراحی میں پانی بھرا اور اس میں وہ شراب ڈال دی گئی۔ اسکے بعد پانی ملی ہوئی شراب گلاس میں نکالی گئی اور ایک انداز مستانہ سے وہ گلاس ہونٹوں تک پہنچا جس وقت لب جاں بخش اس خاکی جام سے ہم آغوش ہوئے، ایک صدائے غیب

نے یہ شعر پڑھا ے

پس مردن بنائے جائینگے ساغر مری گل کے
لب جاں بخش کے بوسے ملینگے خاک میں مل کے

او مغرور بے خبر، جفا کار، ستانے شرابی میں اُسی آدمی کی خاک ہوں جو تیری یاد میں پھڑک پھڑک کر مرگیا۔ میرا جسم میری ہڈیاں۔ میری آنکھیں جو تجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں، میرا وہ دل جس میں تیرے ملنے کی آرزو تھی۔ میرا وہ دماغ جو تیرے وصال کے تخیلات میں سرشار رہتا تھا، سب خاک ہو گئے لیکن پوری بربادی، کامل تباہی اور آخری فنا کے بعد آج یہ مقام بقا حاصل ہوا اور میرے ہونٹوں کی خاک گلاس کے کنارے میں پیوست ہو کر تیرے سراپا حیات ہونٹ تک پہنچی اور وصال کی گھڑی نصیب ہوئی۔ اگر یہ وصل جسم کی زندگی میں میسر آتا تو ہرگز ہرگز وہ دوامی لطف حاصل نہ ہوتا جو آج کے دن محسوس ہو رہا ہے اور جو یقیناً ہمیشہ قائم و برقرار رہیگا۔

(۴)

عشق کی اس داستان کو سُن کر راقم درویش نے کہا۔ او مسلمان! تو ہراساں اور پریشاں نہ ہو دورحاضر کی مصیبتیں تیری ابدی بقا اور پائدار زندگی کی نشانیاں ہیں۔ غور کر اور خوش باش ہو۔ اور اُن کانٹوں کو روندتا ہوا آگے بڑھا چل۔

# دُوربین اور مکاشفاتِ غیب

از توحید یکم جولائی ۱۹۱۵ء

تمہاری آنکھ دور کی چیز نہیں دیکھ سکتی تو ایک دور بیں منگا لو۔ بُعد کی منزلیں قریب ہو جائیں گی۔ اور جس کو دور سمجھتے ہو وہ پاس آجائے گا۔

دوربین کیا چیز ہے؛ سب جانتے ہیں۔ آدمی نے ہنر اور علم کے زور سے ایک شیشہ ایجاد کیا ہے۔ جہاں اس شیشہ کو آنکھ کے سامنے لگایا بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سو گز پرے کے در و دیوار چہرہ کے پاس آ گئے۔

بعض دوربینیں لاکھوں کوس کی چیز دکھا دیتی ہیں۔ آجکل یورپ والوں نے ایسی دوربین ایجاد کی ہے جس سے چاند سورج اور آسمان کے سب تاروں کی حقیقت نظر آ جاتی ہے۔ لوگوں نے اس دوربین کے ذریعہ حساب لگا کے بتایا ہے کہ سورج کتنا بڑا اور ہم سے کس قدر دور ہے۔ چاند اور مریخ زمین سے کتنے فاصلہ پر ہیں اور ان کی اندرونی حالت کیسی ہے۔ انہی دوربینوں سے قدرت کے نامعلوم بھید بھی کھل گئے مثلاً پہلے زمانہ میں فقط ایک چاند سورج کا علم تھا اور نادان خلقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر ہنستی تھی کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی متعدد عالم ہیں جہاں یہاں کی طرح چاند سورج اور مخلوق آباد ہے۔

مگر اب دوربین نے یہ دعویٰ سچا کر دکھایا اور یورپ والے مان گئے کہ اس سورج کے علاوہ، جو ہم کو نظر آ رہا ہے اور جس کے طلوع و غروب سے دنیا کے رات دن کا حساب مقرر ہے، اور بھی بہت سے سورج ہیں اور ان کے ساتھ بھی اسی طرح ایک عظیم الشان نظام اور کائنات گردش کر رہی ہے جس طرح ہمارے سورج کے ساتھ ہے۔ گویا دوربین نے غیب کی باتوں کو عیاں کر کے دکھا دیا اور مسلمانوں کے ایمان بالغیب کی تصدیق ہو گئی۔

ان بڑی دوربینوں کے علاوہ میدان جنگ میں ایک اور دوربین استعمال کی جاتی ہے یعنی جنگی جہازوں اور خشکی کے لشکروں کے پاس ایک دوربین ہوتی ہے جس سے سینکڑوں کوس کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں کہ دشمن اس وقت کس حال میں ہے اور اس کے پاس کیا کیا ساز و سامان ہے۔

بہرحال دوربین ایک عجیب طلسم کشا لوح ہے جب آنکھ کے سامنے آتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دور کی چیز بالکل سامنے کھڑی ہے لیکن درحقیقت وہ وہاں نہیں ہوتی۔ دیکھنے والے کو صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز قریب آگئی تو کیا دُوربین

# دھوکہ کی ٹٹی ہے؟

نہیں یہ بات نہیں ہے، دُوربین صداقت کا آئینہ ہے۔ وہ جو کچھ دکھاتی ہے بے کم وکاست سچ اور واقعی ہوتا ہے لیکن دوسرے آدمی جن کی آنکھ پر دُوربین نہیں ہوتی اس میں شک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنی دور کی چیز آنکھ کے پاس آگئی۔

چنانچہ صوفیائے کرام کے مکاشفاتِ غیب پر ایسے ہی لوگ، جو ظاہری دوربین کے کمال سے بے خبر ہیں لعن طعن کیا کرتے ہیں کیونکہ اُن کو یہ بات بالکل عقل کے خلاف اور عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی معراج رسول اللہ علیہ وسلم کی نسبت وہ لوگ، جن کی آنکھیں بصیرت کی دوربین سے محروم ہیں، اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آن کی آن میں ساتوں آسمانوں کو طے کرکے عرش اعظم پر پہنچ گئے۔ پروردگار عالم سے ملاقی ہوئے۔ دوزخ جنت کی سیر دیکھی اور واپس آئے تو بستر گرم تھا۔ دروازہ کی کنڈی ہل رہی تھی۔ یعنی اتنے عظیم الشان سفر میں چند سکنڈ سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔

مگر اس کو نہیں دیکھتے کہ دوربین کے اندر سے نگاہ آن کی آن میں لاکھوں کوس کھنچ کر پہنچ جاتی ہے اور بڑے بڑے مقامات کی سیر کرکے چند سکنڈ میں واپس بھی آجاتی ہے، تو آیا یہ مشاہدہ عقل کے مواق ہوتا ہے یا خلاف؟

اصل یہ ہے کہ نئے زمانہ کی تمام ایجادیں اور سائنس کے آلات بظاہر تو لوگوں کو

خدا سے بے خبر کر رہے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ان کے باطنی حقائق پر غور کرے
تو یہی چیزیں مذہبی عقائد کی مستحکم دلیلیں اور خدا پرستی کے

## سگنل

بن جائیں اور پھر حیاتِ انسان کی سب ریل گاڑیاں دنیا کے اسٹیشن سے بے خطر
پاس ہو کر منزل آخرت تک پہنچنے لگیں۔

# گلاب تمہارا اکیکر ہمارا

از توحید ۲۴ جولائی ۱۹۱۳ء

ان سب شاعروں کو سامنے سے ہٹاؤ جو گلاب کے پھول پر مرتے ہیں سینکڑوں
برس سے ایک ہی چہرے کے طلب گار ہیں۔ یہ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ مقلد ہیں سنی سنائی
تقلیدی باتوں پر جان دیتے ہیں۔

میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔ مجھکو ایک اور آنکھ ملی ہے جو ان سب سے اونچی ہے
میرے دل کی ہم نشینی و ہمسری کے ان میں ایک بھی قابل نہیں ہے میں بندہ ہوں سب
بندوں کی مثل ہوں۔ میں بشر ہوں۔ تمام بنی آدم کے برابر درجہ لے کر آیا ہوں۔ میں
نبی نہیں ہوں۔ ولی نہیں ہوں۔ مہدی اور عیسیٰ نہیں ہوں۔ دعویٰ خودنمائی و
خودستائی سے بھی انکار ہے۔ مگر میں عالم تعین و ہستی مثالی کی ایک تصویر ہوں
جس میں رنگ فطرت کی قلمکاریاں ہیں۔ اس واسطے میں خود اپنے وجود کا طلبگار ہوں
اور اسی لئے یہ تعلی اور یہ خود آرائی ہے تاکہ میں خود کو اپنی خودی دکھاؤں اور خطاب کروں
کہ جتنے یہ تک جوڑنے والے شاعر ہیں سب نے گلاب کے پھول کو تختہ مشق بنایا ہے۔

کوئی اس کی بھینی بھینی بُو پر فدا ہے۔ کوئی اس کی نازک نازک پتیوں پر نثار ہے۔ کسی کو اس کے رنگ سے رخسارِ محبوب کی یاد پیدا ہوتی ہے۔ کسی کا دل اس کے کھلنے اور مرجھانے کے انقلاب میں اسیر ہے۔ بعض ہیں کہ جو گلاب کے خار سے خار کھائے بیٹھے ہیں خیر۔ یہ جتنی باتیں ہیں ان میں تو شکایت کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی بے شمار

# مخلوقات کی حق تلفی

کی، ایک ہی دروازے پر ڈیرے ڈال دیئے، ایک ہی آئینہ کی دید میں مدہوش ہو کر رہ گئے اور ان بے شمار جلووں کو نہ دیکھا جو ان کے لئے صفحہ ہستی پر نمودار کیے گئے تھے یہ انہوں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اس میں اُن سے ایسی خطا سرزد ہوئی ہے جس کی سزا نہایت ہولناک ہونی چاہیئے۔ گلاب کی الفت میں باغ لگائے چمن بنائے، مالی محافظ بسائے، پانی کھچوائے اور زمین کے تختوں کو سیراب کیا، پھولوں کی ٹہنیوں کے سامنے اپنے تخیل کے ذوق کو سجدے کرائے۔ مگر اپنے تصور کو اتنی آزادی نہ دی کہ وہ اس کائنات کے ہر پھول تک جاتا۔ اُن لوگوں کو یہ نصیب نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے۔ خودرو پھولوں کو دیکھتے جن کا مالی خدا ہے۔ جن کا چمن صحرا ہے جن کی سیرابی قدرتی سیلابی سے ہے۔ ان میں ایک

# کیکر تھا

کیا چپ چاپ تھا۔ کیا مضبوط و توانا تھا۔ اس کی شاخیں دیکھی ہوتیں، اس کی پتیوں پر غور کیا ہوتا۔ گلاب کی ٹہنی میں کیا رکھا ہے۔ ایک کمزور لچکنے اور ٹوٹ جانے والی شاخ ہے جس کو آج کل کے

# شہزورِ زمانہ

یں بقول ڈاروِن، رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ وقت اُن کی زندگی کا ہے جو ہوا دشا یام
کامقابلہ کرسکتے ہیں جن کے اعضاء دوسروں کے کام آتے ہیں۔ کیکر کی چھال مفید
جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑیاں جلانے میں
انسان کی مدد کرتی ہیں۔ کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر کی
پھلیاں بھی چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں۔

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو تو گلقند کھلاؤ۔ ہیضہ ہو جائے تو
گلاب پلاؤ۔ مرجاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔ اور بھی کوئی کام اس منحوس وجود سے نکلتا ہے۔

گلاب کے کانٹوں کو دیکھو کیسے دھوکہ باز ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے۔ ہاتھ لگاتے ہی چبھ
جاتے ہیں۔ کیکر کے کانٹے دُور سے نظر آتے ہیں۔ کیا مجال کہ بے خبری میں کسی کو ستائیں۔

گلاب کے کانٹے سوکھ جائیں تو پھینک دینے کے قابل۔ کیکر کے کانٹے سوکھ کر گھروں
اور کھیتوں کی حفاظت کریں۔ اس طرح یہ کہ کیکر کا کانٹا کیسا سیدھا سادا اور نکیلا ہوتا ہے
رنگ دیکھو تو وہ بھی انوکھا۔ نرالا۔ شاعروں کے گلاب کو یہ بات کہاں میسر؟

گلاب کے درخت میں پتے بالکل بدشکل اور بیکار۔ کیکر کی پتیوں کے کیا کہنے
کیسی چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پتیاں ہیں کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا۔ گلاب کا پھول ایکدن کی تیز
دھوپ میں کمہلا اور مُرجھا جاتا ہے اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔
اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلہ میں زندہ سلامت رہے۔

گلاب کا پھول سرخ یا سرخی مائل اور ایسا کچا کہ مالیوں کی استادی سے رنگ
بدل دیتا ہے مالی جس کو چاہیں سرخ رکھیں جس کو چاہیں سفید بنا دیں۔

کیکر کا پھول اپنے رنگ میں پختہ۔ سارے جہان میں ایک ہی زرد رنگ۔ کیا مجال

جو کوئی شخص اس کے رنگ کو بگاڑ سکے۔

شاعر کہتے ہیں گلاب کے پھول سے معشوق یاد آتا ہے۔ میں کہتا ہوں کیکر کے پھول سے عشق یاد آتا ہے جس سے انسان کی رنگت زرد ہو جاتی ہے۔

اب بتاؤ عشق اچھا یا معشوق۔ عشق نہ ہوتا تو نہ عاشق کو کوئی پوچھتا نہ معشوق کی کچھ وقعت رہتی۔ یہ عشق ہی کی بدولت سب بستیاں آباد ہیں۔

ارے نادان تجھے شاعروں سے کیا کام۔ پہلے اپنے وجود کے تخیلات کو درست کر۔ ان میں فطرت شناسی کا ملکہ نمودار ہونے دے۔ آج گلاب کو چھوڑ کر کیکر کے آگے جھومتا ہے۔ کل اس کو بھی چھوڑیو۔ کسی اور پیکر کے جلوہ میں دھیان جمائیو۔ ساری دنیا میں کانٹے پھیلے ہوئے ہیں، کس کس جگہ جھاڑو دے گا۔ خود جوتی پہن لے اور راستہ چلنے لگ۔ ہاں تو حق پر ہے۔ ہاں یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو منزل جاناں تک جاتی ہے۔ من و تو کا حجاب اٹھا۔ اس کے بعد خود اپنی خودی کا پردہ کھول کر اندر گھس جا۔ پھر یہ آواز نہ آئے گی کہ

گلاب تمہارا اور کیکر ہمارا

# اُوس

از توحید ۸۔ اگست ۱۹۱۳ء

میں شبنم نہیں کہتا۔ یہ فارس والوں کا لفظ ہے۔ فارس پر ادبار کی اوس پڑ چکی۔ وہ وقت اب کہاں جب ایران کے چمن آباد تھے۔ سعدی و حافظ کی حقیقت شناس نظریں پھولوں کی ڈالیوں اور گھاس کی پتیوں پر شبنم کی بہاریں دیکھتی تھیں۔ اب تو روسی ظالموں کے جور و ستم سے بیوہ اور یتیموں کی آنکھیں قطرات شبنم کی مثل

آنسوؤں کی اوس پلکوں پر جاتی ہیں۔
برسات کے موسم میں کوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا خواستگار ہے۔ کسی کو اودی اودی کالی کالی گھٹائیں پسند ہیں۔ کسی کا دل بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے مست ہوجاتا ہے مجھکو تو برسات کی یہ ادا بھاتی ہے کہ مینہ برس کر کھل جاتا ہے اور صاف آسمان کی رات گزر جاتی ہے تو صبح کے وقت درختوں، پھولوں اور جنگل کی گھاس کی عجیب شان ہوتی ہے۔ اوس کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر ایسے چپ چاپ نظر آتے ہیں جیسے رات کو آسمان کے تارے تھے۔ کیا خبر ہے کہ رات کے وقت تارے ٹوٹ پڑے ہوں اور یہ انہی کی گل افشانیاں ہوں۔
کہتے ہیں کہ اوس میں سونا، اوس میں پھرنا جسم انسانی کے لئے مضر ہے خبر نہیں یہ کیوں کہتے ہیں۔ خدا کی ساری مخلوق تو اوس باری سے تروتازہ اور نہال ہوجاتی ہے تو انسان بھی ایک مخلوق ہے اس کو اس سے کیونکر نقصان پہنچ سکتا ہے۔
یہ تو سائنس والے بتائیں گے کہ اوس کیا چیز ہے، کہاں سے آتی ہے کیوں آتی ہے۔ فقیر تو اتنا جانتا ہے کہ اوس قدرت ربانی کا ایک عجیب و غریب جلوہ ہے جن کی آنکھ بہت سویرے بیدار ہونے کی عادی ہے وہ صبح کے وقت سورج نکلنے سے پہلے اوس میں ذات الٰہی کے ہزاروں جلوے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا کہ باغ میں جوئی کے پھولوں کے پاس جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا اور ایسا مستغرق تھا کہ دنیا ومافیہا کی خبر نہیں تھی۔ درحقیقت جوئی کے پھول پر اوس کا انداز قیامت کا ہوتا ہے۔ چھوٹا پھول، نازک پتیاں اور اس پر اوس کی ننھی ننھی بوندیں حس و حرکت کرنے والے دل کے لئے دَورِ محشر سے کم نہیں۔ اوس کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ رات کو پیدا ہوتی ہے اور سورج نکلتے وقت مر جاتی ہے۔ اوس کی سیرابی باران رحمت کی طرح ہر خاص و عام چھوٹے بڑے اونچے نیچے کے لئے یکساں مفید ہے مگر مینہ سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ بادل

کے لشکر لاتا ہے تو آفتاب کو پوشیدہ ہونا پڑتا ہے مگر اوس بیچاری بڑی ڈرپوک، صلح کل ہے
آسمان پر جب سورج کا عمل دخل نہیں رہتا اور بادل بھی اپنے گھروں میں چلے جاتے
ہیں، اسوقت یہ نمودار ہوتی ہے اور سورج کے نکلنے کے ساتھ ہی جان دے دیتی ہے۔

## اوس کی شکایت

انسان اگر یہ شکایت کرے تو حق بجانب ہے کہ اوس تمام در و دیوار کو شجر و حجر کو تر
کر دیتی ہے۔ مگر کسی پیاسی زبان کی تشنگی دور نہیں کر سکتی۔ اردو زبان میں ایک مثل ہے
کہ اوس جب پڑتی ہے تو ہاتھی بھیگ جاتا ہے، گویا ہاتھی اوس میں نہا لیتا ہے مگر چڑیا
کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہ قدرت کا ایک نہایت گہرا راز ہے۔ اس میں اوس کی کچھ شکایت
نہ کرنی چاہیئے۔ بہر حال اللہ تعالےٰ کی نشانیوں میں سے اوس بھی ایک نشانی ہے
جس کو دیکھ کر دلِ حق پرست میں عرفانِ یزدان کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

## رمضان میں سیاہ و سفید ڈورے کی رہنمائی

از توحید ۱۶۔ اگست ۱۹۱۳ء

دنیا کی سب سے بڑی کتاب میں رمضان کی نسبت خدا نے فرمایا ہے۔ کہ تم
پر رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں دن کو روزہ رکھو اور رات کو کھاؤ اور پیو جبتک
کہ صبح کا سفید ڈورا کالے ڈورے سے نمایاں نہ ہو جائے۔ اہل فقہ کہتے ہیں کہ صبح کاذب
کے بعد جب صبح صادق نمودار ہونے لگے تو کھانا پینا ترک کر دینا چاہیئے۔ ایک جماعت
نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ صبح صادق جب ہوتی ہے کہ نورِ سحر کے
سبب آنکھ کالے سفید ڈورے میں تمیز کرنے لگے۔

یہ تو اہلِ علم کے مسائل ہیں۔ گدڑی پوش بے نوا کو یہ بحث مقصود نہیں ہے۔ وہ تو قرآن بھیجنے والے کی اس ادا کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے جو خیط ابیض اور خیط اسود یعنی سفید کالے ڈورے کے الفاظ میں نظر آتی ہے۔

اگر زخمی دل والوں اور تیر خوردہ جگر کو معلوم ہو جاتا کہ روزے کی سحری میں نور و ظلمات کے کرشمے دکھائے جاتے ہیں اور رخ و زلف کے جلووں سے رہنمائی ہوتی ہے، تو ساری عمر روزہ ترک نہ کیا جاتا اور غالباً یہی وجہ ہے جو بعض مست الست بارہ مہینے لگاتار روزے رکھتے ہیں۔ ان پر انہی کالے سفید ڈوروں نے ڈورے ڈالے ہیں۔ خلقت ولایتی گھڑیوں، گولوں اور نقاروں پر آسرا جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ ہزار میں شاید ایک آدمی کو بھی سحری کے وقت خدا کی بتائی ہوئی گھڑی کا خیال نہ آتا ہوگا۔

اگر مجازی حیثیت سے ہی صبح کاذب اور صبح صادق کو محض وقت سحری معلوم کرنے کے لئے دیکھا جائے تو وقت سحر کے ہزاروں جلوے آسمان پر نظر آئیں۔

چشمِ حقیقت ان سیاہ و سفید ڈوروں میں رات دن کی سیاہی و سفیدی سے علیحدہ ایک چیز دیکھتی ہے۔ اس لئے اس کو رمضان کی سحری میونسپل کمیٹی کی ممبری، چھوٹے لاٹ کی کونسل کی ممبری، بڑے لاٹ کی کونسل کی ممبری۔ اس سے بھی آگے عہدہ ججی اور اگر میسر آئے تو منصب وائسرائے یا وزیر ہند۔ اس سے بھی بڑھ کر ہفت اقلیم کی بادشاہی سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

دنیا کے حریص بادشاہوں اور امیروں سے کہو کہ اپنی طمع کاریوں کو چھوڑ دیں اور پچھلی رات بیدار ہو کر کالے سفید ڈوروں کی بہار دیکھیں کہ کیونکر رات کی تاریکی میں نور کی سپیدی نمودار ہوتی ہے اور اس ظہور کے وقت دل کو اگر اس میں حس ہو، کیسی لذت آتی ہے۔ اگر وہ اس لذت کا ایک بار بھی معائنہ کریں تو دنیا کے

کے لشکر لاتا ہے تو آفتاب کو پوشیدہ ہونا پڑتا ہے مگر اوس بیچاری بڑی ڈرپوک، صلح کل ہے آسمان پر جب سورج کا عمل دخل نہیں رہتا اور بادل بھی اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں، اسوقت یہ نمودار ہوتی ہے اور سورج کے نکلنے کے ساتھ ہی جان دے دیتی ہے۔

## اوس کی شکایت

انسان اگر یہ شکایت کرے تو حق بجانب ہے کہ اوس تمام در و دیوار کو شجر و حجر کو تر کر دیتی ہے مگر کسی پیاسی زبان کی تشنگی دور نہیں کر سکتی۔ اردو زبان میں ایک مثل ہے کہ اوس جب پڑتی ہے تو ہاتھی بھیگ جاتا ہے، گویا ہاتھی اوس میں نہا لیتا ہے مگر چڑیا کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہ قدرت کا ایک نہایت گہرا راز ہے۔ اس میں اوس کی کچھ شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ بہر حال اللہ تعالےٰ کی نشانیوں میں سے اوس بھی ایک نشانی ہے جس کو دیکھ کر دلِ حق پرست میں عرفانِ یزدان کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

## رمضان میں سیاہ و سفید ڈورے کی رہنمائی

از توحید ۱۶۔ اگست ۱۹۱۳ء

دنیا کی سب سے بڑی کتاب میں رمضان کی نسبت خدا نے فرمایا ہے۔ کہ تم پر رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں دن کو روزہ رکھو اور رات کو کھاؤ اور پیو جبتک کہ صبح کا سفید ڈورا کالے ڈورے سے نمایاں نہ ہو جائے۔ اہل فقہ کہتے ہیں کہ صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق نمودار ہونے لگے تو کھانا پینا ترک کر دینا چاہیئے۔ ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ صبح صادق جب ہوتی ہے کہ نور سحر کے سبب آنکھ کالے سفید ڈورے میں تمیز کرنے لگے۔

یہ تواہلِ علم کے مسائل ہیں۔ گدڑی پوش بے نوا کو یہ بحث مقصود نہیں ہے۔ وہ تو قرآن کھینچنے والے کی اس ادا کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے جو خیط ابیض اور خیط اسود یعنی سفید کالے ڈورے کے الفاظ میں نظر آتی ہے۔

اگر زخمی دل والوں اور تیر خوردہ جگر کو معلوم ہو جاتا کہ روزے کی سحری میں نور و ظلمات کے کرشمے دکھائے جاتے ہیں اور رخ و زلف کے جلووں سے رہنمائی ہوتی ہے، تو ساری عمر روزہ ترک نہ کیا جاتا اور غالباً یہی وجہ ہے جو بعض مست الست بارہ مہینے لگاتار روزے رہتے ہیں۔ ان پرانی کالے سفید ڈوروں نے ڈورے ڈالے ہیں۔ خلقت ولایتی گھڑیوں، گولوں اور نقاروں پر آسرا جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ ہزار میں شاید ایک آدمی کو بھی سحری کے وقت خدا کی بتائی ہوئی گھڑی کا خیال نہ آتا ہوگا۔

اگر مجازی حیثیت سے ہی صبح کاذب اور صبح صادق کو محض وقت سحری معلوم کرنے کے لئے دیکھا جائے تو وقت سحر کے ہزاروں جلوے آسمان پر نظر آئیں۔

چشم حقیقت ان سیاہ و سفید ڈوروں میں رات دن کی سیاہی و سفیدی سے علیحدہ ایک چیز دیکھتی ہے۔ اس لئے اس کو رمضان کی سحری میونسپل کمیٹی کی ممبری، چھوٹے لاٹ کی کونسل کی ممبری، بڑے لاٹ کی کونسل کی ممبری۔ اس سے بھی آگے عہدہ ججی اور اگر میسر آئے تو منصب وائسرائے یا وزیر ہند۔ اس سے بھی بڑھ کر ہفت اقلیم کی بادشاہی سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

دنیا کے حریص بادشاہوں اور امیروں سے کہو کہ اپنی طمع کاریوں کو چھوڑ دیں اور پچھلی رات بیدار ہو کر کالے سفید ڈوروں کی بہار دیکھیں کہ کیونکر رات کی تاریکی میں نور کی سپیدی نمودار ہوتی ہے اور اس ظہور کے وقت دل کو اگر اس میں حس ہو، کیسی لذت آتی ہے۔ اگر وہ اس لذت کا ایک بار بھی معائنہ کریں تو دنیا کے

یہ تمام جھگڑے فساد مٹ جائیں. مگر وہ سیاہ سفید ڈورے والے جناب تو خیر و شر کے قبضہ دار ہیں۔ وہ کب گوارا کریں گے کہ آنکھ اُن کی شان کو دیکھ کر لطف اٹھائے.

# گیان کتھا

از توحید ۱۶۔ستمبر ۱۹۱۳ء

اپنے گیانی دیس ہندوستان کو کیا کہوں، بدیسی سنگت سے اگیانی ہوگیا. یونیورسٹی کی کتابوں میں صبر و سنتوش. شانتی و اطمینان کا راستہ ڈھونڈھتا ہے۔

کل پچھلی رات آکاش بانی صدلئے ہو میرے کان میں آئی۔ کہا۔ علم کاغذی کتاب میں نہ دیکھ سنسار کائنات ہستی موجود کا ورق کھول. اس میں دھیان کر اور گیانی بن۔ میں نے کہا لو آ اور مجھکو پڑھا۔ میرے پرم گیان پرکھو. عالم اسرار خداوند نے اس کو مانا اور مجھپر نازل فرمایا.

پانی دیکھنے میں ایک مگر مزا سمندر کا کھاری، کنوئیں دریا کا میٹھا. گلاب کی جڑ اور تخم ایک لیکن پھول پتے کانٹے میں جدائی. پانی کی افراط درخت کو گلا دیتی ہے مگر کنول کے پھول کی زندگی لبریز پانی سے ہے۔

تو دیکھ! بگلا سفید ہے، کوئل کالی ہے، طوطا سبز ہے۔ تو سُن! انجن کی سیٹی کان کو ناگوار ہے اور پیانو کے نغمے دلنواز. تو چکھ! املی کھٹی ہے، نیم کڑوا ہے. گھر سے نکل! پہاڑ اونچے ہیں، زمین نیچی ہے. دریا بہتے ہیں. کنارے ساکن ہیں. غور کر! سورج نکلتا اور روز چھپ جاتا ہے. رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں نور و ظلمت کی دو حکومتیں پلٹ جاتی ہیں

## یہ کیوں ہے؟

تیرے صبر و قرار کے لئے سنسار بیقرار ہے. شعلے بھڑکتے ہیں. دریا بہتے ہیں.

سمندر موجیں مارتا ہے، ہوا چلتی ہے، بادل آتے جاتے برستے برساتے ہیں بجلی چمکتی کڑکتی ہے۔ بوندیاں اعلیٰ سے اسفل ہوتی ہیں تاکہ تیرا وجود انقلاب ایام سے گھبرا نہ جائے اور جانے کہ گردشِ ہر موجود کی ڈیوٹی ہے، بدلنا ہر حالت کا اقتضا ہے۔ سمندر ہلتا اور نشیب فراز کے عالم اپنی صحت کی خاطر برداشت کرتا ہے ورنہ اس کا پانی سڑ جائے۔ ندیا اپنی زندگی کے لئے رواں دواں ہے ورنہ تالاب کا گندہ پانی کہلائے۔ ہوا نہ چلے تو کمزور، زہریلی اور بھاری ہو جائے۔ شعلۂ آتش نہ بھڑکے تو دھوئیں کی تاریکی میں نابود رہے۔ بادل نہ برسیں تو دوسرے سال سمندر میں ابخرے پیدا نہ ہوں اور ان کی نسل منقطع ہو جائے۔ بجلی چمکنا گرجنا چھوڑ دے تو فلک کے اعیانِ اشراف میں بے آبرو ہو جائے۔ بوندیاں خاک کی پامالی سے انکار کریں تو ابرِ رحمت کے خطاب سے محروم کر دی جائیں۔

انسان! آدمی!! خیال کر جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کے لئے متحرک ہے تو تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر، عمل کر، گیان۔ موکش۔ نجات۔ سرورِ ابدی عمل و حرکت میں ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ہر حرکت میں برکت ہے۔

## دنیا کی بنیاد خوشی و راحت پر ہے

دیوانہ ہوا ہے۔ زندگی کو آلام و مصیبت کی پوٹ سمجھتا ہے۔ تو کیسا نادان ہے۔ میں نے نیچر و فطرت کی بنا خوشی و راحت پر رکھی ہے جب تو بیمار ہوتا ہے یا ابر سورج پر آ جاتا ہے یا دریا کنارے سے اُبل پڑتا ہے۔ تو تو صحت۔ روشنی اور سیلاب سے سلامتی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تکلیف میں ہوں۔ مگر بیماری کے جاتے رہنے، بادل کے پھٹ جانے۔ طوفان کے تھم جانے سے کیا کوئی نئی چیز حاصل ہوتی ہے۔ بیماری گئی تو وہی تندرستی آئی جو پہلے تھی۔ بادل پھٹا تو وہ سورج چمکا جو پہلے اسی طرح چمکا کرتا تھا۔ طوفان رُکا۔ دریا سمٹا تو

وہی کنارہ نظر آیا جو ہمیشہ خشک رہا کرتا تھا۔ کوئی نئی چیز تجھ کو حاصل نہیں ہوئی اس کو سوچ میں نے تجھکو تندرست، بشاش مطمئن پیدا کیا ہے۔ تیرے اعمال تیرے کرم تجھکو تکلیف دیتے ہیں جو عارضی ہوتے ہیں اور اس کا دور ہونا اور اصل بنیاد کا از سر نو نمودار ہونا، میرا اٹل قانون ہے اس واسطے عارضی تکلیفات سے مضطرب اور مایوس نہ ہوا کر۔

پھانس نکلنے کو چبھتی ہے۔ پیاس بجھنے کو لگتی ہے، بھوک پیٹ بھرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے جب کانٹا چبھے تو سمجھ لے کہ اس کو ایک وقت نکلنا ہے۔ بھوک پیاس کی خواہش ہو تو خیال کر کہ کھانا پانی ملنا لازمی ہے۔ بیماری آئے تو یقین کر کہ تندرستی بھی اس کے ساتھ ہے۔

میں نے آدم کو اپنے وجود محیط الکل کا آئینہ بنایا ہے۔ اس میں میری کبریائی دیکھ۔ میری رعنائی اور قہاری مشاہدہ کر، میری رحمدلی وملنساری کو محسوس کر۔ اسرار مخفی کے نمود وظہور کی خاطر یہ کارخانہ بنا ہے۔ ان کو نمودار ہونے دے جب تو آئینہ ہے تو میرے ہاتھ میں رہ اور جو کچھ تجھ میں نظر آئے اس میں دخل انداز نہ ہو۔

معبود وعبد نواز کے اس القا کے بعد میں نے اپنے جسم، اپنی قوم کے جسم، اپنے ملک کے جسم اور اعضاء سے خطاب کیا جو حوادث ایام سے آشفتہ تھے اور روح سے نادانی کے مطالبات کر رہے تھے اور کہا ظہور صفات کے کرشموں سے ہراساں اور مایوس نہ ہو اور اپنے رب پر توکل و اعتماد سیکھو جس میں راحت و ایمان ہے۔

# ہردواری گنگا کے کنارے چنتامن مورتی

از توحید ستمبر ۱۹۱۳ء

کیسا اچھا وقت تھا جب اس مضمون کا لکھنے والا ننگے پاؤں، ننگے سر، بغل میں جھولی، کندھے پر کمبل، ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہردوار میں ہر کی پیڑی کے سامنے گنگا کے عالم آب کی بہا

دیکھ رہا تھا اور اپنے من کے اندر کی گنگا کی سیر بھی کر رہا تھا۔

دریا لہریں مارتا، نہانے والوں کے میل کچیل کو صاف کرتا، پختہ سیڑھیوں کو گلے لگاتا، اٹھکھیلیاں کرتا ہوا جا رہا تھا اور رنیر بہ رہا تھا۔

مجھکو عالم محویت و استغراق میں دیکھ کر ایک سادھو مورتی ادھر آن نکلی۔ میں سمجھا کوئی پجاری ہے اس لئے توجہ نہ کی اور منہ پھیر لیا۔ کیونکہ تین روز سے پجاریوں نے میرے اطمینان کو غارت کر رکھا تھا۔ اجنبی دیکھ کر نذرانے مانگتے تھے اور سکوت کے لطف کو برباد کرتے تھے۔

سادھو دانا تاڑ گئے اور بولے۔ گنگا جی کی لہروں میں دُکھ سُکھ دونوں ہیں۔ دُکھ سے گھبرانا سُکھ سے ہاتھ اُٹھانا ہے۔

کانوں کو اس مزیدار بات نے متوجہ کر لیا۔ مڑ کر دیکھا عجب مستانی صورت تھی۔ ساٹھ ستر برس کی عمر مگر آنکھیں عہد شباب کی مستی سے مخمور۔ چہرہ ماہتاب کی مانند پُر نور۔ میں بولا۔ جا بابا اپنا کام کر۔ یہاں دکھ سکھ سے غرض نہیں۔ ہر کا نام سنا تھا۔ دوار کے لفظ نے بیتاب کیا تھا ادھر بھی آ گئے۔ دکھ سکھ کا قصہ اُن کو سُنا جنھوں نے یہ سامنے کا کتبہ لگایا ہے جس میں گنگا جی کے مناقب ہیں۔ سادھو نے منہ پھیر کر اس پتھر کو دیکھا جس پر اردو زبان میں گنگا کی تعریف کے اشعار کندہ تھے۔ اور ہنسکر میری طرف متوجہ ہوا اور کہا۔ ان لکیروں سے تو مجھکو بھی کچھ سروکار نہیں۔ اپنی جھولی کو ٹٹولو اس میں کیا ہے۔

میں نے کہا اس کو نوٹ بک کہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے تو اس میں کچھ لکھ لیتا ہوں۔ کہنے لگا اس کے پانچویں ورق میں کیا یادداشت لکھی ہے؟ اس سوال نے متعجب کیا۔ نوٹ بک نکالی۔ دیکھا لکھا تھا۔ ہر دوار یا رشی کیش میں کوئی کام کا فقیر ملے تو اس سے خواب کا بھید دریافت کرنا چاہیئے۔

سادھو کے مکاشفے سے حیرانی ہوئی۔ مگر اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ میں نے

وہ ورق دیکھا آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

بولے. ہاں. میں اسی لئے آیا ہوں. تم ابھی بیدار ہو اور دنیا کے بیدار کرنے کا گھمنڈ دل میں ہے. اس کو چھوڑ دو۔ آنکھیں بند کر دو۔ تاکہ نیند کا طلسم کھل جائے۔

میں نے کہا کس کا سونا کیسا جاگنا. بات کو چکر میں نہ ڈالو. میں نے بہت سی آنکھیں دیکھی ہیں جو کہنا ہو صاف صاف کہو. فرمایا. گنگا میں اشنان کیا؟ عرض کی کئی بار فرمایا کچھ دیکھا؟ کہا کچھ نہیں. ارشاد ہوا اب نہاؤ. دل میں خطرہ گذرا کوئی چور نہ ہو. کمر کی نقدی کو بھانپ کر کپڑے اتروانا چاہتا ہو اس لئے عذر کیا کہ اس وقت نہیں نہاؤنگا. بولے. اچھا جانے دو. دل کو شبہہ کے گناہ سے بچاؤ اور لو سنو. کان میں کچھ کہوں میں نے سر جھکا دیا اور سادھو آنا نے خواب کی نسبت کچھ کہا.

بات معمولی تھی جس کو میں اکثر سوچا کرتا تھا مگر اس انداز کی تھی کہ جی بیقرار ہو گیا فرمایا. لو جاتے ہیں اور اٹھکر چلنے لگے. میں نے بے اختیار ہو کر دامن پکڑ لیا اور عرض کی نام بتاتے جایئے, ٹھکانے کا نشان فرمایئے تاکہ پھر درشن ہو جائیں. بولے چنتامن اس مورت کا نام ہے اور مقام کا کچھ ٹھیک نہیں. آج یہاں کل وہاں. ہردوار میں دھوکہ بازوں سے بچنا. رشی کیش جاؤ تو وہاں بھی اچھی صورت پر فریفتہ نہ ہو جانا. بہت سے دکاندار فقیری لباس میں ملیں گے مگر جو بات کان میں کہی ہے اس کو یاد رکھو گے تو گنگا کنارے آنے کا پھل مل جائے گا۔

گنگا جس کا نام ہے وہ یہ دریا نہیں جو پانی کی صورت میں رواں دواں نظر آتا ہے. گنگا کی عظمت کو اس خیال سے کیا سروکار جو نئی روشنی کے لوگ مادی صورت میں پیش کیا کرتے ہیں. گنگا کی حقیقت بڑے سوچ بچار سے معلوم ہوتی ہے یہ کہا اور چل دیئے.

سچ کہا گنگا اور جمنا دو دریا نہیں دو مقام ہیں مگر بہنے والے اور کنارے سے بن بولے چلنے والے.

# انگلی کا کشف

(از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۲ء)

دل و دماغ اور روح کا کشف سب نے سنا ہوگا۔ انگلی کا کشف عجیب ہے مگر اُن کے لئے جو انسانی اسرار سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ اس بولتی چالتی مورت میں اللہ میاں نے کیا کیا بھید رکھے ہیں۔

کشف کے منکر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی انسان میں کشف غیب کی طاقت نہیں۔ یہ جو اولیاء اللہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کو کشف کے ذریعہ امور مخفی معلوم ہو جاتے ہیں، سب غلط اور توہم پرستی ہے۔

لیکن ہمیں انکار اقرار سے کیا سروکار۔ ہم تو کشف پر عقیدہ رکھنے والے لوگ ہیں جو قصہ اس قسم کا سنتے ہیں ایمان تازہ ہوتا ہے اور اسرار باطنی کی عظمت بڑھتی ہے۔

دہلی میں میرے ایک دوست ڈاکٹر سراج الدین نامی ہیں حبش خاں کے پھاٹک میں مطب کرتے ہیں طبی اور جراحی قابلیتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ باعتبار مشرب اہلحدیث یعنی غیر مقلد ہیں لیکن ان کی عادات و خصائل سچے اور پکے درویشوں کی سی ہیں۔ یعنی بے طمع، سادگی پسند، فقیر دوست، صلح کل۔ ہزاروں غریب ان سے فیض پاتے ہیں۔ قصہ مختصر چار صدی اول کے درویشوں کا نمونہ ہیں۔ افسوس انتقال کر گئے میں بیمار تو زیادہ ہوتا ہوں مگر علاج زیادہ نہیں کرتا اور کرتا ہوں تو اس غیر مقلد درویش کا۔ خدا تعالیٰ نے بھی ڈاکٹر صاحب کی صادق بندگی کو محروم نہیں رکھا اور ہاتھ میں وہ اثر دیا ہے کہ ان کے بیمار عموماً اچھے ہو جاتے ہیں اور سب سے عجیب کمال یہ عطا ہوا ہے کہ ان کی انگلیوں کو کشف ہوتا ہے جسم کو ٹٹول کر بتا دیتے ہیں کہ

یہاں پھوڑا ہے۔ اتنا بڑا۔ اتنا گہرا اور اتنی پیپ اس کے اندر ہے۔ اتنے عرصہ میں اس کا مواد پختہ ہو جائیگا۔ بظاہر یہ امر ایک معمولی معلوم ہوتا ہے۔ ہر جراح اور تجربہ کار ڈاکٹر اس قسم کی باتیں بتا سکتا ہے۔ مگر تعجب تو اس کا ہے کہ کبھی ان کی رائے غلط نہیں ہوتی بڑے بڑے سند یافتہ ڈاکٹروں کے مقابلہ میں ان کی رائے درست نکلتی ہے اور ایسی درست کہ ذرہ برابر فرق نہیں رہتا۔ دہلی و بیرونجات میں جن لوگوں کو ان سے سابقہ پڑا ہے وہ ایسے سینکڑوں واقعات جانتے ہونگے لیکن ابھی حال میں جو معرکہ پیش آیا ہے وہ سب سے عجیب ہے۔ دہلی میں ایک مشہور و معروف ڈاکٹر زید احمد صاحب ہیں جن کو شاید سرکار سے ہزار روپیہ کے قریب ماہوار پنشن ملتی ہے۔ سنا ہے کہ ان کے جسم میں کہیں پھوڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سراج الدین کو بلایا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ پیپ پڑ گئی ہے نشتر لگانا چاہیئے۔ انگریز سول سرجن اور چند دیگر ڈاکٹر بلائے گئے۔ ان سب کی رائے ہوئی کہ پیپ نام کو نہیں، نہ ابھی پھوڑا پکا ہے۔ آخر بڑی حجت اور پورے غور و خوض کے بعد چیرا دیا گیا تو ڈاکٹر سراج الدین کی رائے صحیح نکلی

## رمزِ حقیقت

ڈاکٹر سراج الدین کی یہ قابلیت رمزِ حقیقت ہے۔ خدا تعالیٰ دکھانا چاہتا ہے کہ کسب اور کوشش سے انگلی تک کا شف حقیقت بن جاتی ہے۔ روحانی کشف تو اس سے بھی بڑھ کر کشافِ حقیقت ہوتا ہوگا۔

ڈاکٹر سراج الدین ناراض نہ ہوں، ان کے عقیدہ پر حملہ کرنے کی نیت سے نہیں لکھا جاتا وہ اگر اپنے مشرب اہلحدیث کے سبب کشف کے قائل نہ ہوں تو مضائقہ نہیں۔ ہم ان کی انگلی کے کشف کے دل سے قائل ہیں اور قدرت ایزدی کے کرشموں پر سر ہلانے والے ستانوں کی اطلاع کے لیے اس خبر کو درج کرتے ہیں امید ہے کہ اس

بات کا علم بہت کم لوگوں کے باطنی لطف وطرب کا باعث ہوگا۔

# اینٹ چونے کا وصال

از نظام المشائخ جون ۱۹۱۲ء

ایکدن کا ذکر ہے کہ انبالہ شہر میں کسی شاندار مکان کے اندر آدم کی اولاد جوق جوق جمع ہورہی تھی۔ ہر ابن آدم کا چہرہ بشاش تھا، آنکھیں شگفتہ تھیں۔ گویا وہ کسی ایسی چیز کے دیکھنے کو آئے تھے جو ان کے دل و دماغ پرشوق و اشتیاق کے عالم میں چھائی ہوئی تھی۔

ایک آدم زاد ان میں ایسا بھی تھا جو مکین سے پہلے مکان کے تماشہ میں محو حیرت تھا اور کہتا تھا۔ او مکان! تو مجھسے قد میں بھی بڑا، جسم بھی تیرا بہت چوڑا چکلا مگر زبان بالکل نہیں۔ مجھکو دیکھ سوا دو گز اونچا ہوں لیکن زبان بارہ ہاتھ کی رکھتا ہوں۔ میرے پاس اتنے آدمی مہمان آتے تو خوب جی کھول کر باتیں کرتا۔ اپنی کہتا۔ اُن کی سُنتا۔ تیری طرح ساکت و صامت رہکر یہ نہ کہوا تا کہ میزبان منہ سے نہیں بولتا۔ شاید اس کو مہمانوں کا آنا ناگوار ہوا ہے۔ آدمی کے اس اعتراض کا مکان نے توکچھ جواب نہ دیا البتہ خود اس کے دل نے کہا۔

مَنْ عَرَفَ کَلَّ لِسَانُہٗ جو پہچان لیتا ہے اس کی زبان گونگی ہوجاتی ہے اورکبھی بھید کی بات لب تک نہیں آنے پاتی۔ اس مکان کے جتنے اجزا ہیں سب نے اپنے مقامات فنا سے گزر کر یہ مقام بقا حاصل کیا ہے۔ اب اس کو کیا ضرورت ہے کہ باتونی آدمی کو منہ لگائے وہ آدمی جو دعویٰ اشرف المخلوقات کے باوجود امتحانات فنائی سے دم چراتا ہے اور بغیر امتحان دیئے بقا کی ڈگری مانگنے پر آمادہ ہے۔

آدمی اپنے دل کی اس گفتگو سے خفا ہوا تیوری چڑھائی اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اللہ میاں نے انسان کو سب طاقتیں دیں مگر ایسی کوئی قوت نہ دی جس سے

یہ آستین کا سانپ خیال قابو میں آجاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ذہن میں وہی بات پیدا ہوا کرے جو مجھکو اچھی معلوم ہو۔ یہ نہیں کہ میاں خیال رہیں تو میرے دل و دماغ میں اور تعریف کریں دوسروں کی۔ میں ہاتھ سے کماتا ہوں، پکاتا ہوں، کھاتا ہوں۔ دانت سے چباتا ہوں اور پیٹ سے ہضم کرکے دل اور اس کے تخیلات کو غذا پہنچاتا ہوں، پھر اس کو کیا حق ہے کہ کھائے پئے میرے دسترخوان پر اور مدح سرائی دوسروں کی کرے۔

بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ میں اپنی کوئی حسرت پوری کرنا چاہتا ہوں تو یہ خیال دامن پکڑتا ہے اور دوسری طرف لے چلنے کی ضد کرتا ہے۔ میں عالم تصور میں ایک نقشہ جمانا چاہتا ہوں۔ یہ اس کا رنگ بگاڑ کر دوسرے رخ متوجہ ہوجاتا ہے۔ کوئی ایسی مشین نہ نکلی جس کے ذریعہ سے دل و دماغ کے باشندے خیالات قبضہ میں آجاتے اور آزاد انسان اس نظر نہ آنے والی ہستی کی قید سے رہائی پاجاتا۔

آدمی اتنا ہی سوچنے پایا تھا کہ اس کو صوت سرمدی میں ایک قہقہہ کی آواز آئی کہنے والے نے کہا تسخیر تخیل کی مشین مدت سے موجود ہے۔ تو کہاں تھا۔ کس حال میں تھا جو آج تک اس کی خبر نہ ملی۔ ارے نادان۔ اگر تو ایک دروازے کو مضبوط پکڑ لے، دربدر مارا مارا نہ پھرے تو تیرا دل اور اس میں رہنے والا خیال بھی ہرجائی پنا چھوڑ دے۔ اس مکان کو نظر غور سے دیکھ جس پر بحث کا سلسلہ شروع ہوا ہے کہ جب اس کے منتشر اجزا اینٹ چونا شہتیر ایک مرکز پر جمع ہوگئے۔ کثرت کا نام فنا ہوگیا (یعنی اب کوئی اینٹ چونے کا نام علیحدہ نہیں لیتا سب کے مجموعہ کو مکان کے نام سے پکارتے ہیں) تب اس کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ اشرف المخلوقات آدمی اس کی دید کو جمع ہوئے۔

تو بھی اگر اپنے ارادے و خیال پر قبضہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو حرص و ہوس بغض نفاق کی ہستی کو آتش عشق سے جلا ڈال اور اپنے جذبات پراگندہ کو ایک بنیاد پر جمع کرلے پھر دیکھ کہ خیالات قابو میں آتے ہیں یا نہیں؟

ذرا پھر غور کر. اس مکان میں لکڑی ہے. اینٹ ہے، چونا ہے، لوہا ہے، لکڑی کو فنائی امتحان کے کتنے درجے طے کرنے پڑتے ہیں. اول ہرا بھرا درخت تھا، جنگل میں آزادی خودمختاری سے ٹھنڈی ہوا کھاتا اور پاؤں کے ذریعہ زمین کا پانی پیتا تھا. جب واحسلہ امتحان کا وقت آیا، کلہاڑی سے کاٹا گیا، آری سے چیرا گیا، برمے سے برمایا گیا، رندے سے چھیلا گیا. جب کہیں یہ رتبہ ملا کہ ایک شاندار مکان کا حصہ دار زینت ہے. اینٹ کو دیکھو زمین کا سینہ چاک کر کے کدال اور پھاوڑے مار مار کر مٹی باہر نکالی گئی. پانی ملا کر خوب روندی اور مسلی گئی. سانچہ میں ڈھال کر اس کی ایک شکل مرتب ہوئی مٹی نے ہر چند کہا کہ سب کچھ منظور مگر میرے ہمجنس ذرات خاک کو باہم جدا نہ کرو ایک ہی جگہ رہنے دو. الگ الگ اینٹیں بنائی جائیں گی تو خانۂ وحدت کے ذرے جلا وطن اور خانہ ویران ہو جائیں گے لیکن اس کی فریاد کسی نے نہ سنی یہاں تک کہ وہ دھوپ سے تپ تپ کر خشک ہو گئی. اس کے بعد بیچاری آگ کے گھر میں بھیجی گئی. یا یوں کہیئے کہ ناری قبر میں دفن کی گئی، لوگ اس آتشی مقام سے گذرتے تھے مگر کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس کے اندر کون جل رہا ہے. جب اینٹ پر بیکسی، کس مپرسی اور سوخت کامل کا وقت گذر گیا تو امتحان کی سندیں دی گئیں اور خاکی پیراہن کے بدلے سرخ رنگ کا لباس مرحمت ہوا. ٹھیلے پر سوار کر کے شہر میں لائی گئیں. حوض میں غسل دیا گیا اور ان سب کو جو امتحان سے پہلے ہمجنس کی فرقت سے پریشان تھیں ہم آغوشی کی گھڑی نصیب ہوئی. کنکر زمین کا لخت جگر کدال کی نوک سے پارہ پارہ ہو کر باہر کھینچا. آگ میں بھنا چونہ کہلایا چکی میں پسا پھر کہیں یہ نوبت آئی کہ عرصہ دراز کی فرقت کے بعد اپنی ہموطن اینٹ سے وصال یا بی نصیب ہوئی. اسی طرح لوہا بھی جلنے کٹنے پٹنے کی متعدد منازل کے بعد اس قابل ہوا جو اس مکان میں جگہ پائی.

جب یہ بیجان اشیاء کوفت و سوخت کے بغیر مرکز وحدت و طمانیت پر نہیں آسکتیں تو پھر تو اشرف المخلوقات کہلا کر ان امتحانوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے. تو نے

سُنا بھی! کہنے والا کہتا ہے۔ خام بودم، پختہ شدم، سوختم۔ پہلے کچا تھا، پھر پکا۔ اس کے بعد جل کر منزل حاصل کی یہی کیفیت اینٹ، چونے، لوہے کی ہوئی کہ ابتدا میں وہ بھی کچے تھے۔ پکنے اور جلنے کے بعد وصال نصیب ہوا جس کی خوشی منانے آج اتنے آدم زاد جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح آدمیوں میں جو لوگ خامی سے گذر کر پختگی و سوختگی حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی قبروں پر بھی لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس اجتماع کو عُرس کے نام سے پکارتے ہیں۔ عُرس کا لفظ عروس سے ہے جس کے معنی شادی و خوشی کے ہیں۔ گویا عرس منزل رسیدہ لوگوں کی اصطلاح میں اس موت کی یادگار ہے جو پختگی و سوختگی کے بعد مقام وصال و انتہا تک لی جاتی ہے۔

## نتیجہ

آدمی اور اس کے دل کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب تک امتحان فنا کی تکالیف و مصائب کو برداشت نہ کیا جائے، یوم الوصال میسر نہیں آتا اور خیالات مرکز توحید پر جمع نہیں ہوتے۔

لہٰذا ہم سب کو بھی اسلامی خدمت کے معاملہ میں اس بیجان مگر معصوم ہستی کی مثال بغرض تقلید پیش نظر رکھنی چاہیئے اور مردانہ وار آگے بڑھ کر دکھانا چاہیئے کہ ابن آدم اینٹ چونے سے گیا گزرا نہیں ہے!

# دوائی پیشی کے باطنی اشارے

## آنکھ نے دیکھے کان نے سنے

از نظام المشائخ۔ اگست ۱۹۱۲ء

جب ڈاکٹر انصاری نے اپنے کان میں وہ آلہ چڑھایا جس کو کان کی عینک کہنا چاہیئے،

اور حسن نظامی کے سینے کو دیکھنا شروع کیا تو حسن نظامی کی آنکھ نے ڈاکٹری ساز و سامان سے باتیں شروع کیں اور ان سے کچھ سنا۔ گویا ڈاکٹر صاحب کے کان نے دیکھا اور حسن نظامی کی آنکھ نے سنا۔

ڈاکٹر نے کہا معدہ و جگر میں ورم ہے۔ پھیپھڑا اپنے غنیم امراض کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا۔ اس کو سکون کی ضرورت ہے۔ دماغ ترک مشاغل کا خواستگار ہے یہ نسخہ استعمال کرو اور چپ چاپ ہو کر بیٹھو۔

کان کی تشخیص سے ڈاکٹری زبان تقریر کر رہی تھی مگر اس کے جواب میں حسن نظامی کی آنکھ نے دخل نہ دیا۔ وہ برابر ان اشیاء کو دیکھتی رہی جو میز پر مراقبۂ ربانی پر مصروف تھیں۔

قلم آزادی سے دوات کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹری ہاتھ نے اس کو گرفتار کیا اور کہا لکھ۔ اس نے تعمیل کی اور کاغذ پر حرکت کرنے لگا۔ پوچھا گیا کیا لکھتا ہے۔ بولا کچھ خبر نہیں۔ ہاتھ کا تابعدار ہوں۔ جو چاہتا ہے لکھوا تا ہے۔ ہاتھ کی آواز آئی۔ نہیں میرا اس میں کچھ دخل نہیں، آنکھ کے اشارے سے لکھ رہا ہوں۔ آنکھ نے بگڑ کر کہا۔ کان نے مرض کی شناخت کی ہے وہی لکھوا تا ہوگا۔ کان نے کہا نہیں جناب۔ مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ یہ تو کسی اور طاقت کا کام ہے۔

حسن نظامی اس انکار یہ بحث کو سن رہا تھا کہ نسخہ تیار ہو گیا۔ کاغذی پرزا تھا۔ دوا فروش نے پڑھ کر دو شیشیاں دے دیں جن پر ولایتی لاکھ کی سرخ مہر لگی ہوئی تھی۔

جب یہ شیشیاں گھر میں آئیں، کاغذی خرقے سے برہنہ ہوئیں۔ واحدی صاحب نے بستر بیمار کے قریب لا کر رکھا۔ چاقو منگایا۔ تاکہ بھید کی مہر شیشی کے منہ سے تراشیں تو ایک صدائے سرمدی آنکھ میں آئی۔ پہلے مجھکو دیکھو اور میری سنو۔

کانچ کی معمولی شیشی ہوں۔ دیکھنے میں چھوٹا سا ظرف رکھتی ہوں مگر انسان

اشرف المخلوقات سے زیادہ صاحبِ تحمل و برداشت ہوں۔ اگر آدمی وہ سب دوا ایک ہی دفعہ پی جائے جو میرے اندر ہے، تو مر جائے مگر میں خود زندہ ہوں اور دوسروں کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔

یہ تمہارے منہ پر مہر کیسی ہے؟

ہائیں تم نہیں جانتے۔ باطنی تاثیر کے لئے یہ لازمی ہے کہ سربمہر ہو۔ درویش کے منہ پر سکوت کی مہر اسی غرض سے لگائی جاتی ہے کہ وہ امراض روحانی کی دوا ہے۔ منہ کھلی اور شیشی اعتبار و اعتماد کے درجہ سے گری۔

اچھا تو کاغذی لباس تم کو کیوں پہنایا گیا تھا؟

اس کا جواب بھی سن لو۔ **الناس باللباس**۔ آدمیت کی پہچان لباس سے ہوتی ہے تو میں دائرہ شائستگی سے کس طرح باہر رہتی۔ خرقہ مکتوبی پہن کر نمودار ہوئی تب معلوم ہوا کہ میں کس مرض کی دوا ہوں۔

کیوں بی شیشی! تمہاری شکل تو گوری ہے، اگر تم کالی ہوتیں تو دوا کی تاثیر میں کچھ فرق پڑ جاتا یا نہیں؟

واہ کیا مجھ کو یورپین خیال کر لیا۔ گو میری نمود یورپ میں ہوئی لیکن اصل نسل مسلمان ہوں اور اس پر صوفیانہ عقائد رکھنے والی۔ میرے ہاں گورے کالے کی بحث گناہ ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ باطن صاف ہونا چاہیئے۔ رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر میرا تن سیاہ ہوتا تو دوا کی تاثیر کو کیا نقصان پہنچاتا۔ اصلیت ہم دونوں کی کانچ ہوتی ہے۔ دوا دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔ پھر سیاہ سفید کی محبت سے کیا حاصل؟

درویش کی مہر سکوت ٹوٹ جائے تو پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ تمہاری لاکھی مہر دُور ہو جائے تو بیکار ہو جاتی ہو یا نہیں؟

میری مہرِ سکوت کھلتی ہے تو دوسروں کے فائدہ کے لئے کھلتی ہے۔ ایسا ہی

درویش اگر دوسرے کے فائدہ رسانی کی خاطر سکوت کی مہر توڑ ڈالے تو ہرج نہیں بلکہ مہر لگتی اسی واسطے ہے کہ کسی کے فائدے کے لئے ٹوٹے۔ بیرے منہ پر مہر نہ ہو تو کوڑی کے کام کی نہیں۔ کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ مثلاً اگر کسی حادثہ سے بیرا منہ کھل جائے تو دوا فروش مجھکو پھینک دیتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اب بازار میں اس کا کوئی خریدار نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اندیشہ ہے کہ بیرونی زہریلا اثر اس میں نہ ہو گیا ہو۔ جو بیمار کو نقصان پہنچائے۔ اسی پر درویش کو قیاس کرنا چاہیئے کہ جب اس کا منہ نفسانی و دنیا دی خواہشات کے لئے کھل جاتا ہے تو روحانی اسپتال میں وہ پھینکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

واحدی کو دیکھو ابھی باتیں ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ انہوں نے شیشی کا منہ کھول کر چمچہ میں دوا نکال لی اور اس زبان و حلق کو تلخ کر دیا جس کے پڑوسی آنکھ، کان شیشی کے باطنی اشاروں کا مزیدار لطف اٹھا رہے تھے۔

# وحدتِ سرد کام

## برف

از نظام المشائخ۔ اگست ۱۹۱۲ء

یہ تشنگی آلود ایام کیسی بہار کے ہیں جو لوگ حبس دم کے بھید سے واقف نہیں قدرت ان پر موسمی حبس طاری کرتی ہے۔ اس کے بعد ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھیجکر دیکھتی ہے کہ آزادیٔ حبس سے ان کی زبان پر شکرِ الٰہی جاری ہوا یا نہیں۔ مگر یہ غافل ہستیاں شکریہ ادا کرنے کے بجائے اور غفلت کی طرف جھکتی ہیں۔ یوں تو ہر موسم شان یزدانی کا ایک کرشمہ ہوتا ہے مگر گرم ملک ہندوستان میں ایک بے بہا نعمت ہے جہاں

ہمیشہ سردی رہتی ہے یا گرمی تیز نہیں ہوتی، وہاں کے باشندے اس لطف سے ناآشنا ہیں کہ لُو کی گرم بازاری ہے، پسینے بہہ رہے ہیں، یکایک کسی گھنے درخت کے سایہ میں پہنچے اور خنک ہوا بدن کو لگی۔ بس اس وقت جو کیفیت جسم و روح دیکھتی ہے، وہ زبان یا قلم سے ادا ہونی محال ہے۔ اللہ میاں نے ہر چیز حکمت سے پیدا کی ہے موسم گرما میں بھی ہزاروں اسرار ہیں جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ ان چیزوں کی حقیقت پر غور کر کے ذات باری کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔

اور تو اور ذرا گرمی کے تحفے برف کا خیال کرو کیا صاف شفاف۔ پیاری صورت والی چیز ہے۔ مگر آپ تو اس کو پی جانا جانتے ہیں۔ کبھی اس کے پگھلنے والے وجود کے رموز پر غور نہیں کرتے۔ آیئے آج دو گھڑی اس میں جی بہلائیں۔

## برف کے نکات

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آسمانی، دوسری مصنوعی۔ آسمانی برف اونچے مقامات پر از خود نازل ہوتی ہے۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ وہ ابخرے جو سمندر و زمین سے اٹھ کر اوپر جاتے ہیں اور مینہ کی صورت بن کر دوبارہ زمین پر برستے ہیں وہی ابخرے شانِ الٰہی سے پہاڑوں پر برف کی شکل اختیار کر کے گرتے ہیں اور جم جاتے ہیں۔

نئے زمانہ والوں نے قدرتی برف پر غور کرتے کرتے بناوٹی برف کا بھید معلوم کر لیا مشین کے ذریعہ سے معمولی پانی کے وہ اجزا نکال دیئے جاتے ہیں جن کے سبب پانی میں نرمی اور پتلا پن ہے۔ ان اجزاء کے نکلتے ہی پانی سخت اور پتھر ہو کر ایسا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں ہر شخص اس پر جان دیتا ہے

## برف کے صوفیانہ نکات

اس مختصر بیان کے بعد جس سے برف کی ظاہری حقیقت معلوم ہوئی اس کی

باطنی کیفیت پر توجہ کیجئے۔

جب تک پانی کے اندر نفسانی و کثیف اجزا شامل تھے، اس کے جسم کو قرار و یکسوئی میسر نہ تھی۔ بہتا تھا، ہلتا تھا۔ ذرا سی گندگی سے میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا۔ جو رنگ اس میں ڈالا جاتا فوراً اس کا اثر قبول کر کے وہی رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن مجاہدۂ شمین نے اس کے سارے تفرقہ انداز اجزاء کو فنا کر کے ایسا پکا متحد کر دیا کہ جس رُخ سے دیکھئے ایک ہی شکل نظر آتی ہے۔ اوپر بھی پانی، نیچے بھی پانی، اندر بھی پانی، باہر بھی پانی اور سب خنک و سرد۔ اس کو کہتے ہیں وحدت کا کمال۔ اب اس پر گندگی ڈالئے تو پھسل کر بہہ جائیگی رنگ ڈالئے تو وہ بھی اوپر اوپر اڑ جائیگا۔

صوفی بھی جب برف کی طرح اپنے باطن کو مجتمع کر لیتا ہے تو پھر وہ خواہ کیسے ہی بدنما مقام میں جائے، اس پر کسی برائی کا اثر نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی سن لیجئے کہ برف میں ایسی خنکی کہاں سے آگئی کہ انسان اس کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ حالانکہ جب تک وہ پانی کی شکل میں تھی ہر شخص آسانی سے اس میں ہاتھ پاؤں ڈال سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نفسانی کثافت دور ہو جاتی ہے تو قدرت ایک ایسا جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ پھر ہر کس و ناکس اس پر آسانی سے قبضہ نہیں پا سکتا۔

رہی یہ بات کہ پھر انسان اس کو کاٹ کر اور گھول کر شربت میں ملا کر کیوں پی جاتے ہیں، اس کا جواب صاف یہ ہے کہ جس طرح صوفی دوسروں کی فائدہ رسانی اور تسکین کے لئے پیدا ہوا ہے، اسی طرح برف بھی پیاسوں اور تشنہ کاموں کو تسلی دیتی ہے اور طرہ یہ کہ اپنی ہستی قربان کر کے تسلی دیتی ہے۔

ہائے غفلت شعار آدمی! شیشے کے گلاس میں برف کا ٹکڑا ڈال کر گھونٹ لے رہا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ پارۂ برف تیری خاطر اپنی چمک وار ہستی مٹا رہا ہے

گھلا جاتا ہے او رپانی کو سرد کام کر رہا ہے مگر ابن آدم اس ذات ترحم صفات کا شکرانہ نہیں بھیجتا جس نے کائنات کے بیشمار جلوے اس کے لئے پیدا کئے۔ اول اول تو پروردگار ڈھیل دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ شاید یہ بندہ مجھ کو یاد کر لے۔ مگر جب وہ بےخبری سے باز نہیں آتا تو پھر وہ تماشہ دکھاتا ہے جو ابھی حال میں پیش آیا۔

کہ "ٹیٹانک" نامی جہاز اہل مغرب نے بنایا اور سمجھا کہ اب اس سے بڑا کوئی جہاز دنیا میں نہیں ہے۔ اس میں ہوائی کمرے بنائے تاکہ وہ پانی کے طوفان سے محفوظ رہے اور ڈوبنے نہ پائے لیکن قدرت نے خیال کیا کہ یہ سرکش آدمی یوں نہیں مانیں گے اس واسطے اس نے جہاز کو برباد کرنے کے لئے برف کا ایک ٹکڑا بھیجا جس نے دنیا کے سب سے بڑے جہاز کو ایک ہلکی سی ٹکر مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اب انسانوں کی آنکھ کھلی کہ جس برف کو سوڈے کے پانی میں گھول کر پی جاتے تھے جس برف کو موگری سے کچل ڈالتے تھے اس برف کے ٹکڑے نے سینکڑوں قیمتی جانوں کو سمندر کے کھاری سوڈے میں ملا کر نوش جان کر لیا۔

## جلال وجبروت والے کی ثنا

برف کی یہ گرم کہانی سن کر ان لوگوں کا فرض ہے جو جنگل میں درختوں کے پتوں پر معرفت الٰہی کے دفتر لکھے دیکھتے ہیں کہ اپنے جلال و جبروت والے خدا کی حمد و ثنا کریں۔ اے رب العزت، اے رب الحکمت، اے رب الاسرار جان تجھ پر صدقے، دل تجھ پر واری۔

برف کے گرنے والے ٹھنڈے قطروں کی قسم، ہم ان پر تیرے فیضان کی بہار دیکھتے ہیں۔ یہ قطرے زبان کی پیاس کو بجھاتے ہیں۔ ایسا قطرہ عنایت فرما جو دل کی تشنگی کو سیراب کرے۔

برف ہوا سے بچائی جائے۔ گرم کمبل میں چھپائی جائے تو جلدی نہیں پگھلتی۔ ہم کو اپنی گلیم معرفت کے دامن میں ڈھک لے۔ تاکہ حوادث ایام کی ہوا ہماری روحانی ہستی کو برباد نہ کرنے پائے۔ الٰہی برف کے عذاب سے بچا اور اس کو ہمارے جسم و روح کے لئے عذاب و شیریں کام بنا۔

# دِل ھاؤس

ازنظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۲ء

میاں سنتے ہو؟ دہلی میں گورنمنٹ ہاؤس بنتا ہے۔ دن رات کام ہورہا ہے آنکھیں جاگتی ہیں اور جگائی جاتی ہیں۔ تم بھی اپنا دل ھاؤس بناؤ۔ ویرانے کو آباد کرو گورنمنٹ ھاؤس کا راتوں رات بننا ایک غیر معمولی جلدی کا سبب ہے ورنہ ظاہری عمارات کے بنوانے والے صرف دن کو کام لیا کرتے ہیں لیکن دل ہاؤس ایک ایسی عمارت ہے کہ یہ رات کے اندھیرے ہی میں چنی جاتی ہے جس وقت سارا سنسار سوتا ہے۔ اس وقت پروردگار اور ہاں کے وہ بندے جو دل ہاؤس کی تعمیر کے طلبگار ہیں، جاگتے ہیں۔

گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں بجلی کی روشنی ہے، غل ہے، شور ہے مگر دل ہاؤس کی تعمیر کے واسطے تاریکی اور سکوت کی ضرورت ہے۔ جب گورنمنٹ ہاؤس بنجائیگا۔ اس کے دروازوں پر پہرے دار ہوں گے کہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے لیکن دل ہاؤس ایک ایسا وسیع مکان ہے جس میں کائنات کے تمام جلوے بے روک ٹوک آسکتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں اگر قبریں کھدوا کر پھینک دی جائیں۔ مندروں اور مسجدوں کی مسماری ہو اور وہ تاریخی مقامات جن سے دہلی کا چپہ چپہ

مشہور ہے۔ بے نام و نشان ہو جائیں۔ تب بھی تم اس کی تقلید میں کسی کی دل آزاری نہ کرنا کیونکہ دل ھاؤس کی تعمیر دل داری و دل جوئی کی بنیاد سے شروع ہوتی ہے یہہ ہاتھ سے گئی تو مکان بننا دشوار ہو جائے گا۔ اول تو گورنمنٹ ہاؤس کے بنوا نے والے بھی ایسے ستم شعار نہیں ہیں جو خواہ مخواہ کسی کے دل کو دکھائیں اور مذہبی یادگاروں کو مٹا کر اپنا گورنمنٹ ہاؤس بنائیں اور اگر بفرض محال کوئی ایسی جگہ آ بھی جائے تو کافی معاوضہ دے دیا جائے گا۔ لیکن تمہارے گھر کے دل کی بنیاد ادنےٰ سی دل شکنی میں بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ یہاں معاوضات سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ ہاؤس کے رہنے والے زمین اور اہل زمین کے جسموں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دل ہاؤس کی جہانداری اس سے وسیع ہے۔ اس کا حکم جسم و روح دونوں پر چلتا ہے۔ گورنمنٹ ھاؤس کے اہل کار اور شہریار بھی دل ہاؤس کے تابع فرمان ہیں۔

دل ہاؤس دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک دیسی اور ایک بدیسی۔ دل بیچارہ ایشیا میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں رہتا ہے۔ علی الخصوص مسلمانوں کے سینہ میں رہتا ہے۔ اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں اس کی خوب خاطر داریاں ہوتی ہیں اور اس کے جذبات کی بہت بڑی قدر کی جاتی ہے۔ یہی دل گو یورپ والوں کے سینے میں بھی رہتا ہے مگر وہاں یہہ اپنے گھر کے کام دھندے میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ دوسرے دل سے سروکار نہیں رکھتا۔ اسی واسطے ایشیا والے کہتے ہیں کہ یورپ کا دل خود غرض اور بکار خودی مصروف ہے۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کوئی خود غرض ہو یا نہ ہو، ہم تو اس کو دیکھتے ہیں کہ دل میں اپنے پیدا کرنے والے کی بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ اگر ایشیا والوں میں یہہ بات یورپ

سے زیادہ ہے تو ہمیشہ انہی کا بول بالا ہوگا اور اگر اہل یورپ کے دل واقعی اس نعمت سے محروم ہیں تو ان کے علاقے اجڑ جانے کے قابل ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ دیسی کے بعد بدیسی ہاؤس کو دیکھیئے۔ خبر نہیں لوگوں نے یہ دیسی بدیسی کا کیا جھگڑا لگایا ہے ہاؤس کے معنی انگریزی زبان میں گھر کے ہیں۔ خانۂ دل نہ کہا، بیت القلب نہ پکارا، دل ہاؤس کہدیا۔ مفہوم و مقصود و حقیقت تینوں کی ایک ہی ہے۔ فرق صرف زبان اور بولی کا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ دہلی کو دِل لی کہتے تھے یعنی دل لینے والی بستی۔ اب وہ وقت کہاں۔ نہ دل ہی رہا اور نہ دل لینے والی ہی رہی۔ وہ اجڑ گیا، یہ مٹ گئی، وہ برباد ہوگیا، یہ تباہ ہوگئی۔ شکر ہے کہ انگریزی سرکار نے جھاڑو ہاتھ میں لے کر اس کی صفائی شروع کی ہے۔ شاید کوڑے کرکٹ کے دور ہونے سے اس کی حالت کچھ سنبھل جائے لیکن ابھی تک تو دِل لی کا نام اس پر صادق آنے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔

خدا بخشے میری بیماری کو جس کے طفیل ڈلہوزی پہاڑ پر جانا ہوا تھا۔ ایک انگریزی داں نے کہا ہَوز اور ہاؤس ایک ہی چیز ہے جس کے معنے گھر کے ہیں۔ گویا یہ پہاڑ دل ہاؤس یا بیت القلب تھا۔ کانوں کو یہ نام بہت بھلا معلوم ہوا اور اس لفظ میں اسرار حقیقت کے کرشمے نظر آنے لگے جب اس پہاڑ کی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ بہشت جس کی مومن اور نیکوکار لوگوں کے نام رجسٹری نہیں ہوئی۔ اس میں ہندو مسلمان نیک و بد، ادنےٰ و اعلےٰ بغیر روک ٹوک کے آسکتے ہیں۔ امتحان صرف اتنا ہوتا ہے کہ بادن میل کے پل صراط سے گزرنے کے بعد یہ بہشت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا نام رحمت خداوندی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے کافر و سرکش بندے قیامت کے بعد ابدالآباد دوزخ میں رہیں

تو دنیا میں بھی ان پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا اور ہوٹلوں کے باراحت عیش سے محروم کر دے۔ اور یہ سب اس پہاڑ پر موجود ہیں۔

کیسی بہار ہے، اونچے اونچے پہاڑ خبر نہیں کتنی مدت سے اپنے پروردگار کے سامنے پاؤں باندھے کھڑے ہیں۔ آنسوؤں کے چشمے سے وضو کرتے اور حضوری قلب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، خدا نے بھی ان کے دل کو آباد کیا ہے جدہر دیکھو ہرے بھرے درخت لہلہا رہے ہیں۔ پرندے ٹہنیوں پر بیٹھے نغمہ سنجیاں کر رہے ہیں۔

آدمی بھی جب کوہ وقاری سے یکسو ہو کر خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی یہ خنکی، یہ سرسبزی، یہ شادابی پیدا ہو جاتی ہے جس کو انگریزی اصطلاح میں دل ہاؤس کی آرائش کہنا چاہیئے۔

اور ہاں اس پر بھی توجہ کی؟ پہاڑوں میں انسان کو نشیب و فراز کے راستوں سے کیسی تکلیف ہوتی ہے جب بلندی پر چڑھتا ہے سانس پھول جاتا ہے۔ ہانپتا ہے، لڑکھڑاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اب کتنا راستہ باقی رہ گیا ہے اور جس وقت بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے اس وقت بھی یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں زور و تیزیٔ رفتار میں آس پاس کے کسی کھڈ یا غار میں نہ گر پڑے۔

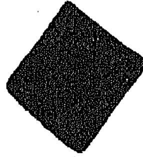
ڈاکٹروں کی رائے میں پہاڑوں پر ترقی صحت کا یہی راز ہے۔ جو لوگ نشیب و فراز کی مشکلات میں شریک نہیں ہوتے، گھر میں آرام سے بیٹھے رہتے یا سواری پر چلتے پھرتے ہیں ان کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ اسی طرح دل ہاؤس کے معماروں کا خیال ہے کہ نفی اثبات کے نشیب و فراز میں چڑھنا اترنا صحتِ باطن کے لئے لازمی ہے۔ اس کی تکلیفات کا خیال کر کے جو لوگ گھبراتے ہیں، ہمیشہ روحانی امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

چڑھو لا الٰہ کی بلندی پر اور اترو الا اللہ کی وادی میں۔ دل ہاؤس کی تعمیر کے لئے موسم رمضان خوب زمانہ ہے۔ جذبات یکسو، ارادے پاکیزہ، نفسانیت کی سرمبازاریاں ان دنوں میں تم بھی اپنا دل ہاؤس بنالو۔ پھر خبر نہیں کل کیا پیش آنے والا ہے۔

دل ہاؤس کا فرنیچر روزہ نماز اور ذکر الٰہی ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے لئے میز کرسی چاہیئے۔ دل ہاؤس کے لئے ایک سجدۂ با اخلاص اور حمد کا ایک سچا جملہ درکار ہے روزے سب رکھتے ہیں مگر جسم کی زبان بھوکی پیاسی رہتی ہے اور نفس کی زبان کھانے پینے سے باز نہیں آتی۔ ایسا روزہ کس کام کا؟ دل ہاؤس کی آرائش چاہتے ہو تو ہُوا و ہوَس کی زبان بند کرو، اس کو روزہ رکھواؤ۔ مسجدیں خوب آباد ہیں۔ نمازیوں کی صفیں بھی بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ کی جگہ کوہ ہمالیہ کی صفوں کی مثل ہوتی ہیں لیکن ان میں اکثر لوگ میز، کرسی، کالر۔ ٹائی۔ بوٹ۔ سوٹ۔ چھری۔ کانٹا۔ نوکری و خدمت گاری۔ غلامی و اطاعت شعاری۔ ممبری اور مجسٹریٹی۔ خان بہادری اور شمس العلمائی کے نشہ میں چور ہو کر اس وعید کے مستحق ہوتے ہیں جو دنیا کے اتر جانے والے عارضی نشہ بازوں کے خلاف حکم قرآن کے پردے میں مخفی ہے پروردگار نہیں چاہتا کہ اس کے بندے غیریت کے نشہ سے مخمور ہو کر حضوری میں آئیں۔ اس واسطے ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو یعنی میرے سامنے نہ آؤ جبکہ تم نشے میں مدہوش ہو۔ سرکش انسان نے سمجھ لیا کہ نشہ نماز سے چھٹکارے کا نام ہے۔ کیونکہ خدا کہتا ہے کہ مخموری میں نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔ کاش وہ ارشاد ربّانی کے ناز محبوبیت تک رسائی پا سکتے اور معلوم کرتے کہ نماز محبوب کی نزدیکی کا نام ہے۔ غیریت کا نشہ پیئں گے تو ہجر و فراق میں پھینک دیئے جائیں گے۔ پس اگر دل ہاؤس کی بنا کو مستحکم کرنا اور اس کی آرائش و زیبائش کو مکمل دیکھنا چاہتے ہو تو رمضان شریف میں ایسی ترشی سے روزہ افطار کرو جو غیریت کے تمام نشے اُتار دے اور تمہارے

دل کو خدا کا گھر بنا دے۔ ورنہ جناب اکبر الہ آبادی کا یہ شعر تم پر صادق آجائے گا۔

خدا کا گھر نہ رکھا دل کو بنگلوں میں مکیں ہوکر
بھلایا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہوکر

## نقطہ  صفر

ازنظام المشائخ۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء

معدوم و نابود چیز کو صفر کہتے ہیں۔ نقطہ بھی اسی شکل کا نام ہے حساب اور اقلیدس و ہندسی رموز دانوں کی خبر نہیں کہ وہ اس محیط بے سر و پا ہستی کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ فقیر کو علم و فضل کی باتیں یاد نہیں۔ اس کو تو یہ بے تعلق تعلق دار نکات سے لبریز نظر آتا ہے۔

کسی نے حرف بے سے کہا تجھ میں اور تے ثے میں کیا فرق ہے؟ صورت تینوں کی یکساں ہے۔ تفاوت فقط اس کا ہے کہ بے کے نیچے ایک نقطہ اور تے کے اوپر دو نقطے، ثے پر تین نقطے؟ بے نے جواب دیا یہی سوال میں نے الف سے کیا تھا کہ جب تو اکیلا تھا تو تیرا مطلب بھی ایک نکلتا تھا لیکن جس وقت تیرے پہلو میں ایک نقطہ بڑھا یا گیا تو معانی دس گنے ہو گئے۔ دوسرا نقطہ اور زائد کیا تو ایک سے سو ہو گئے تیسرا بڑھا تو ہزار بن گئے۔ یہ کیا بھید ہے؟

الف نے جواب دیا۔ خاموش رہ کائنات کی پیدائش کا راز اسی کے اندر مضمر ہے۔ الٰہی گورنمنٹ نے لارڈ کرزن کی سرکار سے پہلے اس راز کو قانون رازداری کی مہر سے مخفی کر دیا ہے۔ زبان سے افشا کا ایک حرف بھی نکلا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

حروف کی باتیں سن کر حسن نظامی نے کہا۔ میں نے لارڈ کرزن کے قانون

رازداری کو ہمیشہ بام سے نیچے گرتے دیکھا۔ اس کی تشبیہ یزدانی قانون سے ناجائز ہے۔ مادہ پرست آدمیوں کے قوانین دو چار دن کے مہمان ہیں اقبال کی آنکھ دیکھتی ہے مگر وہ لب پر نہیں لا سکتے۔ میری آنکھ دیکھتی ہے۔ زبان بولتی ہے اور ہاتھ حرکت کرنے کو تیار ہے کیونکہ اقبال مظہر قال ہے اور بندہ پیکر حال ہے۔

سنو! میں تم سے کہوں۔ یہ صفر جس کو عنوان میں دیکھا، ایک ہولناک انقلاب کا علمبردار ہے۔ بسم اللہ اس کتاب کی ابتدا ہے اور حروف الفاظ کی سب کتابوں سے افضل ہے لیکن اس بسم اللہ کی بھی ایک ابتدا ہے اور وہ بے کا نقطہ ہے۔ اس نقطہ کی تشریح آج کے دن مقصود ہے جس دن تم اس کو پڑھو گے۔ عیدالفطر کو سات آٹھ دن گذر چکے ہوں گے خوشی کا کمال زوال ہوگا۔ لہذا اس مشکل اور باریک مضمون کو ذرا غور سے پڑھنا۔

اللہ، ہمارا معبود اس کے لفظ میں کوئی نقطہ نہیں۔ محمدؐ، ہمارے رسول۔ اس ہیئت میں بھی نقطہ معدوم۔ آخری نجات اور عروج جس ذات پر منحصر ہے، وہ امام ہے وہ بھی بے نقطہ۔ ہندی میں اللہ کو ہر کہتے ہیں اور ہر بھی بے نقطہ ہے۔ اوم بھی اللہ کا نام ہے۔ یہ بھی بے نقطہ دل کہتا ہے تم میرے مقصود کے مفہوم تک اتنے کم لفظوں میں نہیں پہنچ سکتے کھو گئے کیا لکھا۔ ہم نہیں سمجھے۔ دماغ میں کچھ خرابی تو نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف سب سے آسان کتاب ہے مگر اس کے شروع میں الٓمٓ کو عام فہم کیوں نہ ہونے دیا۔ پس انسان کی طاقت اتنی ہی ہے کہ دور سے اشارہ کردے۔ یہ تو ہوا خاص فہم حصہ، اب عام دلچسپی کی باتیں سنیئے۔ ع

بیکار هم و باکار هم چوں مد بحساب اندر

حساب کی رقموں میں میاں مد کی ہستی بیکار بھی ہے اور باکار بھی۔ تاہم یہ مسلم ہے کہ اصل رقم سے اس کے وجود کو کچھ سروکار نہیں۔ ایک دن ایک مرید نے

حسن نظامی کے ہاتھ پاؤں کو چوما اور سمجھا کہ میں نے حسن نظامی کے متبرک جسم سے برکت حاصل کرلی لیکن جسم میں برکت کہاں۔ وہ تو حساب کی رقموں کا مد ہے۔ ذات اور روح کے لین دین کا حساب کتاب ہو اور جسم کمبخت کی صفت کھینچا تانی کی جائے ہمیشہ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہوں کہ دہ دماغ کے کہنے سے کاغذ پر کچھ لکھا کرتا ہے۔ دنیا کی خلقت ہاتھ و دماغ کے عمل کو کتاب و اخبار میں پڑھ کر حسن نظامی کو اس کا ذمہ دار تصور کرلیتی ہے اور یہ نہیں جانتی کہ انکو حساب کتاب سے کچھ سروکار نہیں ہوتا صفر اور نقطہ کا بھی یہی عالم ہے کہ سب کچھ ہے اور کچھ نہیں۔

قربان اس دائرہ حقیقت کے۔ کیا کیا تماشے پردۂ کائنات پر برپا کئے ہیں! اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق آفتاب، اور ادنےٰ سے ادنےٰ ہستی ذرّے کو دیکھیئے۔ یہ بھی حساب کے مد اور صفر و نقطے کی طرح بیکار بھی ہیں اور باکار بھی۔ آفتاب گرم ذرات کا مجموعہ زمین کے سب کارخانوں میں دخیل ہے اس لئے باکار ہے لیکن رات کو جب یہ غروب ہوجاتا ہے تو دنیا کے کارخانے بند نہیں ہوجاتے۔ اس واسطے بیکار ہے ذرہ عالم مرکب کا انتہائی اور آخری نقطہ ہے۔ اس کی جنس نہ ہو تو ساری کائنات بیکار ہے۔ لہذا اس کا وجود باکار مگر ایک ذرے کا ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں۔ پھر اس کے ناکارہ ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ اسی پر نقطہ اور صفر کو قیاس کرو۔ عنوان میں اس کی صورت دیکھ کر کوئی مطلب سمجھ میں نہ آئے گا اور بیکار چیز معلوم ہوگی۔ لیکن جس وقت جسمی تعلقات کو یکسو کرکے اس کے حقائق و معارف پر غور کروگے تو یہی ننھی مُنّی چیز محیط الکل نظر آئے گی

نظام المشائخ کے مضامین اور حلقہ کی تمام تحریروں کے شروع میں ۷۸۶ کے نیچے دو لکیریں لکھی جاتی ہیں۔ خیال ہوتا ہوگا کہ یہ ایک بیکار فعل ہے۔ پر جو اس بھید سے واقف ہیں وہ ان کو باکار اور میکسم گن سے زیادہ کارگر پاتے ہیں جس تحریر پر یہ

نشان ہوگا خدا اسے چاہا تو وہ کبھی بے اثر نہ رہے گی۔ یہ دو لکیریں نہیں ہیں، تاثیر تحریر کے قوی کے لئے ایک قوت دار معجون ہے۔

نقطہ اور صفر بھی ان ربانی اسرار و مفاد سے لبریز ہے۔ اگر تم اس کی روحانی اور فلسفیانہ باریکیوں پر غور نہیں کر سکتے تو ایک کاغذ پر نقطہ کی گول شکل بناؤ اور پھر تنہائی میں اس پر نگاہ جماؤ اور اپنے خیالات کو نقطے کے چاروں طرف پھیلا دو پھر دیکھو کیا لطف اور مزہ آتا ہے۔ بشرطیکہ چند روز تک اس کی مسلسل مشق کرتے رہو۔ اور خیال اور تصور کو اسی ایک بات پر جمائے رکھو۔

اس مضمون کی سرخی پر نظر جماؤ اور سوچو۔ یہی سب کا مرکز اور محیط ہے۔ ہر دکھ، غم اس کے اندر فنا ہو رہا ہے۔ اٹلی کی فوجیں، روس کے لشکر اس غار جہنم میں گر رہے ہیں۔ اب اس کو گردش ہوگی تو گرد و پیش کے تمام مستحکم قصر متحرک ہوں گے اوہام، خوف، رعب کو شکست ہوگی۔

موسیٰؑ نے درخت اور پہاڑ کی آڑ میں دیدار دیکھا تھا۔ مسلم دیدار دیکھنا چاہتا ہے تو نقطہ اور صفر کو سامنے لائے جو کرۂ خاک کا خیالی پیکر ہے۔ جو قلب جسمانی کی تصویر ہے جو ازل و ابد کے درمیان بے تار کا محکمہ پیام رسانی ہے۔

بندوق کی گولی نقطہ اور صفر کی شکل سے مشابہ ہے مگر گولی پیام مرگ ہے اور نقطہ وصفر رشتہ زندگانی۔ زندگی کو پر لطف بناؤ اور اس مجذوبانہ بڑ کو سمجھو۔

آنکھ کی پتلی، خال رخ یار، اور ان تمام صورتوں کی قسم جو نقطہ وصفر کی ہم شکل یا قریب الشکل ہیں، نقطہ کے وجود میں نکات کا خاموش دریا موج میں آنا چاہتا ہے۔ جب اس دریا اور سمندر میں موج آئیگی تو ایک بلبلا اور حباب پیدا ہوگا جو سمندر اور دریا کے حرف کا نقطہ ہے۔ اور اس کے اندر رازو اسرار کی ہوا اور گیس بھری ہوئی ہوگی اور جب وہ ٹوٹ جائیگا تو پانی کے قطرہ پانی میں مل جائیں گے۔

# عرفان یا کی لکیر

از نظام المشائخ۔ دسمبر ۱۹۱۲ء

ذرا کہنا پڑھنے والوں سے کہ آج کل دنیا کہتی ہے میں پریشان ہوں، آشفتہ خاطر ہوں، زندگی سے بیزار ہوں، میرا چین و آرام جاتا رہا۔ مصائب و آلام نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، کیونکہ جدھر نگاہ جاتی ہے خود غرضی، حرص و ہوس کا دَور نظر آتا ہے اخلاق و مروت کا نام نہیں۔ رحم و انصاف مفقود ہو گئے۔ ایک قوم دوسری قوم کو، ایک ملک دوسرے ملک کو، ایک شہر دوسرے شہر کو، ایک کنبہ دوسرے کنبہ کو۔ یہاں تک کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا۔ سب آپس میں ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں۔ طاقتور کا خیال ہے کہ کمزور کو اس زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے مٹا دو، فنا کر دو۔ ناتوان چاہتا ہے اوروں کی توانائی بھی جاتی رہے۔ سارا عالم یکساں ہو جائے۔ فقیر نے سوچا کیا یہ شکایت ٹھیک ہے۔ دل نے جواب دیا "کچھ صحیح اور کچھ غلط" اللہ تعالےٰ نے انسان اور اس جہان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ پہلے اپنی ہستی پر غور کرے اور وجہ پیدائش کو پہچانے۔ مگر بھول چوک کا پتلا آدم زاد دوسروں کو دیکھنے لگا۔ ان کے نیک و بد میں مصروف ہو گیا۔ اور اپنی ذات کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا آپ نے نہیں سنا۔ یورپ کی طاقتیں

ایران و مراکو۔ طرابلس و ترکی پر حملہ آور ہوئی ہیں کہ ان ملکوں کی تہذیب کو بزور تلوار درست کریں مگر خود اپنی ذاتی اصلاح و اندرونی خرابیوں کی درستی کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں اور یہی وجہ تکلیفات و صعوبات کے بڑھنے کی ہے۔ اگر ہر آدمی پہلے اپنی ذاتی اصلاح و بہبودی کی طرف متوجہ ہو تو خدا کی بنائی ہوئی زمین فتنہ و فساد اور غم و آلام سے چھٹکارا پا جائے۔ انسان خدا کی بنائی حکمتوں کا ایک خزانہ ہے کون انسان؟ وہ جو کوٹ پتلون پہنتا ہے، کالر نکٹائی لگاتا ہے، پاؤں کو بوٹ سے آراستہ کرتا ہے اور چرٹ منہ میں دبا کر تیم فرعونی شان سے اکڑتا ہوا چلتا ہے اور وہ جو ٹخنوں سے اونچا پائجامہ، بوسیدہ میلا کرتہ پہنے، منڈے ہوئے سر پر ڈھائی گز کا دوپٹہ لپیٹ لیتا ہے۔ اور وہ جس کی ٹانگیں گھٹنوں تک دھوتی سے برہنہ نظر آتی ہیں اور ہاتھ کے بنائے ہوئے معبودوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ یہ سب زمین پر حرکت کرنے والی مورتیں خزانہ الٰہی کی تھیلیاں ہیں۔ ان سب کے اندر دولت لازوال بھری ہوئی ہے لیکن غافل ہستیاں اس کی قدر نہیں کرتیں اور نفسانی و شیطانی خواہشوں پر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو برباد کر رہی ہیں۔ ان بادشاہوں سے پوچھو۔ جب تم لاکھ آدمیوں کا لشکر لے کر اپنے دشمن پر حملہ کرتے ہو اور بے شمار جانوں کا نقصان کر کے صرف اپنی ناموری کماتے ہو، تو وہ ناموری تمہارے کس کام آتی ہے؟ جاڑے کا گرم لحاف اچھا یا تمہاری یہ ناموری؟ اگر سردی کے وقت لحاف اور کمبل میسر نہ آئے تو یہ ناموری تمہارے جسم کو سردی سے بچا سکتی ہے؟ مگر بادشاہوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے امیروں اور سرمایہ داروں اور دولتمندوں کی محنت کے پھل کھانے والوں سے دریافت کرنا فضول اور بے کار ہے وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے ان کے خیال میں زندگی اسی کا نام ہے کہ ایک انسان اپنی فانی عزت و شان کے لئے لاکھوں انسانوں کو قربان کر دے اور ان قیمتی وجودوں کو موت کے گھاٹ اتار دے

جن کو برسوں کی مشقت کے بعد ماتا بھری گوددوں نے پالا پوسا تھا۔

جب میرا دایاں ہاتھ ان خیالات کو قلمبند کر رہا تھا تو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے کچھ اشارہ کیا۔ اس نے کہا مجھ میں کیا لکھا ہے؟ اس کو پڑھو۔ میں ربانی دستاویز کی شہادت ہوں۔ خدا نے فرمایا تھا۔ قیامت کے دن آدمیوں کے ہاتھ پاؤں سے گواہی لوں گا اور وہ انسان کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ قیامت تو دور ہے، اس کا نمونہ زمین کے اس دور پر آشوب میں، جو درحقیقت محشری زمانہ ہے، اعضائے جسم گواہی کے لئے طلب کئے جا رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جبکہ دستاویز کی تکمیل مہر و دستخط سے ہوتی تھی۔ اب قیامت قریب آگئی۔ مہروں اور دستخطوں میں جعل سازیاں ہونے لگیں۔ اس واسطے خدا نے ایک نیا ذریعہ تکمیل صداقت کا پیدا کیا اور وہ انگوٹھے کا نشان ہے۔ تمام معاملات جن کا عملدرآمد تحریر میں آتا ہے، انگوٹھے کے نشان سے مکمل کئے جاتے ہیں۔ دائیں ہاتھ کے فخر کو قرن گذر گئے۔ وہ کہتا تھا کہ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میرے بل پر سب کام ہوتے ہیں خدا کو انانیت کسی کی نہیں بھاتی۔ آج دایاں ہاتھ بیکار ہے اور بائیں ہاتھ کے کرتب کا سارے جہان میں دور دورہ ہے اس میں نصیحت ہے۔ ان لوگوں کے لئے، جو غرور و تکبر و خود پرستی کے متوالے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری لن ترانیاں ہمیشہ برقرار رہیں گی مگر دوام اور ہمیشگی صرف خدا کی ذات کو ہے۔ باقی ہر ایک کے لئے انقلاب و زوال ہے۔

اللہ کے بندو! اپنے جسم پر غور کرو۔ تمہارے رونگ رونگ میں اسرار ربانی کے نوشتے ہیں۔ تمہارا بال بال یزدانی رموز میں بندھا ہوا ہے۔ انگوٹھے کی لکیریں جس طرح تمہارے معاملات دنیاوی میں کام آتی ہیں اسی طرح ان سے عرفان الٰہی کا کام نکالو لین دین کے کاغذات پر انگوٹھے کا نشان کرتے وقت ذرا

یہ بھی سوچ لیا کرو کہ تم کس کی انگشت حقیقت کا نشان ہو۔ کھانے۔ پینے۔ لڑنے، جھگڑنے، خود بینی وخود ستائی کے لئے تم کو نہیں پیدا کیا گیا۔ پروردگار کو تمہاری پیدائش سے اپنی طاعت وعبادت مقصود ہے اور وہ عبادت نماز اور پوجا کی اٹھک بیٹھک نہیں ہے بلکہ اپنے وجود کا عرفان ہے اور خدا کا ارشاد اس کا شاہد ہے۔ کائنات کی دستاویز قلم تکوین سے جب لکھی گئی تو کن کہنے والے نے مخلوقات کے کاغذ پر ایک انگوٹھے کا نشان لگایا تاکہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ وہ سند کیا ہے اور وہ ضرورت کیا ہے اور وہ انگوٹھے کا نشان کس سے مراد ہے؟ نشان انگشت وجود انسانی ہے سند خلافت رحمانی ہے۔ ضرورت موت کے بعد وہ گھڑی جو سب کو پیش آنی ہے جس نے خود کو پہچانا اس نے خدا کو جانا۔ صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے باطنی واندرونی انتظام کے لئے پروردگار کی جانب سے ایک شخص مقرر ہوتا ہے جس کے عہدے کا نام قطب عالم یا قطب مدار ہے۔ قطب عالم کے دائیں بائیں دو وزیر ہوتے ہیں۔ وست راست کے وزیر کا نام عبدالملک اور وست چپ کے وزیر کا عبدالرب۔ عبدالملک کا یہ کام ہے کہ خدا پرستوں کے معاملات کو قطب عالم کے حضور میں پیش کرے اور عبدالرب ان لوگوں کی مہات بارگاہ قطب عالم میں پیش کرتا ہے جو دائرۂ توحید خدا پرستی سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس زمانے میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ دشمنان توحید تمام دنیا پر چھائے چلے جاتے ہیں اور خدا پرست ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے وست چپ کے وزیر کے لئے اپنی نعمتوں کا دروازہ کھول دیا ہے مگر صفات الٰہی کی مختلف شانیں ہیں۔ آج ہمارے شامت اعمال کے سبب صفت قہاری کا ظہور ہے اور قطب عالم کے وزیر دست چپ برسر حکمرانی ہیں جس کی وجہ سے دنیاوی دستاویزوں پر انگوٹھے کا نشان بھی بائیں ہاتھ کا لگایا جاتا ہے

توکل ہماری توبائیں قبول ہوں گی ،صفت رحمت توجہ فرمائے گی اور وزیر عبدالملک برسرحکومت ہوں گے۔ اس کو انگریزی پارلیمنٹ کی دوشاخوں لبرل اور کنسرویٹو کے تحت میں نہ لائے۔ کیونکہ یہ بیان ان سے الگ قسم کا ہے۔

ربانی حکومت جمہوریت سے اسی قدر تعلق رکھتی ہے کہ کبھی شان قہر کا دَور ہے اور کبھی شان رحم کا دَور۔ لیکن قہر ایک کے لئے زہر ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے آب حیات۔ اس کی سرکار میں لبرل اور کنسرویٹو حکومتوں کی طرح پالیسیاں نہیں ہیں اس کی حکومت کا مدار محکوموں کے اعمال پر ہے۔ جیسے اعمال سرزد ہوتے ہیں اسی قسم کی حکمرانی کی جاتی ہے۔ اس کے دربار میں دائیں ہاتھ کے نشان کی دستاویز مقبول ہے۔ کیونکہ آدمی کا داہنا ہاتھ خدا کو پسند ہے۔ اسی لئے داہنا ہاتھ اس نے آخرت کے لئے رکھا ہے پس جس کے پاس دائیں ہاتھ کی دستاویز اعمال ہے اس کا محاسبہ آسان اور سہل ہوگا یعنی جس طرح دنیا دی عدالتوں میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان سے دستاویز قبول کی جاتی ہے، عدالت دین میں قبول نہیں کی جاتی۔ اس کے ہاں دائیں ہاتھ کی دستاویز پیش کرنے سے نجات ہے۔ لہٰذا اے آدمیو! اگر تم خدا کو چاہتے ہو، اگر تم اس کی توحید کے قائل ہو تو دائیں ہاتھ کی دستاویز تیار کرو۔ دایاں ہاتھ تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔ میدانِ جہاد میں تمہارے بہت سے بھائی قبضۂ شمشیر اور کھٹکۂ تفنگ سے دائیں ہاتھ کا حق ادا کر رہے ہیں۔ تم اس امن کے ملک میں جیب میں ہاتھ لے جاؤ اور اس کا حق ادا کرو۔ تمہارے دائیں ہاتھ کی لکیریں بھی اگر تم غور کرو، اس عظیم الشان معاملہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ جو سب خدا پرستوں کو خوشی و خرمی کے ساتھ عنقریب پیش آنے والا ہے۔ لکیر عرفان پہچانو۔ تاکہ لکیر کے فقیر اور عارف حق کا رتبہ پاؤ۔ اور تمہاری عاقبت بھی درست ہو جائے اور دُنیا بھی۔

# لالٹین

از رسالہ نظام المشائخ مارچ ۱۹۱۳ء

"لالٹین" ہاتھ میں رہنے والی روشنی کا نام ہے۔ شیشے کے اس قفس کو کہتے ہیں جس کے اندر شعاع آتشیں قید ہے۔ ایک زمانہ تھا آندھیاں، پروانے اور چلنے پھرنے والوں کے دامن چراغوں کے دشمن تھے۔ بھرے پُرے چراغ ہوا کے جھونکے سے گل ہو جاتے تھے۔ پروانے اپنی عاشقانہ پر اندازی سے اس غریب روشنی کی ہستی کو بے جان کر دیتے تھے۔ بے احتیاط دوپٹوں کے آنچل، کبھی تو ایسا ہوتا کہ نورِ چراغ ان کے صدمہ سے بجھ جاتا تھا اور کبھی دوپٹہ خود چراغ بن جاتا اور بے احتیاط اوڑھنے والے کو سزائے سوخت مل جاتی تھی۔

آج وہ وقت ہے کہ روشنی کو سب سے زیادہ ترقی اور امن و امان نصیب ہے۔ کیا مجال جو آندھی آنکھ ملائے، پروانہ قریب آئے اور آنچل کا دامن حملہ آور ہو۔ روشنی اطمینان و بے فکری سے چمنی کے گنبد میں رات بھر پاؤں پھیلا کر سناتی ہے۔

اس نئی روشنی کے زمانہ میں کائنات کی ہر چیز کا ظاہر روشن ہے مگر باطن تاریک ہے۔ بجلی کی روشنی کا رنج کے ہنڈوں میں ظاہر ہو کر چمکتی ہے اور تار کے باطن میں تاریک رہتی ہے۔ گیس کی روشنی کا بھی یہی عالم ہے مگر ہمیں اس سے کیا بحث؟ سیاہ باطن ہو یا سفید باطن، ہمیں تو یہ ہماری لالٹین پیاری ہے۔ چلتا پھرتا نور ہے اور اس زمانے میں برکت وہیں ہے، جہاں حرکت ہو۔ ایک رات میں نے لالٹین سے پوچھا۔ "کیوں بی! تم کو رات بھر کے جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی؟" بولی۔ آپ کا خطاب کس سے ہے؟ بتی سے، تیل سے، ٹین کی ڈبیہ سے،

کانچ کی چمنی سے۔ یا پیتل کے اس تار سے جس کو ہاتھ میں لے کر لالٹین کو لٹکا سکتے
پھرتے ہیں؟ میں تو بہت سے اجزا کا مجموعہ ہوں۔

لالٹین کے اس سوال سے دل پر ایک چوٹ لگی۔ یہ میری ایک بھول تھی۔ اگر میں پہلے اپنے وجود کی لالٹین پر غور کر لیتا تو ٹین اور کانچ کے پنجرے سے یہ سوال نہ کرتا۔ میں حیران ہو گیا کہ اگر لالٹین کے کسی ایک جزو کو لالٹین کہوں تو یہ درست نہ ہوگا اور اگر تمام اجزاء کو ملا کر لالٹین کہوں تب بھی موزوں نہ ٹھہرے گا۔ کیونکہ لالٹین کا دم روشنی سے ہے۔ روشنی نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مگر دن کے وقت جب لالٹین روشن نہیں ہوتی اس وقت بھی اس کا نام لالٹین ہی رہتا ہے، تو پھر کس کو لالٹین کہوں۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مجبوراً لالٹین ہی سے پوچھا۔ میں خاکی انسان نہیں جانتا کہ تیرے کس جزو کو مخاطب کروں اور کس کو لالٹین سمجھوں۔ یہ سن کر لالٹین کی روشنی لرزی، ہلی کپکپائی۔ گویا وہ میری ناشناسی و نادانی پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی اور کہا۔ اے نور خدا کے چراغ آدم زاد! سن۔ لالٹین اس روشنی کا نام ہے جو بتی کے سر پر رات بھر آرا چلایا کرتی ہے۔ لالٹین اس شعلہ کو کہتے ہیں جس کی خوراک تیل ہے اور جو تاریکی کے دشمن سے تمام شب لڑتا بھڑتا رہتا ہے دن کے وقت اگرچہ یہ روشنی موجود نہیں ہوتی لیکن کانچ اور ٹین کا پنجرا رات بھر اس کی ہم نشینی کے سبب لالٹین کہلانے لگتا ہے۔ تیرے اندر بھی ایک روشنی ہے اگر تو اس کی قدر جانے اور اس کو پہچانے تو سب لوگ تجھ کو روشنی کہنے لگیں گے خاک کا پتلا کوئی نہ کہے گا دیکھ خدا کے ولیوں کو، جو رات بھر اپنے پروردگار کی نزدیکی و قربت کی خواہش میں کھڑے کھڑے گزار دیتے ہیں تو دن کے وقت ان کو نور خدا سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد ان کی قبروں کی بھی وہی شان رہتی ہے پہلے چمنی کو صاف کر یعنی اپنے لباس ظاہری کو گندگی و نجاست سے آلودہ نہ ہونے دے

اس کے بعد ڈبیہ میں صاف تیل بھر یعنی حلال کی روزی کھا اور پھر دوسرے کے گھر کے اجالے کے لئے اپنی ہستی کو جلا جلا کر مٹا دے۔ اس وقت تو بھی قندیل حقیقت اور فانوس ربانی بن جائے گا۔

# بے تار کا تار

از نظام المشایخ مئی ۱۹۱۳ء

تم نہ کہتے تو میں بھی خاموش رہتا۔ بادہ فروش اور بادہ نوش کے ہاتھ میں اپنا بھید دیدیا۔ میں بھی دنیا پر تمہارے راز کو فاش کر دوں گا۔

پہلے تم نے یہ کیا کہ بجلی کے اسرار کو طشت از بام کیا۔ اس سے گاڑیاں کھچوائیں۔ پنکھے جھلوائے۔ سڑکیں کٹوائیں۔ ہرکارے کا کام لوایا۔ پھر بے سلسلہ و بے تعلق نشان بھی ان کے قبضے میں دیدیئے۔ بے تار کے تار کا علم بتا دیا اور وہ بھی کس کو جو تمہاری شان میں گستاخ ہے، بے ادب ہے، مغرور ہے، چور ہے، ڈاکو ہے، دغا پیشہ اور جفاکار ہے۔ میں پوچھتا ہوں تم کو بندہ نوازی کا اتنا شوق کیوں ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا اس راز کے زور سے یہہ لوگ تمہارے پسندیدہ گھر پر چڑھ کر جائیں گے۔ گولے گولیاں برسائیں گے۔ تمہارا کیا جائے گا تکلیف تو ہم کو ہوگی جن کے دلوں میں اپنے گھر کی محبت بھر دی ہے۔

نادان و ناسمجھ بندہ بگڑتا ہے۔ ایسے بے خبر تو کیا جانے۔ پروردگار کی حکمت پروردگار ہی خوب جانتا ہے۔ علم و ہنر کے آم کا رس تو مجھ کو دیا ہے۔ چھلکے ان گستاخوں کو مل گئے۔ اس پر تیرا یہ کہنا سراسر بے بنیاد ہے۔ چور کو چوری کرنے کے اوزار دیئے ہیں تو اس کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ چوری کے بغیر بھی ہم تجھکو رزق دے سکتے ہیں۔

یہ اوزار امتحان کے لئے ہیں۔ اگر تو نے چوری کے کام میں ان کو استعمال کیا تو ہاتھ کاٹے جائیں گے، اور اگر دوسروں کو آرام دینے کے کام میں لایا تو انعام پائے گا۔ کردگار عالم جانتا ہے کہ اگرچہ یہ مغربی دنیا گستاخ و ناسزائی ہے مگر اس کو یہ بھی علم ہے کہ انہی میں بہت سے میرے دروازے پر سر جھکائے آنے والے ہیں۔ ایک وقت پر جرمنی اسلام قبول کرے گا، انگلستان مسلمان ہو جائیگا۔ فرانس اور اٹلی میں بھی نور وحدت کی روشنی نمودار ہوگی۔ ابتدا کو دیکھ کر بیقرار نہ ہو۔ ازل کے حالات سے مایوس نہ بن۔ انجام و ابد میں دیکھیو کیا ہوتا ہے۔ کیا کیا جاتا ہے۔ آج دیا ہے کل لے لیا جائے گا۔ آج سرفراز کیا ہے، کل برباد کر دیا جائے گا۔ اگر نہ مانے اور گمراہی کی چال چلتے رہے۔ بے تار کا تار تو تم لوگوں کی دلیل بنایا گیا ہے۔ اس کو دیکھو، سوچو، سمجھو اور دشمن سے کہو۔ یہ بھی ہمارے مولیٰ کی شان کا ظہور و نمونہ ہے۔

مراقبہ میں کیا ہوتا ہے، مکاشفہ کسے کہتے ہیں، لاکھوں کوس کی خبر آن کی آن میں دل کی لوح پر کس طرح نقش ہو جاتی ہے؟ اس کا جواب بے تار کے تار میں ہے۔ چند اونچی اونچی لکڑیاں کھڑی کر دیں۔ برقی ذخیرہ کا خرقہ ان کھمبوں کو پہنا دیا۔ اس کے بعد اشارے کنائے شروع کر دیئے۔ ایک لندن میں ہے ایک دہلی میں۔ دونوں کو آواز آنے لگی لیکن کس کو؟ اُس کو جو تار کے بھید سے واقف ہے۔ ہر ایک کو نہیں۔ خواہ ہزاروں آدمی تار کی بیچ سے لگے بیٹھے رہیں جیسے مراقبہ کرنے والے کے پاس بیٹھنے والے بے خبر رہتے ہیں۔

مگر یاد رکھ! بے تار کی خبر راستے میں گرفتار بھی ہو جاتی ہے یعنی جب وہ بجلی کے کندھے پر سوار جا رہی ہو اور راستہ میں کوئی اور کھمبا مل جائے تو وہاں کے رہنے والے خبر کے بھید کو پکڑ سکتے ہیں۔ بس اس میں بھی انسان کو عاجز رکھا گیا

ہے اور وہ پوری اور کامل قدرت نہیں دی جو مراقبہ کرنے والے کو عطا ہوئی ہے مراقبہ کرنے والے کا کشف کوئی گرفتار نہیں کرسکتا۔ تو پھر تو خدا کی ان مکمل طاقتوں کو بھی سیکھ اور ان کو حاصل کرکے دشمنوں کی ان چھچھوری، ناقص قوتوں کو حاصل کرلے۔ کیونکہ خدا نے تجھ کو دونوں طاقتیں دی ہیں۔

میں تو تیرا ہوں۔ ذرا آگے تو بڑھ سب کچھ دونگا۔ ہاتھ پاؤں تو ہلا۔ سب کچھ بخشوں گا۔ گھر میں بیٹھا بیٹھا کوستا ہے۔ تیوری چڑھاتا ہے اور بھولے بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہے۔ اس سے کیا فائدہ؟ میں نے تو اس دُنیا کو عمل اور حرکت اور جدوجہد کا مقام بنایا ہے کیوں حسن نظامی میں نے ٹھیک کہا نا؟۔ جی ہاں آپ نے درست فرمایا۔

# سل اور دق کے عارفانہ نکات

از نظام المشائخ۔ جون ۱۹۱۳ء

سل اور دق دو حرف کے دو لفظ یا دو نشتر ہیں جو انسان کی رگِ حیات کو چپکے ہی چپکے بے خبری میں زخمی کرکے اس کا کام تمام کردیتے ہیں۔ اولادِ آدم گوری ہو یا کالی، ان بیماریوں کے نام سے کانپتی ہے، لرزتی ہے اور ڈھونڈتی ہے کہ اپنی عقل اور علم کے زور سے ان موذی اور نامراد بیماریوں کا علاج مل جائے انگریزوں کے شاہی خاندان میں یہ امراض موروثی ہوگئے ہیں۔ دولت نے، ڈاکٹروں نے مل جل کر مہینوں، برسوں ان بے وجود مگر موجود بود مگر نابود

امراض کی تحقیقات میں سر کھپایا مگر غیب کا بھید کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ کسی نے کہا قہقہہ مار کر ہنسنا اس کا علاج ہے۔ کوئی بولا کھلی ہوا میں رہنا، فکر کو پاس نہ آنے دینا اُکی دوا ہے۔ کوئی اپنے سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہا عقل کچھ کام نہیں دیتی۔ علم کی رسائی موت کی ان ہولناک مشینوں کے پرزوں کی حقیقت تک نہیں ہوسکتی۔ گویا ان سب مادہ پرست ہستیوں کو اقرار ہے کہ سل اور دق کے امراض کا دنیا میں کوئی علاج نہیں یعنی شرطیہ اور حکمیہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ بعض باتوں میں یہ مادہ پرست لوگ لن ترانی سے دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہے نہ اسکے ہونیکی ضرورت ہے بس جو کچھ ہے ہم خود ہی ہیں یا خدا کی شان ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والی عقلیں معمولی معمولی باتوں میں کس طرح عاجز اور لاچار ہوجاتی ہیں۔ آؤ ذرا آج صوفیانہ نکتہ نظر سے ان پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے لفظوں پر غور کریں۔

سل اس بیماری کا نام ہے جو پھیپھڑے کو غموں کی چھری سے زخمی کر دیتی ہے اور آدمی خون تھوکتے تھوکتے مرجاتا ہے۔ دق ایک خفیف اور باطنی حرارت کو کہتے ہیں جو جسم کے خون کو جلا دیتی ہے پھیپھڑہ اس کی ہلکی ہلکی آنچ سے جل کر کباب ہوجاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں مریض کا ظاہری چہرہ اندرونی اور باطنی سوختہ کاری کو ظاہر نہیں ہونے دیتا جس طرح عشق کی آگ جب خانۂ باطن میں بھڑکتی ہے تو انسان کے اعضائے ظاہری پر اس کا ظہور بس اتنا ہوتا ہے کہ ہونٹ خشک ہوجائیں، چہرہ زرد نظر آنے لگے، ٹھنڈے ٹھنڈے سانس ہوں، آنکھیں آنسوؤں سے لبریز رہیں۔ اسی طرح سل اور دق چہرے کو افسردہ اور فکرمند بنا دیتی ہے مگر ہلاکت اور فنا کا بھید صفحۂ رخ پر ظاہر نہیں ہونے پاتا چاہیے کہ سیاست شناس لوگ کہتے ہیں چالبازوں کی حکومت سل اور دق کا مرض ہے جو قوموں اور ملکوں کا اندر ہی اندر کام تمام کر دیتی ہے۔

ہم کہتے ہیں آدمی ان معمولی جسمانی بیماریوں سے تو اتنے پریشان اور آشفتہ خاطر ہیں جن کا علاج اور جن کی تشخیص چنداں دشوار نہیں، کبھی انہوں نے روحانی سل اور دق پر بھی توجہ کی جو روح کے جوہر زندگی کو اندر ہی اندر فنا کر دیتے ہیں اور وہ نفس کی حرص و ہوس ہے۔ حرص ایک سل ہے اور ہوس ایک دق ہے۔ جب یہ عارضے روح کو لاحق ہوتے ہیں تو انسان نفس اور شیطان کے القا سے یہ سمجھتا ہے کہ حرص و ہوس درحقیقت انسانی ترقی اور حصول کمالات کے لئے لازمی چیزیں ہیں۔ جو قومیں صابر اور قانع ہوتی ہیں ان کو ترقی اور کمال میسر نہیں آتا۔ ایک ہی جگہ ٹھٹھری کی ٹھٹھری رہ جاتی ہیں اور جب کوئی شخص بیماری کو بیماری نہ سمجھے بلکہ امراض کو زندگانی خیال کرے تو ظاہر ہے کہ وہ خود ہلاکت اور موت کے گڑھے میں گرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے آخر زمانے میں مکاریاں دغابازیاں عقلمندی اور ہنر شعاری سمجھی جائیں گی۔ وہ زمانہ آجکل ہے۔ جو شخص دنیاوی امور اور فانی دولت کے حاصل کرنے میں غدارانہ جوڑ توڑ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو، اس کو بہت بڑا عاقل اور دانا مانا جاتا ہے اور جو چالاکیوں اور فریب کاریوں کو ناجائز خیال کرکے صبر و قناعت سے خدا و رسول کے احکام کی پیروی اور تعمیل کرتا ہو، وہ اعلیٰ درجہ کا بیوقوف، احمق، وحشی، بے تہذیب اور فول کہلاتا ہے مگر بے وقوفوں اور احمقوں کی روحیں، جن کا اوپر ذکر آیا، ہمیشہ تندرست اور زندہ سلامت رہتی ہیں اور عقلمندوں اور ہوشیاروں کی ارواح سل اور دق کے مریضوں کی طرح افسردہ اور اداس اور بے چینی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ذرا سے صدمے اور دنیاوی پیچیدگی سے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور خودکشی کے سوا اتنے لمبے چوڑے آسمان و زمین میں تسلی اور اطمینان کا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ اس لئے وہ اپنے ہاتھ سے اپنے کو ہلاک کر لیتے ہیں۔

پس جن لوگوں کی روحیں سل اور دق کے امراض میں مبتلا ہیں ان سے کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ جسم کی سل اور دق کا علاج معلوم کرسکیں۔ یہ حصہ ان لوگوں کا ہے جن لوگوں کی ارواح توکل ربانی سے حقیقی مضبوطی اور توانائی اور وہ قوت رکھتی ہیں جن کے آگے مادی سائنس اور فلسفہ کے مکاشفاتِ کمالیہ ہیچ ہیں جس شخص کی روح کو اللہ تعالےٰ نے اپنے علوم مخفیہ کی بصیرت عنایت فرمائی ہے وہ جسمانی سل اور دق کے امراض کا علاج اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کو مرض کی حقیقت اور اصلیت کا بھی بھید معلوم ہوتا ہے اور ان اسباب کا بھی علم اُس کو دیا جاتا ہے جن سے جسم کے یہ عارضے دور ہوجائیں۔

سل اور دق پھیپھڑے سے تعلق رکھتے ہیں اور پھیپھڑے کی زندگی سانس پر منحصر ہے اور سانس فضائے عالم کی ہوا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مادی فلسفیوں نے نتیجہ نکالا کہ دق اور سل کے مریضوں کے لئے صاف ہوا ہونی چاہیئے تاکہ صاف سانس پھیپھڑے میں جائے اور اس کی کدورتیں دور ہوجائیں لیکن جب پھیپھڑے میں زخم پڑ چکے ہیں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ پھر صاف ہوا کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی یعنی جب سل اور دق کا درجہ ابتدائی مقامات سے آگے بڑھ گیا ہو تو مرض لا علاج ہوجاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی بڑی بھول ہے۔ تندرست روح کو بتایا گیا ہے کہ ہر مرض کا ایک علاج ہے۔ ہر زہر کا ایک تریاق ہے پھول کے ساتھ کانٹا۔ اندھیرے کے ساتھ روشنی ہے۔ لہٰذا لاعلاج کوئی مرض نہیں ہے۔

کسی چیز کا عرفان اس کی ضد سے ہوتا ہے اور ہر چیز کی ایک ضد پیدا کی گئی ہے۔ یہ کہنا کہ جب پھیپھڑہ زخمی ہوجائے اور زخموں کا گھراؤ بڑھ جائے تو پھر اندمال کسی صورت سے ممکن نہیں۔ غلط رائے ہے اور ایسا کہنے والے خود روحانی دق اور سل میں مبتلا ہیں اور بیمار کی رائے چونکہ بیمار ہوتی ہے اس لئے یہ رائے بھی بیمار ہے۔

ایک دفعہ راقم فقیر بیمار ہوا۔ کلکتہ کے سب سے بڑے انگریز ڈاکٹر نے کہا پھیپھڑہ خراب ہو چکا اب کوئی علاج فائدہ نہ دے گا۔ باطنی ڈاکٹر بولا اور اپنے فکرمند مریض کو سمجھایا کہ ڈاکٹر پر ایمان نہ لانا۔ پاس انفاس کا شغل کھلی ہوا میں جاکر کرو۔ سارا پھیپھڑہ گل بھی گیا ہوگا تو اچھا ہو جائے گا۔ میں نے اس پر عمل کیا اور آج پانچ برس سے زندہ سلامت ہوں۔

عزیز م ملا محمد الواحدی ایڈیٹر نظام المشائخ کو آجکل کسی ایسے ہی ڈاکٹر نے کہدیا ہے کہ تم کو سل ہے۔ جلدی علاج کرو ورنہ خیر نہیں۔ سنتا ہوں بشریت کے تقاضے سے واحدی ملا پر اس کا اثر ہوا اور وہم کے نشتر نے اچھے بھلے پھیپھڑے کو زخمی بنا دیا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سانس پر حیات جسم کا مدار ہے۔ سانس ہی وہ چیز ہے جس سے زندگانی کی کامرانیاں تعلق رکھتی ہیں۔ سانس پر قابو پاجانا صحت روحانی و جسمانی کے لئے ازحد مفید ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ذکر الٰہی سانس کے اندر جمائیں کھلی ہوا میں خوب چہل قدمی کریں۔ خدا کا ذکر ہمارے سب ظاہری باطنی جراحتوں کا مرہم ہے۔ سانس کے ذریعہ اس مرہم کے پھائے پھیپھڑے پر لگائے جائیں اور اطمینان کے لئے دوا کا استعمال بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔

سل اور دق کی اصل جڑ تفکرات خانگی ہیں۔ عارف کو دنیا کے نشیب و فراز کے تردداتِ و تعیشات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس دنیا کی خوشی و تکلیف سب عارضی ہے۔ لہذا ہر حال میں خوش اور ہشاش بشاش رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات حاصل نہ ہوگی جب تک کہ خدا تعالےٰ کی ذات پر کامل بھروسہ اور اعتماد پیدا نہ ہو۔ جب توکل اور صبر و رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی تکلیف اذیت نہیں دیتی اور جب مصائب میں ایذا کا احساس باقی نہ رہے تو ان کا اعضائے جسم پر یعنی دل۔ دماغ۔ پھیپھڑہ وغیرہ پر کوئی نقصان رساں اثر نہیں پڑنے پاتا۔

اور اگر بشری کمزوری سے اثر پڑ جائے تو بہت جلدی اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اگر آدمی کو اصلاح کا احساس بھی ہو۔

سانس کا ذکر سینہ اور پھیپھڑے کے امراض کو بہت جلدی دور کر دیتا ہے تم کو چاہیئے صبح نماز پڑھ کر سورج نکلنے سے پہلے کھلے میدان میں نکل جاؤ اور وہاں ایک مطمئن مقام پر بیٹھکر قابل برداشت وقفہ سے لمبا سانس اندر لیجا کر روکے رکھو اور آہستہ آہستہ باہر نکالو اور اس سانس میں لفظ اللہ کو جاؤ یعنی جب سانس اندر جائے تو تمام سینہ اور شکم کو اس سے بھر دو اور خیال کرو کہ لفظ اللہ باطن کی ہر سمت چھایا ہوا ہے اور جب باہر کا سانس لو تو ھو کہو اور آہستہ آہستہ سانس کو خارج کرو اس طرح سل اور دق کی تمام جسمانی و روحانی کثافتیں دور ہو جائیں گی۔ والدعا

# الکبیت ما الکبیت

از نظام المشائخ۔ اگست ۱۹۱۴ء

جون ۱۹۱۴ء میں بمقام احمد آباد گجرات۔ راقم درویش دیا سلائی کے ایک نئے کارخانے کے افتتاح میں شریک کیا گیا تھا۔ جلسہ بہت شاندار اور عظیم تھا۔ پیر صاحب بغدادی اور کلکٹر احمد آباد صدارت کی کرسی پہ ازو سے بازو ملائے خبر نہیں کس قسم کا قران بنے بیٹھے تھے۔ ایڈریس بازی اور اسپیچ نوازی ہو رہی تھی۔ اس وقت میرے تخیل نے عرب وانگریز و گجرات کو مخاطب کر کے چند الفاظ جوڑ لیئے۔ ناظرین دیکھیں یہ جوڑ توڑ کیسا ہے۔

(حسن نظامی)

اَلْکِبْرِیْتُ مَا الْکِبْرِیْتُ وَمَا اَدْرَاکَ مَا الْکِبْرِیْتُ۔ میچز۔ ویچ۔ میچز

ہونوٹل یوداٹ میچز۔ آر دیو اسٹری، کیوی دیواسٹری۔ تم نے شی کھبر کہ دیو اسٹری شوں سچے۔ (پہلے عربی فقرہ ہے پھر انگریزی ہے پھر گجراتی ہے)

دیا سلائی۔ کیسی دیا سلائی۔ تمہیں کیا خبر کہ دیا سلائی کیا ہوتی ہے۔ وہ ایک تنکا ہے جو جلنے اور مرنے کو پیدا ہوا۔ وہ جنگل کے ہرے بھرے درختوں کا لخت جگر ہے جو انسان کی خاطر ملیامیٹ ہونے گھر سے باہر نکلا۔ کٹ کر آیا۔ گرم چشمہ میں اُبلا کھال کھنچی۔ مشین کی قینچیوں نے پرت پرت کترے۔ تنکے بنائے اور مسالہ میں غوطہ دیکر بکس بنائے جب یہ میاں تنکے دیا سلائی کہلائے۔

ناروے، سوئیڈن، جاپان کی دیا سلائی گوری۔ ہندوستان کی کالی۔ مگر دونوں کالے گورے کے لقب سے آزاد کبھی نہیں سُنا کہ کالے تنکے کو گورے تنکے نے کنیڈا اور ساؤتھ افریقہ کے گوروں کی طرح اپنے ملک میں آنے سے روکا ہو یہ بیچارہ تو ہندو مسلمان، عیسائی، موسائی۔ نیک و بد کا فرق بھی نہیں کرتا جس کے ہاتھ میں جاتا ہے خدمت بجالاتا ہے۔ مندر، مسجد، گرجہ میں اسی کے دم سے روشنی ہے۔ مسٹر کلکٹر اور پیر صاحب بغدادی کے سگریٹ بھی سلگاتا ہے۔ غریب آدمیوں کے مٹی کے چراغ بھی یہی روشن کرتا ہے۔

آج اس کی مشین کا افتتاح ہے۔ یہ اس کا یوم الست ہے۔ سب تنکوں کی روحیں بتائیں ان کا عارف کون ہے۔ خدا کا اقرار تو وہ ازل کے دن بلیٰ کہہ کر کر چکے۔ اب اپنے واقف اسرار کو سمجھیں۔ کہ وہ کون ہیں؟

اس جلسے میں کوئی نہیں۔ حضرت پیر صاحب بغدادی ان اسرار کو جانتے ہیں کیونکہ بڑے پیر صاحب کی اولاد ہیں۔

مسٹر کلکٹر کو صدارت کی کرسی اور اسپیچ بازی سے فرصت نہیں مجمع عام میں بھی جس میں ہندو مسلمان، پارسی، یہودی، عیسائی، گورے کالے سب ہی موجود ہیں، کوئی نہیں

جانتا کہ دیا سلائی کی اصلی شان کیا ہے۔ وہ کیوں ایک ہی سجدہ میں مقبول ہو جاتی ہے۔ کہ بکس کے پہلو میں بچھی ہوئی خاکی جانماز پر سر جھکایا اور شعلہ غیبی دوڑ کر آیا۔ غریب تنکا جل کر گر پڑا اور تمہارا گھر روشن ہو گیا۔

یہ شعلہ کہاں سے آیا۔ کس نے بھجوایا، کوئی ہے جو بتائے۔ نہیں تو۔ کوئی ہے جو بتانے والے سے یہ بھید سنے، مگر نہ کوئی بتانے والا ہے، نہ کوئی سننے والا ہے۔ آسمان اپنے اشاروں کو دل کے پردوں میں چھپا رہنے دے ورنہ یہ شرمائیں گے جو میری سی شکل و صورت لے کر آئے ہیں۔ مگر تجلی حق سے محروم ہیں۔

# لوہے کی طریقت

از طریقت۔ جولائی ۱۹۱۶ء

خاک کی مورت۔ مٹنے والی صورت اور زور کا یہ عالم کہ سمندر کی چھاتی پر مونگ دلنے کو تیار۔ بجلی و ہوا کے سر پر سوار۔ جنات وحیوانوں کی تو کیا مجال کہ اس سے آنکھ ملائیں۔ فرشتے اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ خدا کے سامنے اس کی طاقت کا لوہا مانتے ہیں۔

ذرا دیکھنا اس خاکی پتلے کو، زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔ لوہے کی نہریں بناتا ہے اور ان میں کاٹھ کی ناؤ چلاتا ہے۔ کاغذ کی شریعت پر لوہے کے نوکیلے قلم سے آہنی طریقت کی گلکاریاں دکھاتا ہے۔

عشق کا انکس نہ ہوتا تو یہ مست ہاتھی خبر نہیں کیا خون خرابے کرتا۔ کن کن نیم جانوں کو پاؤں کے نیچے دلتا۔ خدا کی شان ہے محبت کی ننھی سی چیونٹی اس

دیوانے ہاتھی کے اوسان باختہ کر دیتی ہے۔

یہ موسم برسات خاک کے ہر ذرہ میں ایک جان پیدا کر دیتا ہے۔ آسمان سے جو بوند زمین پر آتی ہے، اپنے اندر ایک روح لاتی ہے۔ مگر آدمی کے لئے یہ زمانہ قیامت ہے۔ وہ اپنے کلیجہ کو مسوستا ہے اور بیقرار ہو کر آسمان کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے اے ابر تو آیا مرے پیارے کو نہ لایا۔ کبھی کہتا ہے۔ برسات بھی برسات نہیں۔ خیال کرنا اس اکیلے نوجوان کی حالت کا جو بارش سے پہلے فلسفہ آلہیات پر غور کر رہا تھا، اپنی غیر معمولی قوتوں پر اترا رہا تھا اور کہتا تھا میں سمندر کو خشک کر سکتا ہوں، پہاڑ میرے ہنر سے خاک بن جاتے ہیں۔ میں ہوا کے اوپر اپنے بنائے ہوئے پروں سے پرواز کر سکتا ہوں۔ بجلی میری تابعدار ہے۔ بھاپ پر میری حکمرانی چلتی ہے۔ مجھ میں ہر بڑی طاقت کے مسخر کر لینے کا مادہ موجود ہے۔ میں اپنی کوشش سے آسمان کو زمین پر لا سکتا ہوں اور زمین کو فلک پر پہنچا سکتا ہوں۔

اور اب جونہی کالی گھٹا نمودار ہوئی ہلکی ہلکی گرج کی آواز آئی اور بجلی نے بادلوں سے جھانکنا شروع کیا، جنگل کے مور جھاڑیوں سے نکل کر میدان میں آئے اور جھوم جھوم کر بولنے لگے، حضرت ابن آدم نیم وحشیوں کی طرح مجنونانہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ کبھی داغ کا دیوان اٹھاتے ہیں، کبھی تھیٹر کا کوئی گیت گن گناتے ہیں۔ سامنے کے چمن میں گلاب اور چنبیلی کی ٹہنیوں میں خیالی جھولے ڈال رہے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ ان نازک انداموں میں اتنی سہار نہیں۔

سنتا، دل سے کیا مزے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

وہ اس باغ میں کیونکر آئیں گے۔ راستہ خراب ہے۔ فقط ایک بٹیا ہے۔ اس پر کیچڑ ہوگی۔ اُن کا پاؤں نہ پھسل جائے۔ آس پاس گھانس ہے۔ کوئی جانور نہ نکل آئے۔ کالی چھتری پر بجلی نہ گر پڑے۔ وہ بہت ڈرپوک ہیں بجلی کے ڈر سے آنا

موقوف نہ کر دیں۔ رقیب کا گھر کچی سڑک کے پاس ہے اُس کے ہاں نہ ٹھہر جائیں میں نے غلطی کی باغ کا راستہ پہلے سے درست نہ کرا لیا۔ میں یہاں لوہے کی پٹڑی بچھوا دیتا۔ تاکہ وہ آج کی رات اسپیشل ٹرین میں چلے آتے۔ موٹر خریدنے کا ارادہ ہی کرتا رہا، آج ہوتی تو کام آتی۔

کہتے ہیں ایسے موقعہ پر خدا کو پکارنا چاہیئے۔ وہ کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے۔ میں نے تو آج تک اُس کا احسان نہیں اُٹھایا ہے۔ تو کیا اُسی کو آواز دوں۔ مگر وہ بھی کیونکر آئے گا۔ اُس کے پاس ہوائی جہاز تھوڑی ہے۔

اتنے میں بادل پھٹ گیا۔ سورج نکل آیا۔ تخیلات کا سیلاب اُترنے لگا۔ جذبات کا طوفان تھمنے لگا۔ ہوش ٹھکانے آئے تو جنگل کی جھونپڑی میں رہنے والے شاہ صاحب کے پاس پہنچے اور اپنی تازہ حالت کا استفسار کرنے لگے۔

شاہ صاحب نے کہا بابا مٹی کی طریقت رکھنا اور عشق کا دم بھرنا عقلمندی نہیں محبوب سنگدل ہے اس کے لیئے لوہے کی سڑک بناؤ۔ پیارا پارہ ہے تو آگ بن کر اڑاؤ۔ لکڑی کا قلم توڑو۔ لوہے کے قلم سے رشتہ جوڑو۔ یہ قلم ہر سنگی لوح میں نقش کندہ کر دیتا ہے۔

میاں شریعت علم ہے اور طریقت عمل اور معرفت اس عمل کا نتیجہ۔ برسات کی ہوا نے عشق کو جگایا اور ایک طلب دل میں پیدا کی۔ یہ شریعت تھی مطلوب کو حاصل کرنے کے لیئے گھر سے نکل پڑتے۔ کڑک۔ چمک۔ کیچڑ۔ پانی کی پرواہ نہ کرتے تو سالک طریقت کہلاتے۔ درجاناں تک رسائی مل جاتی۔ جس کے لیئے ہاتھ ملتے ہو وہ ہاتھ آجاتی تو مقام معرفت میں حق الیقین کا درجہ پاتے۔ کتابوں کے کاغذ، طریقت کی کاغذی سڑکیں ہیں۔ ریل کی پٹریاں آہنی راستے ہیں، ان کو دیکھو اور سمجھو۔

انسانی ارادہ قلم و دوات کی مدد سے حروف کی شکل میں کاغذ پر نمودار ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے سلوک کے لئے طریقت بنتا ہے۔ ریل کی پٹریاں زمین پر بچھ جاتی ہیں اور اپنے سینے پر رات دن گاڑیوں کی آریاں چلاتی ہیں۔ تب دور کی منزلیں قریب ہوتی ہیں اور فراق وصال کی شکل اختیار کرتا ہے۔

بھائی یہ زمانہ لوہے کا زمانہ ہے۔ اگلے وقتوں میں زبان نصیحت کرتی تھی اب توپ کا منہ لکچر دیتا ہے۔ سنا نہیں۔ ؎

شاہ جرمن نے کہا ہنس کر جناب پوپ سے
وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہان توپ سے

توپ کا لفظ جلدی اثر کرتا ہے اور جلدی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ خاکی طریقت کے مقابلہ میں آہنی طریقت یعنی سڑک سواریوں کو جلد مقام مطلوب تک پہنچا دیتی ہے۔

طریقت کا کوچہ بڑا سخت ہے۔ اس میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ آجکل کی آہنی ایجادیں ہم کو اشارہ کرتی ہیں کہ ہم بھی اپنے دینی راستہ کو پختہ اور آہنی بنائیں اور اپنے سلوک کی گاڑی جلدی اتنے ظلمات سے گذار کر لے جائیں۔

مگر لوہے کی طریقت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بہت سی گرم بھٹیوں میں جلنا کُٹنا پڑتا ہے۔ اس لوہے کی طریقت کے بھی درجے ہیں جو باطنی طریقت کے درجوں کو ثابت کرتے ہیں۔ پہلا درجہ فولادی ہے۔ اس کے اندر کوئلہ کی کثافت نہیں ہوتی۔ یہ بہت نازک تن اور نازک آواز چیز ہے۔ ذرا سے صدمے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کو توڑو تو ننھے ننھے ذرے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے درجے کا لوہا ظلماتی اثر زیادہ رکھتا ہے۔ اس کو توڑو تو لکڑی کے ریشے نکلتے ہیں۔ تیسری قسم اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ قدرت نے ہر درجہ کی ایک نوکری رکھی ہے جس میں وہ مصروف

رہتا ہے۔ پانی لوہے کا ملک الموت ہے۔ پانی کے اندر اس کو ڈال دو اور کچھ دن کے بعد نکال کر ہوا میں رکھ دو، زنگ کی چادر چھائی ہوئی ہو گی۔ یہ چادر اندر ہی اندر لوہے کے جسم میں گھسی چلی جاتی ہے اور آخر کار لوہے کو خاک کر دیتی ہے یہی حال باطنی طریقت کا ہے۔ اس کے بھی مختلف درجے اور حصے ہیں مگر ہر دو حصہ کو خام خیالی اور بے اعتقادی کا پانی فنا کر دیتا ہے۔ تم اگر پختہ ہوتے اور آہنی طریقت سے واقف ہوتے تو خدا تعالےٰ کی نسبت ایسی بے سر و پا باتیں خیال میں نہ لاتے جس نے تم کو اور تمہارے علم و ہنر اور طاقت خیال کو پیدا کیا ہے۔

# پتھر کی طریقت

از طریقت۔ ستمبر ۱۹۱۴ء

یہ رسالہ جس کا نام طریقت ہے، کیونکر چھپا، اس کا خیال بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ڈاک میں پیکٹ آیا، کھول کر پڑھنا شروع کر دیا اور رائے زنی شروع ہو گئی۔ کاغذ ذرا خراب ہے، چھپائی بھی چُندی چُندی آنکھوں سے دیکھتی ہے، لکھائی بھی بہت خوبصورت نہیں۔

ہاں مضامین کی ترتیب اچھی ہے۔ جذبات عوام و خواص کو یکساں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کہا اور پرچہ رکھ دیا۔ مگر کسی نے یہ نہ سوچا کہ کاغذوں پر یہ حروف کس طرح نقش ہوئے اور کن کن منزلوں کو طے کر کے ہم تک آئے اور ان کے اندر کیا کیا معانی پوشیدہ ہیں۔

یہ غور کس کے حصے میں ہے۔ اُس کے جو پہلے خود اپنے وجود پر فکر کرنے کا عادی ہو، جزو سے پہلے کل، شاخ سے پہلے جڑ پر خیال لیجاتا ہو۔ وہ جب رسالہ

طریقت کو دیکھیگا تو کہیگا کہ اُس کا آنا پتھر کی سڑک سے ہوا ہے۔

پہلے کاپی نویس نے لوگوں کے خیالات کو قلمبند کیا اور زرد رنگ کے کاغذ پر لکھا۔ زرد رنگ اس سے لئے منتخب کیا کہ ہر چیز کی بنیاد عشق و محبت پر ہے اور زردی شان الفت ہے۔ عشق عاشق کو زرد بنا دیتا ہے۔ لہٰذا ان حروف کو جو آخری منزلوں میں اپنی شکل کے سینکڑوں ہزاروں حروف بننے والے تھے، زرد کاغذ پر لکھا گیا۔

اس کے بعد پتھر کی طریقت کا سلوک درپیش ہوا۔ پتھر کی طریقت یعنی چھاپہ کا پتھر بلایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ ان حروف کو جو کاغذ پر شانِ یکتائی میں ہیں رنگ کثرت عنایت کر۔ پتھر نے کہا توبہ توبہ میری کیا مجال ہے جو کسی کو کچھ دوں یہ قدرت تو کسی اور ہی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تو میرے سینے پر نقش غیر کندہ ہیں جب تک یہ نہ مٹ جائیں، کوئی سلوک کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ سن کر دستِ غیبی آگے بڑھا۔ دو پتھروں کو سینے سے ملا کر رگڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں نقشِ غیر فنا ہو گئے۔

جب پتھر سے نقشِ غیر مٹ گیا تو کہا گیا کہ لے ان نئے حرفوں کو سینے میں جگہ دے۔ پتھر نے آہ سرد بھر کر کہا کہ ابھی ایک امتحان اور باقی ہے۔ امانتِ عشق کو سینہ میں رکھنا آسان نہیں۔ پہلے آتشِ شوق سے سینہ گرما لوں، مہمان کے قابل گھر کو بنا لوں تو لبیک کہہ کر خیر مقدم کو آگے بڑھوں۔

پتھر کو آگ سے سینکا گیا، سوز و ساز کا مزہ چکھایا گیا۔ انگلیوں نے اس کے بدن کو چھو کر دیکھ لیا کہ ہاں نارِ ذوق اس کے اندر خوب سرایت کر چکی تو کاپی کا کاغذ منگایا گیا اور پتھر کی چھاتی سے اس کو چپٹایا گیا۔ کاغذ گرمی کی تاب نہ لایا اور پتھر و حروف کے اسرار وصال کی شرکت کو برداشت نہ کر کے کہیں غائب ہو گیا۔ اب جو حرفوں نے آنکھ کھولی تو اپنے سوا کسی کو نہ پایا۔

باہر والوں نے غلیظ کثافتوں کو صاف کیا اور لوہے کے قلم لے کر حروف کی نوک پلک تراشنے بیٹھے۔ اس وقت دیکھا تو حروف اُلٹے نظر آئے۔ گھبرا کر پوچھا تمہارا کیا حال ہے۔ حروف نے جواب دیا جس کا باطن سیدھا ہے اس کا ظاہر اُلٹا نظر آتا ہے بندہ اس کو نہیں سوچتا۔ اس واسطے تغیراتِ عالم سے گھبراتا ہے۔

تزکیۂ ظاہری ہوچکا تو پتھر کو شین کے اوپر رکھا گیا اور اس پر سیاہی کا بیلن پھیرا گیا اور اوپر ایک کاغذ ڈھک کر مخفی حجرے میں دھکیل دیا گیا اور فوراً باہر بلا لیا گیا۔ دیکھا تو حروف کا ایک دوسرا ہمشکل اوپر کے کاغذ پر موجود تھا۔

اسی طرح سینکڑوں ہمشکل بنتے چلے گئے اور ان سے یہ رسالۂ طریقت تیار ہوا۔ گویا یہ طریقت پتھر کی طریقت ہے۔ منزل سنگ کو طے کر کے ہم تک آئی ہے۔ دیکھئے پتھر کی طریقت آیندہ زمانہ میں کیا گل کھلاتی ہے۔ ابھی تک تو اطمینان ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر اقبال کا بیان ہے کہ فقیر اور طریقت مآب لوگ پالٹیکس میں حصہ نہیں لیا کرتے اگر یہ ڈپلومیسی کا اظہار نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں سنگِ لرزاں بنا رہوں۔

---

# کھوپری کی صدا

از رسالہ مرشد دہلی ۵۔ مارچ ۱۹۱۳ء

مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلوی کے ملاقات خانہ میں طاق کے اندر ایک کھوپری رکھی ہے اس پر شیشہ کا خوبصورت سرپوش ڈھکا ہوا ہے اور سنہری ہار اوپر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بہت پرانی ہے، یورپ سے لائی گئی ہے کسی رومی یا یونانی

کی ہے۔ روم اور یونان کے باشندہ کی ہو یا کسی اور ملک کی ہے کھوپڑی۔

یہ فطرتی ظرف ہے، اس مظروف کا جو امیدوں، ولولوں، خواہشوں اور اولوالعزمیوں کا طوفان خانہ تھا مگر اب خالی کھنڈر ہے، اب ویران گنبد ہے۔ اس کی آبادیاں اُجڑ گئیں اس کی سرمستیاں نابود ہوگئیں۔ اس کھوکھلے وجود میں اب خودی باقی نہیں رہی۔ سوائے اس کے کہ ہم اپنی مستعار خودی کو اس کے اندر لے جائیں اور ذرا آزادی کے جوش کو اپنی آواز میں بھر کر زور سے بولنا شروع کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ گنبدِ خاموش بھی صدائے بازگشت سے ہم کو جواب دیگا۔

اگر ہم نے ہستی کی مستی میں الحیات الحیات پکارا تو کھوپڑی بھی الحیات الحیات کہے گی۔ مگر اس کی جواب بے حیات میں اثر مات ہوگا۔ ہمارا سوال ہمارے علم و ادراک کے ماتحت پیش کیا جائے گا۔ کھوپڑی کے جواب میں بھی ہمارے ہی تصور کی کیفیت ہوگی۔ اور یہ سچ ہے کہ آدمی اپنے ہی تصور سے بولتاہے اور اپنے ہی تصور سے جواب لیتاہے جن کھوپریوں پر حکومتوں کے تاج ہیں وہ بھی مبتلائے حیات غرور ہیں، اور جن کھوپریوں پر غربت و بےکسی کا بوجھ رکھا ہوا ہے، اُن کو بھی (اپنی حیثیت کے بموجب) زیستِ چندروزہ کا غرور مطلوب ہے۔ کہ غرور ایک شانِ کبریائی ہے جو بندہ نے خدا سے پائی ہے۔

**تنازع للبقا** کا مسئلہ فلسفیوں نے اسی نکتہ سے پیدا کیا ہے کہ کائنات کا ہر وجود اپنے بقاو قرار کے لئے حرب و ضرب میں مصروف ہے لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب متاعِ قلیل کے لئے یہ رزم کاریاں ہیں تو متاعِ کثیر جو حیات آخری اور زلیست عقبےٰ ہے، کیسی سخت جدوجہد کی طلبگار ہوگی۔ اس بقائے فانی کی خاطر کائنات گیر نزاع برپا ہے، تو بقائے لافنا کے لئے تو سینکڑوں ہزاروں حصے زیادہ رزم کاری چاہیئے۔

آج یہ کھوپری ہڈی کا تابوت ہے، کل اس کو ایک دل پر، دو آنکھوں پر، زبان پر

ہاتھوں پر، پیروں پر ایک شاہانہ اقتدار حاصل تھا۔ اب وہ اقتدار فنا ہوگیا اور یہ پیکر پیام عبرت بن گئی اور اس نے کہا میں چھوٹی تھی۔ بڑی ہوئی۔ اور اپنی بڑائی پر گھمنڈ کرتے کرتے سڑ گئی (پس تجھکو اپنی دولت و اولاد سے متعجب نہ ہونا چاہیئے کیونکہ خدا تعالےٰ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ حیاتِ دنیا کے عذاب میں تجھکو مبتلا کرے۔)

اس کھوپری والے کو بھی اچھا کھانے، اچھا پہننے، عیش کرنے، اکڑ کر زمین پر چلنے اور عزت والا بننے کی تمنا تھی۔ یہ بھی چاہتا تھا کہ حیاتِ دنیا آرام سے گزر جائے اور عاقبت سے بے پروا تھا۔ اس کو بھی اسباب دنیا کے سوا زندگی کی کش مکش میں کسی دوسری بات کا خیال نہ آتا تھا۔ اس کے اندر بھی رات دن دنیاوی حریت و آزادی کی آندھیاں چلتی تھیں اور آخرت کے سب چراغ گل کر دیئے گئے تھے۔ آج اس کو معلوم ہوگیا کہ حیاتِ دنیا تو پانی کا ایک بلبلا تھا جس کے اندر غرور کی ہوا زور کر رہی تھی، وہ ٹوٹ گیا تو کچھ بھی باقی نہ رہا۔ کہاں ہے نمرود۔ کہاں ہے فرعون۔ کہاں ہے شداد کہاں ہے سکندر کہاں ہے نپولین (کہاں ہیں گزرنے والے وہ سب بادشاہ جنھوں نے اونچے اونچے محل بنائے تھے۔ وہ تو بوسیدہ ہڈیاں ہوگئے۔)

# "ا"

# الف خالی

ازرسالہ صوفی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء

حرفوں کی فوج کا کمانڈر سب کے آگے کیسا تنا ہوا سیدھا کھڑا ہے۔ اس کا نام الف ہے اور بچے اس کو الف خالی پڑھتے ہیں۔

حرف جتنے ہیں سب اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ ایک دوسرے کا کوئی شریک نہیں۔ الف کو بے سے غرض نہیں۔ بے تے سے سروکار نہیں رکھتی۔ تے جیم اور دال سے بے تعلق ہے لیکن معانی کا مقابلہ پیش آتا ہے تو یہ سب حروف آپس میں مل جاتے ہیں اور موقع موقع کی کمینگا ہوں میں پرے جماکر نمودار ہوتے ہیں۔

حروف کا حال اور ہے اور قال اور۔ حال تو یہ ہے کہ ان کی شکل مفرد نظر آتی ہے اور قال میں ہر حرف کئی حروف کا مرکب ہے۔ مثلاً اس مضمون کے عنوان کو دیکھیے سب سے اوپر ایک صورت " ا " کی ہے۔ اس کو دیکھو اور زبان سے نہ پڑھو تو ذہن میں مفرد پیکر ہے۔ لیکن جب زبان سے پڑھو گے تو الف، لام، فے، تین حرفوں کی ترکیب سے ایک ذات مرکب معلوم ہوگی۔

ایک دن میں نے سپہ سالار افواجِ حروف سے دریافت کیا کہ "ہو آر یو" تم کون ہو؟۔ الف نے جواب دیا۔ "آئی ڈونٹ نو۔" میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں! اور کہاں سے آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں۔

میں نے کہا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری ایک شکل وصورت ہے۔ تم سے دنیا کی بول چال میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ ہر حیوان ناطق تمہارا محتاج ہے۔ تم نہ ہوتے تو سارا جہان گونگا ہوتا۔

الف بولا۔ جناب عالی! آپ کو میرے وجود کی تحقیقات کا فکر ہے اور میں دردِ عشق سے تڑپ رہا ہوں۔ اس بیکلی میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور بے اختیاری یہی زبان سے نکلتا ہے کہ میں آپ کے سوال کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مکتب کے ایک بچے نے پڑھا۔ الف خالی بے کے نیچے ایک نقطہ۔ مجھکو تو یہ صدا معمولی معلوم ہوئی۔ مگر الف آہ کہہ کر بلبلا اُٹھا۔

تعجب، حیرت، تو کیوں بیقرار ہوگیا۔ بے کے نقطے نے تجھ پر کیا اثر ڈالا؟

نہیں مجھے بے کے نقطے سے تکلیف نہیں ہوئی مجھ کو اس کا ملال ہے کہ میں خالی ہوں۔ ہائے میں خالی نہ تھا مگر اب خالی ہوں۔ میں اکیلا نہ تھا۔ مگر اب تنہا ہوں تم نے وصل کی لذت ہی نہیں چکھی تو فراق کی تلخی کیا سمجھو گے۔ میں وصال کی بہار دیکھ چکا ہوں مجھکو یہ زمانہ میسر آچکا ہے۔

آہ اب خالی ہوں۔ بچے بھی خالی کہہ کر پکارتے ہیں ہجر بُری بلا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اس ہجر کی ہے جس میں آرزوئے وصل ہوتی ہے، اور دوسری وہ ہے جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ یہ بہت سخت ہے۔ ناقابل برداشت ہے۔ پہلی قسم میں صرف شوق واشتیاق ہوتا ہے۔ ارمانوں کے ولولے طوفان اٹھاتے ہیں۔ آنکھوں کو رُلاتے ہیں۔ آنسو برساتے ہیں۔ دل میں تڑپ ہوتی ہے۔ امیدیں پھڑکتی ہیں۔ مگر یہ تکلیف نہیں ہوتی جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ وصل کے بعد جو ہجر ہو۔ وہ گذشتہ ذوق شوق کو سامنے لاتا ہے۔ تخیلات وتصورات سے نقشے بنواتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں دیتا ہے اور دل وجگر پر چرکے دلواتا ہے۔

میں مدت مدید تک لطف یکتائی اٹھا چکا ہوں۔ میں اس کا بن چکا ہوں۔ وہ میرا بن چکا ہے جس کی یاد میں آج آگ کے بستر پر لوٹ رہا ہوں۔

الف! جی کو سنبھال۔ تو اتنا کیوں بے چین ہوتا ہے۔ ہم نے تو تجھکو ہمیشہ خالی ہی پایا کبھی کسی کو تیرا شریک زندگی نہ دیکھا۔ خبر نہیں تو کس کو یاد کرتا ہے۔ کس کی یکجائی کا قصہ کہتا ہے۔

کیا وہ بھی کوئی الف تھا، یا وہ کوئی نقطہ تھا۔ یا اور کوئی ایسی چیز تھی جس کی فرقت تجھکو ستاتی ہے اور یہ فریاد زبان سے نکلواتی ہے۔

ہاں تم نے اس کو نہیں دیکھا۔ ہاں کسی نے بھی اس کو نہیں پایا۔ وہ حسین نہ تھا جس کو دوسرے حسن پرست دیکھ سکتے۔ اس میں رعنائی و نازو انداز نہ تھے جس پر کسی غیر کی

نظر پڑتی۔ وہ نگاہ بشر سے بہت اونچی اور بہت ہی اونچی چیز تھی۔

تو پھر وہ کیا تھا۔ بتا کہ وہ کب تھا اور اب کہاں ہے۔ سیدھے سادے الف کیا تیرا دماغ کچھ خراب ہوگیا ہے۔ یہ تو کیسی بے سر و پا باتیں کرتا ہے؟

الف چپ ہوگیا۔ اس کی حیرت خیز خاموشی عالم تصویر بن گئی اور اس کے آگے سے سب حروف اس مینارِ سکوت کو غم کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

سنو! الف خود بخود کچھ کہہ رہا ہے۔ دیوانوں کی طرح بہک رہا ہے اور بڑ مار رہا ہے۔ جیسے مجذوب بے سر و پا باتیں کرتے ہیں یہ بھی کچھ بک رہا ہے۔

"میں ایک ہوں۔ میرے معنی بھی ایک ہیں۔ میری شکل بھی واحد ہے۔ میں مثالِ وحدت ہوں۔ میں خیالِ یکتائی ہوں مگر آہ کثرت کے جیل خانہ کا قیدی ہوں دور ہوں مہجور ہوں۔ رنجور ہوں۔

پیاری بے۔ نقطے والی بے۔ اپنے نقطہ کو دور کر دے تو حرف موہوم اور خطا بیکار رہ جائے۔ میں جب سے اپنے پیارے نقطے سے جدا ہوا ہوں جوں کا توں موجود ہوں فنا نہیں ہوا۔ نابود نہیں ہوا۔ کاف۔ نون۔ میرے رقیب ہیں۔ کُن بن کر آئے اور میرے پیارے کو بہکا کر لے گئے۔

اس کا وعدہ تھا۔ میں تیرا بن کر رہوں گا۔ وہ اقرار کر چکا تھا مگر حمد و محمود کے الجھاؤ نے کن کو نمودار کیا اور کُن نے آتے ہی سب اقرار بھلا دیئے۔

آہ! وہ بھولتا نہیں تھا۔ بھول چوک سے پاک تھا۔ ہر چیز پر قادر تھا۔ وہ مجھ سے کیوں جدا ہوگیا۔ یہ کیا اس کے جی میں آ گئی؟

میں الف ہوں۔ وہ بھی الف تھا۔ کن سے پہلے وہ میرے ہاں تھا۔ میں اس کے ہاں تھا۔ میں وہ تھا۔ وہ میں تھا۔ میں تن تھا۔ وہ جان تھا۔ وہ تن تھا۔ تم نے کہا میں اور میرے ماتحت حروف انسان کی زبان ہیں۔ وہ ہمارے ذریعے بولتا ہے۔ حرفوں کی ترانو

میں مطالب تولتا ہے۔ تم نے غلط کہا۔ نہیں تم نے صحیح کہا۔ بتا نا میں نے کیا کہا؟

میں دیوانہ ہوں، مستانہ ہوں۔ تم اسے آدمیوں۔ میرے ذریعے بولتے ہو میں کس کے سہارے بولوں؟ میرے پاس حرف نہیں ہیں۔ میں کس کے الفاظ بناؤں اور کس چیز سے اپنے مطالب کو اس کے سامنے لیکر جاؤں۔؟

اگر وہ حرفوں اور لفظوں کا محتاج ہے۔ تو میرا مطلوب کیوں بنا ہے۔ خالی ہاتھ والے کے دل میں کیوں آیا ہے؟

اور اگر وہ ان ذریعوں کی پروا نہیں رکھتا تو اقرار پورا کرنے کیوں نہیں آتا۔ مجھکو اپنے پاس کیوں نہیں بلاتا۔ یہہ دیوار کیوں چنوائی ہے۔ یہ کیا اس کے جی میں آئی ہے؟

الف ہوشیار۔ لام کو دیکھ۔ میم کو دیکھ داؤ کو دیکھ سب خالی ہیں۔ ک۔ ع ص۔ س۔ د۔ ر۔ ط۔ بھی تیرے جیسے مہجور ہیں۔ تو اکیلا خالی نہیں ہے اور بھی ہیں۔

ہاں اور ہیں۔ مگر ان کی تنہائی اور میری تنہائی میں فرق ہے۔ وہ بلبل ہیں، میں پروانہ ہوں۔ وہ حصار میں محفوظ ہیں۔ میں دروازوں کے تیر دلہا کا نشانہ ہوں۔ نوکیلے تیر سینہ کے پار ہوجانے والے تیر مجھے چھلنی کئے دیتے ہیں۔

الف کی یہ بے معنی غیر مفہوم مگر مزے دار باتیں سن کر میں نے بڑا تعجب کیا کہ تصوف سے تعلق رکھنے والی بے نتیجہ باتیں بھی اتنا کیف رکھتی ہیں تو با نتیجہ حالات میں کیا سرور ہوگا؟ طالبوں سے کہو اندر آکر دیکھیں اور اس حلقہ تک پہنچیں جس کے سایہ اور عکس کی یہ ادنیٰ اسی کیفیت ہے۔ ورنہ کبیرداس کی زبان میں کہدیں۔ ~~

کبیرا بھلا ہوا۔ ہر بسہرے۔ سر سے ٹلی بلا      اور ہر ہارا ہمیں جپے ہمری جپے بلا

# یورش
## ارواح کی اجسام پر

از رسالہ صوفی. جون ۱۹۱۴ء

سفید سورج کی روح حرارت، کالی رات کی روح برودت، بہتے پانی کی روح حیات، کھڑے کنارے کی روح نظربازی، حیوان کی روح نادانی، انسان کی روح دانائی، دانائی کی روح ہوش مندی۔ اور ہوش مندی کی روح کبریائی۔

دیکھنا آپس میں کیا سرگوشیاں کرتی ہیں۔ کس شاندار مہم کے لئے سازش کر رہی ہیں۔ تلک الایام نداولہا بین الناس کا خدا بھلا کرے جس نے اس جوڑ توڑ کی خبر دے دی ورنہ خبر نہیں کس قیامت کا سامنا ہوتا۔ سورج کی روح نے کہا میں نے اجسامِ زمین۔ قمر۔ مریخ۔ مشتری، زہرہ وغیرہ کی پرورش میں عمر تمام کر دی مگر مادی پتلوں نے میرا ایک گُن نہ مانا۔ ہے شرط کہ ان سب کو نظرِ قہر سے فی النار کر دوں۔ شبِ تاریک کی روح بولی، میں اصل بنیاد کل کائنات کی ہوں۔ اجسام کی پردہ پوش ہوں لیکن اب اجساد کی شیطنت حد سے بڑھتی جاتی ہے۔ کیوں نہ میں ان کا پردہ فاش کر دوں ؟

رواں دواں پانی کی روح نے بہتے بہتے آواز دی۔ کلّ شیءٍ حیٍّ من المآء۔ مادیات کی سورتوں سے کہہ دینا کہ احسان فراموشی کی تو زندگی وبالِ جان بنا دوں گی کھڑے کنارے کی نظرباز روح چنگھاڑی۔ اگر بدن دقتِ منتظر سے انکاری ہے تو اس کا ملیا میٹ کر دینا مجھے کیا بھاری ہے۔

حیوان کی نادان روح پکاری مجھ میں عقل نہیں جو تمہاری رائے وہ میری رائے۔
انسان کی دانا روح گویا ہوئی " انا امر ربکم الاعلیٰ " میں نے امانت خاص کو دوش پر رکھا۔ میں کُن کی علمدار ہی تفس خاکی میں رہی تو کیا یہ اجسام مجھ کو بھول کر سلامت رہ سکیں گے۔ کہدو ناممکن، ناممکن، ناممکن۔
اس مشورت کا انجام نتیجہ، حاصل ایک یورش ہوگی یلغار خونخوار اور حملۂ پُرخروش ہوگا۔
اے بدلنو! اے دنیا کے مادی جسمو! تم نے اپنے بچاؤ کی کیا صورت اختیار کی ہے؟

**امریکہ کا جواب:۔** "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" ورنہ میں نے تو مادہ پرستی اور تن پروری کو چھوڑنا شروع کر دیا ہے امور روحانی کے آگے میرے باشندے سر جھکاتے جاتے ہیں۔

**یورپ کا اظہار:۔** کچھ پرواہ نہیں۔ ارواحِ موہوم کی یورش کو دیکھ لیا جائے گا۔ میرے اندر ہنر ہے اور کاریگری ہے جس سے ہر روح اسیر پنجۂ مادی ہوسکتی ہے۔ اور روح کے وجود سے انکار کر دینا بھی ممکن ہے۔

**چین کا بیان:۔** میرا تو رنگ ہی زرد ہے جو پرتو روحانی کی شہادت دیتا ہے میں نے تو عیسائی مذہب کے لئے خدا سے اسی لئے دعائیں مانگی تھیں کہ برکت روحانی میری مشکلات کا خاتمہ کر دے۔ آئندہ بھی کسی حکم روحانی کی تعمیل سے انکار نہیں۔

**ایران کی فریاد:۔** دیکھنا میں پہلے ہی ویران ہوں۔ ایران نہیں ہوں بلبل کی روحانیت تلے جیتا ہوں۔ مجھ پر تو نظرِ کرم ہی رکھنا۔

**افریقہ و عرب کی گفتگو:۔** مت گھبراؤ۔ اے روحو! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے دشمنوں کا مقابلہ سب سے پہلے ہم کریں گے۔

**ہندوستان کا جواب:۔** ست گرو کے چرنوں کی قسم! میں پرماتما کا جوگی روگی ہوں۔ لڑنے جھگڑنے کا وعدہ نہیں کرتا۔ یہ جھگڑا تو عرب و افریقہ کا ہے۔ ہاں دل سے تم سب ارواح کا ساتھی ہوں۔ پرماتما تمہاری بھلی کریں۔

**فیصلہ** عالم جبروت میں یہ حکم کلام کر چکا۔ تو صدائے باہوت نے ارشاد فرمایا کہہ دو ناسوتیوں سے۔ ارواح ہوں یا اجسام کہ ہم مستقیم حقیقی ہیں۔ ذرہ ذرہ کے اقرار و انکار کو تول رہے ہیں۔ لینے دینے کا وقت بھی قریب آگیا ہے۔ آپس میں دست و گریبان نہ ہو۔ ہماری ترازو کا کام ختم ہو لینے دو۔

## ڈراپ

پلکیں تھرتھرائیں، پتلیاں اشکبار ہوئیں۔ کان وجد میں آئے۔ دل و دماغ محو ہو گئے۔ جب کہ یہ سب دیکھا سنا اور ڈراپ سین کو گرنے سے نہ روکا۔ تو ناسوت میں بھی ملکوت و جبروت و لاہوت و ہاہوت کے جلوے نظر آنے لگے۔

# خطیب کا غذفام

از اخبار خطیب دہلی جنوری ۱۹۱۵ء

تین سیڑھی کے ممبر قدیم پر زبان بولتی تھی اور خطیب کہلاتی تھی۔ آج ممبر جدید کی شکل تو ویسی ہی تثلیثی ہے مگر اسپر کاغذفام خطیب قلم کی زبان سے چھپتا ہے۔

جن کو لغت کی بحث کرنی آتی ہے، وہ کہیں گے کہ خطیب عربی کا ایک جامع لفظ ہے جو ہر اچھی بات کے دہن فصیح سے نکلنے پر صادق آتا ہے۔ اس لئے اخبار "خطیب" مذہب، تمدن۔ ڈراؤنی اور ان کہی چیز پر جس کو کان میں سنا جائے تو سیاست و پالیٹکس کی آواز آئے، بحث کر سکتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ ان اخبار فروشوں نے خطیب کے کیا کیا مقاصد تجویز کئے ہیں اور جو بھی ہوں، مجھے اس سے کیا۔ میں تو اپنے کاغذ فام گلفام کو ایک پیشگی بوسہ بھیجنے کے لیے حرفوں کا توڑ جوڑ کرنا چاہتا ہوں۔

خطیب کا غذ فام نے نہ ابھی جوانی کی راتیں دیکھی ہیں، نہ مرادوں کے دن پائے۔ ابھی تک خدا نے بری نیت کے شاعروں سے اس کے دامنوں کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ مگر کب تک؟ بتِ ہرجائی انگشت نمائی سے محفوظ رہے گا۔ شمع بنیگا تو بے شمار پروانے فدا ہونے کو نکل آئیں گے۔

کیوں! پیارے گلفام۔ ابھی تو تم فتنہ ہو، فتنوں کے زمانے میں خدا رکھے پروان چڑھنے نکلے ہو۔ جب قیامت بنو گے اس وقت تو بھلا ہم غریبوں سے کہاں آنکھ ملاؤ گے۔ پر آج تو ایک نگاہ طفلی سے ادھر دیکھو اور ننھے ننھے ہونٹوں سے کچھ گل افشانی کرو۔

ہاں۔ہاں۔ میں نے سنا۔ واہ کیا بات ہے، کیا گھات ہے۔ ماشاء اللہ سبحان اللہ مگر ان ندیدے لوگوں کو تمہاری زبان میں نہ سننے دوں گا۔ اپنی زبان میں صدائے بازگشت کے طور پر سناؤں گا۔ تاکہ تمہاری کنواری آواز میرے ہی لئے مخصوص رہے۔

صاحبو! دل جان خطیب تم سے یوں خطاب کرتا ہے۔ پروانو، مستانو، دیوانو۔ ہوشیار باش۔ بیدار شوید۔ سمندر فضائے آسمانی میں بہنا چاہتا ہے۔ تودۂ خاک اپنے ذرّوں کو موجوں میں لئے آتا ہے۔ اس کام میں اس کا ہاتھ ہے جو جگ داتا ہے۔

اب کاغذ کی جنس میں ایک نوع خصوصی جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اس کی ہر ادا گوشِ ہوش کے لئے انمول موتی ہے وہ علم کے دریچوں میں عمل کے فانوس روشن کرے گا۔ وہ سنسان ویران محفلوں میں طوطی شکر مقال بنے گا اور اس کی پہلی صدا یہ ہوگی ،

حق ہے باری تعالیٰ، حق ہے کملی والا، حق ہے سب کا حق، حق نے حقوق کو پیدا کیا اور بندوں کو ان کی شناخت اور گرفت پر شیدا کیا۔ حق ہی نے کہا کون اس امانت کا حق دار رہے؟ حق ہی نے جواب دلوایا کہ یہ بندۂ آدم اس نعمت کا سزاوار ہے۔ وہ امانت اس کو مل گئی جو سر تا سر حقوق میں غرق تھی اور عشق اس گھٹا کی برق تھی

آدم نے خالقِ دم کی امانت کو سینے سے لگایا۔ حقوق کے جواہرات سے جڑے ہوئے زیور کو گلے کا ہار بنایا جب آدم کہلایا۔ ہر حق میں مطلب کی جھلک تھی اور ہر جھلک کی ایک پلک تھی اور ہر پلک میں نوک تھی اور ہر نوک میں ایک کھٹک تھی۔ ہر کھٹک میں تلخی و شیرینی تھی اور اسی تلخی و مٹھاس پر دنیا کے کاروبار تھے۔

کبھی دیکھا کہ حقوق اللہ کے مطالبے ہیں اور نفس و شیطان اس کی کڑواہٹ سے منہ بناتے ہیں، کبھی سنا کہ حقوق العباد کی پکار رہے اور ناحق شناسوں کی حالت زار و نزار رہے۔

حقوق اللہ کہتے تھے پہلے حقوق بندگان کی حفاظت کرو کہ ہم بھی اسی پیکر کی روح رواں ہیں۔ حقوق العباد آواز لگاتے تھے کہ نہیں ہم بھی سایۂ رب کے امیدوار ہیں

خیر نہیں ان دونوں میں کسر نفسی کون کرتا تھا مگر سچ یہ ہے کہ ہر ایک صداقت و راستبازی کا پُتلا تھا۔

خطیب کا نند فام حقوق فریقین پر نظر ڈالے تو اس کو رفتار، کردار، گفتار کے بے شمار میدان مل جائیں اور ہر گھر کے نیک و بد انسان اس کی بات سننے باہر نکل آئیں۔ مگر صاف بات ہے۔ میں اس وقت اس کے پاس کبھی نہ جاؤں گا۔ ہرجائیوں کی بیوفائیاں دیکھ چکا ہوں۔ بھلا میں اس کے قابو میں آؤں گا؟ وفا اور ایک در گیری ایک حق مشترک ہے جس کو عبد و معبود دونوں اپنا بناتے ہیں۔ کیا یاد نہیں کہ برٹش سرکار کے کارندے لفظِ وفا کو دودھ کی چار پلاتے ہیں۔

خود خدا کا بیان ہے کہ وفا میرا اصلی ارمان ہے جس کی خاطر بنا یہ سارا جہان ہے جو بے وفائی کرتا ہے مشرک کہلاتا ہے اور بارگاہ الٰہی سے بڑی سزا پاتا ہے حکومت بھی بے وفاؤں کو پھانسی پر لٹکاتی ہے۔ سوسائٹی بھی ایسوں کو منہ نہیں لگاتی ہے، پھر میں کہ عبد و معبود کا ایک ثالث تماشائی ہوں کیونکر اس متعدی خواہش کا شریک نہ ہوں۔

جو خطیب ہر متوالی آنکھ کا تارا ہو وہ میرا کیونکر دل آرا ہو۔ میں تو خدا کی ہر دلعزیزی پر بھی بدگمان سا ہوتا جاتا ہوں۔ جب وہ اپنے حقوق کی باز پرس کرسکتا ہے تو مجھ کو بھی اجازت ہونی چاہیئے کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کروں اور پوچھوں کہ تمہارے لئے تو مجھ جیسے بے شمار ہیں مگر تم میرے لئے یکتا و فرد ہو۔ پھر کیا معنی کہ تم اپنی یکتائی و وحدت کے جلوے اوروں کو بھی دکھاتے ہو۔ یا تو میرے لئے مخصوص ہو جاؤ اور ایک صفت میرے واسطے ریزرو کردو۔ یا مجھ سے یہ تقاضا نہ کیا کرو کہ ہمارے سوا کسی اور پر نظر نہ ڈالنا۔ کسی غیر کے اپنے نہ بن جانا۔

خیالات تو بہت کچھ آتے ہیں مگر اسکا کیا علاج کہ دل خدا کے قبضہ میں ہے۔ جب ایک ہم نیا رہوتی ہے، دل اس کو پراگندہ کردیتا ہے۔

یہ خطیب بھی کاغذی دل ہے۔ کس کو خبر ہے کہ خدا اس سے کیا لے گا اور کن کن کے مجوزہ نقشے برباد کرائے گا تو لاؤ اپنے ارادے کو ابھی سے اس کے سامنے رکھدوں اور کہوں کہ اے کاغذ فام خطیب! جب تو بندوں کو ان کے مذہبی اخلاقی، تمدنی، آن کہنی حقوق یاد دلاتا اور سکھاتا ہے تو ذرا ان سے بھی کچھ کہیو۔ جن کا تو پیام رساں ہے کہ وہ بھی اپنے دست توانا کو حرکت میں لائیں اور بندوں کو خطیب کی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دیں اور قدرت حسن نظامی کو اسیری تخیلات سے آزادی بخشیں۔

# جھینگر کا جنازہ

از خطیب ، ۷ مئی ۱۹۱۵ء

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا ۔ بڑا موذی تھا ۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا ۔ افوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں ، جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا ، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے ۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل اُتارتا تھا ۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں ، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا ۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے ۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا ؟ اُچھل کر بولا ۔ ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا ۔ "سبحان اللہ ، تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے ۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے ۔ بولا واہ ۔ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں ، لہٰذا وہ بوجھ اٹھانیوالے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے ۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی ۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں ۔

جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے ۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو ۔ جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا ۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ واہ خفا ہو گئے

بگڑ گئے۔ لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشہ دیکھا تھا، آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور اس کو دیوار پر کھینچے لئے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جیسے تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بیچارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہو گے؟

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دُکھایا تھا لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں، بوریہ کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لئے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوہ طور ہے۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی

پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بیچارہ دنیا میں باقی رہگیا ہے

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کردیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا۔ "ویسٹ منسٹر ایبے" یا قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی آفریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں، کالی جو چیز بھی ہو، ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہو۔

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے ٭ قیصر کا پیارا ہے لے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال، ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو چیونٹی کے پیٹ کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے

---

# من کہ ایک دھوبی

## کاغذی گھاٹ پر

از خطیب۔ ۳۰۔ جون ۱۹۱۵ء

جاری جا۔ میں روٹی نہیں کھاتا۔ چاولوں کی بیچ اُدھر کنارے پر رکھ دے اور ایک

چلم بھر کر لا۔ دم لگاؤں دھواں اُڑاؤں غم مٹاؤں۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

کیوں ری تنوا کی ماں ! دریا کا پانی گدلا، صابن کم، میں کیونکر ان میلے کپڑوں کو صاف کروں، چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

دیکھ درخت کا پتہ سوکھ کر گرا۔ ہوا اڑا کر لے چلی۔ اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب ملیگا

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا، گھوڑوں سے تیز، ریل سے زیادہ تابعدار۔ پھر تو کہتی ہے کہ امیر بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں بڑائی میرے دم سے ہے۔ میں اُجلے کپڑے نہ پہناؤں تو ان کی عزت دو کوڑی کی ہو جائے۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

بھر لے حقہ مار لوں گھونٹ بپتا چھا گئی چاروں کھونٹ

سنتی ہے۔ اس کاغذی گھاٹ پر آئی ہے۔ چنری، چولا دھلوانے لائی ہے تو میری بات مان۔ یہ چولا من کے صابن سے دُھلے گا جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤں گا۔ نیچے آگ جلاؤں گا اور پھر یہ گاتا جاؤں گا۔

ار ـــــــــــ ہو ـــــــــــ ار

کیوں رے چولے کا لوں تیرا میل۔ پانی اُبلا جوش میں آیا۔ تو گھبرایا میل کٹا پاک ہوا۔ صاف ہوا۔ اب کیسی سی سی آہ۔

ار ـــــــــــ ہو ـــــــــــ ار

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

یہ تن، وہ من۔ تو دھوبن میں دھوبی۔ سب ہیں ساجن۔ تو دھوبن میں دھوبی

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

سکھنے دے ہم کمین ہیں۔ ہم موٹے وہ مہین ہیں۔ دیکھتی نہیں سارے باریک میرے ہاتھوں میں ہیں اور میں ان کو پتھر پر پٹخارہا ہوں۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

یثرب نگر کے چودھری نے کہا جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دھونے آیا تھا، اسلام غریبوں سے شروع ہوا اور پھر غریبوں میں آجائے گا، تو بس ہم تم دونوں اپنے چودھری کے بیان پر مگن ہیں۔ اسلام ہم میں، ہم اسلام میں۔ اور سب امیر پیسہ والے من دتو کے کلام میں۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو،

(۳)

چھیّو رام۔ چھیو۔ چھیو۔

پکا پکو کر وہیں دھریا۔ لے جاری وہیں دھریا، تجھ سے اتنا کہا۔ میں روٹی نہیں کھاتا۔ آن اور جل دو بہن بھائی ہیں۔ آن نے باوا آدم کو جنت سے نکالا جل نے پاؤں میں بیڑی ڈالی۔ آدھی رات سے اس دریا میں کھڑا ہوں اور پانی کا قیدی ہوں جب جل نے جلایا تو اُس کی بہن آن سے کیا محبت ہو؟

چھپّو رام۔ چھیو۔ چھیو۔ چھوا چھو۔ چھیو۔

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوئے

میں میلی پیا اجلے ری میں کس بدھ ملنا ہوئے

چھیّو رام۔ چھیّا۔ چھیّا۔

کپڑے دھوئے۔ ساری عمر دریا کے کنارے گزر گئی۔ مگر اپنا آپا میلا کا میلا رہا۔ صاف ستھرے اور اُجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہو گی اور اس تک کیونکر پہنچنا نصیب ہو گا۔

چھیوٗ رام، چھیوٗ رام، چھوا چھو۔

اچھا ری ذرا ایک بات اور سنتی جا۔ دیکھیو خدا آسمان کی کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ پورا تو سمجھ میں نہیں آیا سوائے اس کے کہ اس نے کہا۔

رام جھروکے بیٹھ کے سب کو مجرا لے جیسی جا کی چاکری ویسا وا کو دے

تو جب اس کی دین چاکری پر ہے تو لا میں بھی اس دنیا میں جہاز چلاؤں۔ دھوبی کیوں کہلاؤں۔ امیر البحر کیوں نہ بنوں۔ اس سنسار میں۔

کرنی کی بھرنی

ہے۔ جو کرتا ہے پاتا ہے۔ میں نے ساری عمر کپڑے دھوئے۔ پیسہ ٹکے پر نیت رکھی۔ اتنا ہی ملا۔ خیال آگے بڑھاتا۔ رام زیادہ بھجواتا۔

چھیوٗ رام، چھیا رام۔ ہوا دھیو۔

اری ننوا کی ماں۔ تو تو خفا ہو گئی۔ کہاں چلی۔ لا میں روٹی کھا لوں۔ تو جا مت۔ تیرا یہ خیال ہوگا کہ میں تیرے خفا ہونے کی پرواہ نہیں کروں گا۔ اری مجھ کو تو اس کا بڑا دکھ ہوتا ہے اور دل میں بڑی جلن ہوتی ہے۔

سائیں تیں مت جانیو تو سے چھوٹت مو ہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

چھئی ہو۔ چھی ہو۔ چھیا۔ رام چھیا۔

اری کل رات کا خواب سن۔ میں نے دیکھا۔ ایک سندر عورت اپنے بالم کو مایوس پنے سے دیکھ رہی ہے مگر منہ سے کچھ نہیں سکتی۔ اتنے میں اس کا پیتم پیسارا کہیں چلا گیا اور وہ ہاتھ ملنے لگی کہ ہائے میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی کہ پیا بچھڑ گئے۔

میں نے کہا تو کون ہے اور یہ مرد کون تھا؟ عورت بولی میں روح یعنی آتما

ہوں اور یہ مرد پریم شکتی (مظہر عشق) ہے۔ یہ خواب دنیا ہے اور عالم اسباب ہے۔ اس عورت کی بات تو میری سمجھ میں آئی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے جو دوہا پڑھا تھا، وہ یاد ہو گیا۔

سپنے میں مورے پی ملے کر نہ سکی کچھ بات
سوتی تھی، روتی اٹھی، ملت رہی وہ بات

رام چھیو۔ چھوا چھو، چھیو۔

ہاں نتو اکے باپو! یہ تو بتا تو میرا پیا، میں تیری پیاری۔ تو میرا دھوبی، میں تیری دھوبن۔ پھر یہ پپیہا پی کہاں کیوں پکارتا ہے؟ اس کو پی پی کہنے کا کیا حق ہے؟

تو کپڑے دھو چکے تو کچہری جائیو اور پیا پیاری کے نام کو انگریز بہادر سے اپنے نام لکھوا لائیو۔ اس کے بعد پپیہا پی کو پکارے گا تیں نالش کر دوں گی۔

نہیں نتو اکی ماں، یہ تیری غلطی ہے۔ پی کا پکارنا، پیا کا پیارا بننا آسان نہیں ہے۔ دیکھ بھونرا کیسا کالا ہوتا ہے مگر پی کی محبت میں اس کے منہ کی رنگت زرد ہوتی ہے۔ اری اس پریم کی بڑی کٹھن بٹیا ہے۔ پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے اور تو بھی خواہ مخواہ اس میں جھگڑا کرتی ہے۔ اری جن کے من میں پی بستا ہے ان کے منہ زرد پڑ جاتے۔ جا من میں پیا بسے۔ وا مکھ پیرا ہوئے۔

جا لیجاری۔ وہیں دھر یا۔ پکا پکو کر وہیں دھریا۔

نتو اکے باپو! یہ رات کو چکوا چکوی آپس میں کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ میں نے تو اتنا سنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا، اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی تھی۔ جب ان کے پر تھے تو یہ اڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے۔

دیوانی اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آن کر جل جاتا ہے

کہیں بلبل پھول کو گلے لگاتا ہے، لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے۔ تنکا کہربا پر فریفتہ ہے، دیدار پاتا ہے تو لپک کر سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس میں مل نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوے چکوی کو نہ ستانا۔ وہ خود محبت کے ستائے ہوئے۔ جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں۔

چھپو رام، چھپو، چھپو۔

تنزا کے باپو! تو نے کل کہا تھا یثرب نگر میں ہمارے چودھری سارے سنسار کے تنوں کو دھونے آئے تھے، اس کا بھید مجھکو بتا کہ یہ کیا بات تھی؟

اوہو۔ تو تو بڑی مورکھ ہے چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔ وہاں یہ بھید سمجھ میں آجائے گا۔ قوال گا رہے تھے،

میری میلی گدڑیا دھودے

دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑی ساری دنیا ہے، خود ہمارے وجود ہیں اور ان گناہوں اور شک و شبہہ کے دھبوں کو صاف کرنے کے لئے خدا نے یثرب نگر میں جو عرب میں ہے اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں، ایک بڑے چودھری کو پیدا کیا جس نے سارے جہان کے دھبے دور کر دیئے اور یہ سب میلی گدڑیاں دھوکر رکھ دیں یہی تو وجہ ہے کہ میں بیچارہ غریب دھوبی کاغذی گھاٹ پر کپڑے دھونے آیا ہوں۔ اور اپنے مہا چودھری کے بتائے ہوئے صابن سے اپنے من کے کپڑے کا میل دھو رہا ہوں۔ جب پتھر پہ کپڑے کو مارتا ہوں تو وہ شکایت کرتا ہے مجھکو بے رحم کہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اسی کو اجلا کرنے کے لئے اس کو پتھر پہ مارنا پڑتا ہے۔

# سیم لا

ازخطیب ۷۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء

جیب میں چاندی، بدن میں صحت، دل میں جذبات اور عقل میں عروج ہو تو شملہ آ ؤ۔ انگریزی میں یہ سملہ ہے۔ ذرا کھینچ کر پڑھو تو سیم لا ہے جس کے معنی طلب نقرہ میں محو ہیں۔ چاندی لاؤ چاندی لاؤ پکارتے رہتے ہیں۔

میں آیا تو جیب خالی، بدن ناتوان، دل جذبات سے معرّیٰ، عقل زوال پذیر، کوئی وجہ ایسی نہ تھی جس کے سہارے اس اونچے پتھر خانہ میں آتا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ آ گیا۔ حجرۂ فتح محمد میں ٹھہر گیا۔ (بابو فتح محمد ادرسیر کا مکان واقع منجولی)

یہ وہ وقت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سب پیشوا سیاسی و علمی اس کوہِ نور پر جمع ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یونیورسٹی لینے آیا ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ ریزولیوشن پیش کرنا اور جواب میں نغمۂ دلربا سننا ہے۔ کسی کو مال روڈ پر گشت لگانا اور ہوٹل میں جانا آنا ہے۔ کوئی زندگی کی دریدگی میں ہوائے شملہ سے رفو کرانے آیا ہے۔

* چاند زوروں پر ہے۔ آدھے دن اِدھر آدھے دن اُدھر۔ تیرھویں چودھویں کا سماں ہے۔ رات کو آسمان منہ دھو کر بے پردہ نکل آتا ہے۔ چاند تاروں کی فوج کو تو اعلیٰ کراتا ہے۔ غیر فوجی بندہ اپنے حجرے کے جھروکوں میں بیٹھا ان نورانی ہستیوں کی نیزہ بازی دیکھا کرتا ہے۔ سردی باہر نکلنے نہیں دیتی۔ آتشدان کی ملکہ چاند کی قدرتی رقیب ہے، اس کے پاس ہوتا ہوں چاند کے پہلو میں کیونکر جاؤں۔

کل چاندنی لرز لرز کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چل رہی تھی اور میں ہنستا تھا جب وہ پھسل کر غاروں میں لڑھک جاتی تھی۔ غار گود کھولے بنت القمر کی یاد میں بے تاب

نظر آتے تھے اور جب اس تابانی کو پاتے تھے تو اپنے اندر کی سب مخفی حالتوں کو نمایاں کر دیتے تھے۔ یعنی روشنی کی چمک میں اپنے اندر کی چیزیں ظاہر کر دیتے تھے۔

کہتے ہیں یہ وہ پہاڑ ہے جو سینکڑوں کوس اسی طرح اونچا نیچا چلا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ وہ پہاڑ ہے جس کے ہاتھوں میں سارے ہندوستان کی دنیاوی قسمتیں ہیں۔ اس پہاڑ کے سینے پر جو تار ہیں ان کی بجلی تمام ہندوستان کی موت و حیات پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس پہاڑ کی گود میں جو ریل چلتی ہے، وہ لاکھوں میل لمبے ہند کی زندگانی کے لئے آبِ حیات لے جاتی ہے۔ یا ہر ایک کو اس کے نامۂ اعمال پہنچاتی ہے۔ ہوں گے، اس سلسلہ سے اور بھی اونچے پہاڑ ہوں گے مگر نصیبے میں اس سے اونچا کون ہے، اقبال اس سے بڑھ کر کس کا ہے۔ سب راجہ پرجا اس سنگ خانہ میں کھنچے چلے آتے ہیں۔

میں پوچھوں۔ کیوں جناب آپ نعرہ لگاتے ہیں انا سیم، اور میں بغیر سیم کے آپ کے پاس آگیا۔ تو یہ پہاڑ کیا جواب دے۔ ممکن ہے کہ تیوری چڑھائے اور میری بے عقلی پر قہقہہ لگائے مگر میں اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور کہتا ہوں کہ بغیر سیم کے بھی سیم لا دیکھنے میں آسکتا ہے۔ اگر توکلؔ خالق مس و سیم پر ہو۔

# حضرتِ کُن

ازصوفی۔ ستمبر ۱۹۰۹ء

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت کُن پیدا ہوتے ہی رحلت فرما گئے اور اب دنیا میں ان کا نام ہی باقی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام موجودات کا وجود انہی جناب کے سہارے پایا جاتا ہے۔ یہ مرجاتے جہان سے گذر جاتے تو فیکون کی صورت نظر نہ آتی۔

لوگوں کو ان کی موت کا شبہہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جو کرشمہ انہوں نے اپنی پیدائش کے وقت دکھایا تھا وہ دوبارہ نہ دیکھا گیا۔ ان کی پیدائش سے پہلے نہ آسمان تھا نہ زمین اور نہ یہ تمام غلطاں پیچاں چیزیں، جو آسمان زمین پر چھائی ہوئی ہیں، اور یہ میاں آدم بھی جو آج حضرت کن کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں، ظہور کن سے اول غائب تھے مختصر بات یہ ہے کہ نا پید اور عدم کا لفظ بھی گم تھا۔

حضرت کن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خزانہ مخفی میں خود نمائی و خود آرائی کا جذبہ اٹھا اور اس جذبہ نے سکوت معدوم کے دریا میں ایک لہر اور جنبش پیدا کی اور خواہش نمود کا بادل گرجا اور برسوں کی قید شدہ بجلی نے بادل سے باہر آکر چمکنا چاہا تو سب سے پہلے حضرت کن کو ولادت کا شرف عطا کیا گیا۔ جب یہ حضرت آغوش دہن سے باہر تشریف لائے تو عجیب شان سے آئے۔

ھو حق نالے میں زور سے تجلی ہوئی اور سایہ نمودار ہوا۔ یہ سایہ تیزی سے گردش کرتا تھا اور موجودہ عالم کی رنگارنگ شکلیں اس سے یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی اور وجود عالم جمکر قائم ہو گیا۔

اس کے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلی ہوئی، نہ کوئی اس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا۔ اس واسطے بعض آدمی کہتے ہیں کہ حضرت کن ہی چل بسے ورنہ کبھی تو کوئی اور جلوہ دکھاتے۔

لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں جو مولانا کن کو مردہ تصور کرتے ہیں۔ وہ زندہ ہیں اور ہر روز تجلیاں نازل کرتے ہیں۔ یہ پرانا کارخانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے۔ جناب کن نہ ہوتے تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ حضرت کن زندہ رہیں گے اور مرنا ان کے لیے محال ہے۔ کلام ہے تو اس میں کہ آیا ان کی ولادت کی

---

لـه یہاں وہ ولادت مراد نہیں ہے جو ماں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی ولادت سے قرآن شریف کی سورۂ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے۔ ہم اس منکر کو سچا جانتے اور ڈر کے مارے ولادت کی تشریح کر دیتے ہیں۔ ۱۲ حسن نظامی۔

ضرورت بھی تھی یا نہیں اور جب وہ پیدا ہو ہی گئے تو ان کا وجود کچھ کام بھی آیا یا یونہی افشائے راز کا وقصہ ثابت ہوا۔

اس معاملہ میں دو خیال ہیں حضرت کن کے حامی، جو آرائش عالم کی ظاہری بہار کے شیدا ہیں، کہتے ہیں۔...... کن نے بڑا احسان کیا جو ہم کو راز کے بند صندوق سے باہر نکالا اور عجیب وغریب تماشے دکھائے۔ مگر گروہ مست قلندر جناب کن کا بہت شکوہ گزار ہے وہ خیال کرتا ہے کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکونِ وحدت میں طوفان آتا۔

خشک وتر۔ خیر وشر، چاند اور بیجان سینہ سے سینہ لگائے آرام سے سوتے رہتے

اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں اور شہروں کی رونق وچہل پہل کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن۔ کے غل وشور سے اکتا کر پہاڑوں اور صحراؤں کی تنہائی وخاموشی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے یہ کیوں نہیں بہتا، کنارہ کہتا ہے میں خود اپنی افتادگی سے نالاں ہوں نقل مکان کر نہیں سکتا۔ ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا، غریبی اور امیری، نیکی وبدی، سب اس کی جان کیلئے وبال بنے ہوئے ہیں ہم بھی جہاں تک غور کرتے ہیں، انسان کی شکایتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اس کو کن کے سبب آزار وہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے۔ طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں جو درجوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پر لطف بن جاتی ہیں کہ عالم یک جائی میں ان کا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

# رونق

(از صوفی۔ جنوری ۱۹۱۳ء)

سردی کا موسم درحقیقت رونق کا موسم ہے۔ جہاں یہ دن آئے چاروں طرف رونق

کی گوری گوری اُجلی اُجلی صورت نظر آنے لگی۔ انگریزوں اور ان کی ریس کرنیوالے ہندستانیوں سے ہمیں بحث نہیں جو روئی کا استعمال فیشن اور شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور بھیڑ کی اُون پہننے کو اپنا فخر جانتے ہیں۔ روئی خدا کی دی ہوئی سخت زمین سے نکلا ہوا شگوفہ، اُون غریب بھیڑ کا اوڑھنا بچھونا جس کو ظلم و بے دردی سے زبردستی چھین لیا جاتا ہے اور اس مال مغصوبہ کے کوٹ، کمبل اور طرح طرح کے کپڑے بنا کر استعمال کئے جاتے ہیں اور اسپر یہ ڈھٹائی کہ جو لوگ خدا کی دی ہوئی روئی کے کپڑے پہنیں، ان کو ذلیل، وحشی، غیرمہذب اولڈ فیشن کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

روئی کے درخت کو دیکھنا! کھیت میں اپنے سینکڑوں ہم جنس پودوں کے پاس سر پر سفید عمامہ باندھے خدا کی یاد میں جھوم رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جس قدر پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں ان سب میں نمی اور تری پائی جاتی ہے۔ مگر روئی اپنے درخت کا ایک ایسا پھل پھول ہے جو ترشاخ میں خشک وجود کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یعنی روئی کے درخت کی جڑ، ٹہنیاں، پتے یہاں تک کہ وہ شگوفہ جس کے وسط میں روئی ہوتی ہے سب میں تری اور گیلا پن موجود ہوتا ہے مگر روئی بالکل سوکھی اور نمی سے پاک ہوتی ہے یہ شہادت ہے خداوند تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ وہ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ، آگ سے پانی اور پانی سے آگ پیدا اور نمودار کرتا ہے۔ روئی کی جڑ پانی میں، ٹہنیاں پتے پانی آلود مگر پھل شعلہ جوالہ۔ باہمہ و بے ہمہ سب میں موجود اور سب سے الگ۔ ٹھنڈک میں پیدا ہوا مزاج گرم پایا۔

اب ذرا اسپر غور کرنا کہ روئی کے پھول کے اندر جو مسلمانوں کے عمامہ کی شکل کا ہے یہ کالی کالی سخت کیا چیز ہے۔ اس کا نام "بنولہ" ہے جس طرح انسان اشرف المخلوقات کے باطن میں حجابات کثیف پیدا کئے جاتے ہیں جو ریاضت وصحبت شیخ و اعمال حسنہ سے صاف ہو جاتے ہیں، اسی طرح روئی کی باطنی کثافتیں گردش آب شین کے

اندر پوری مشقت کے بعد صاف کی جاتی ہیں۔ جب بنولے، جو کہ ایک سخت و کرخت وجود رکھتے ہیں، روئی کے نازک اور گلفام بدن سے دُور ہو جاتے ہیں تو روئی کو ایک اور امتحان گاہ میں جانا پڑتا ہے اور وہ دُھنیئے کی تانت ہے جو بیچاری روئی کے تن زار کا ایک ایک رواں کھول بکھیر کر رکھ دیتی ہے اور رنگ رنگ کا میل کوڑا کرکٹ صاف کر کے پھر سب اجزاء کو ایک جگہ کر کے روئی کا گالا بنا دیتی ہے۔

ایک گالے کو لو اور اس کو تولو جتنا وزن اس کا ہو اسی انداز سے وہ روئی لو جس کے بنولے اور کوڑا کرکٹ صاف نہیں ہوا، تو تم کو زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ صاف روئی نرم ہو گی، گرم ہو گی اور جسامت میں کئی حصے بڑی نظر آئے گی اور غیر صاف شدہ روئی اس کے بالکل برعکس۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بھی جب صفائی باطن کے بعد درجہ تکمیل کو پہنچتا ہے تو اس کی ذات و صفات میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

## مغرب کے دُھنیئے

روئی دُھنکنے کا ذکر آیا۔ اُون اور روئی کے درجہ پر بحث ہوئی تو لامحالہ اس پر بھی گفتگو ہونی چاہیئے کہ اون پوش مغرب ہماری روئی کا کس قدر محتاج ہے۔ مغرب میں ہزاروں کارخانے ہماری روئی کے بل پر چل رہے ہیں۔ سوتی کپڑے کی مانگ نہ ہو تو روئی کے گالوں کی طرح گوروں کے گالے نہ پھولیں اور پچک کر رہ جائیں۔ مگر یہ سب اہلِ سیاست اصحاب کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ فقیر تو اس امر کی شکایت کر سکتا ہے کہ مغرب کے دُھنیئے مشرق کی پرانی روئی کو دھنکنے کیلئے تو اسقدر بے چین ہیں کہ کالے کوسوں روئی دھنکنے کے سامان کندھے پر اٹھائے لئے چلے آتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اپنے گھر کے لحاف توشک کی بھی خبر لی۔ پرانی روئی کے دھنکنے کی دھن میں ایسے سرشار ہوئے کہ اپنے گھر کی روئی بیحیائی، شراب خواری، خود غرضی، بے رحمی کے بنولوں سے اٹی پڑی ہے۔

اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا.........

اور آدمی !! اپنے وجود کی روئی کے چار بنولے، جن کا تعلق اربعہ عناصر سے ہے نکال ڈال اور ایسی تانت بجا کہ تمام جسم صدائے وحدت کی تن تن سے گونج اٹھے اور روح کی ملکہ تیرے پاکیزہ جسم کے نرم و گرم لحاف میں خوشنودگی و پسندیدگی سے رہنا قبول فرمائے۔

# مثانہ بیمار کا جواب

از طبیب۔ یکم جنوری ۱۹۱۸ء

انگریزی بیز والے اخبار جی! مجھسے کیا مانگتا ہے؟ میں کیا کروں، کیا دوں، طبیب اخبار بنتا ہے، بننے دو۔ دنیا میں ہر چیز بننے سنورنے کو آئی ہے۔ خود خدا کے جی میں یہی سمائی ہے۔ ہر ہستی نموداری کی طلبگار ہے، بندہ خود اس مرض کا گرفتار ہے مگر اب تو مدت ہوگئی۔ زخموں نے بہنا چھوڑ دیا۔ میں نے لکھنے پڑھنے اور اخباری آہ وزاری کرنے سے ہاتھ اٹھالیا۔ تم جانتے ہو، پہچانتے ہو، پھر کیا مانگتے ہو؟

دلی دور تھی، آجکل میں اس سے دور ہوں۔ سنتا ہوں کہ وہ میری طرف چلتی ہے اور کہتی ہے "دیوانہ ہنوز بیگانہ" چوپاٹی کا سمندر دامن پکڑنے کو دوڑتا ہے، کہتا ہے میری نبض دیکھو۔ طبیب کہتے ہیں نبض کی تیزی اور حرکت بخار کی نشانی ہے۔ کہیں مجھکو بخار تو نہیں؟ میں اس سے بھی نہیں بولتا۔ دل کو بھی جواب نہیں دیتا جو اپنی حرکت بے اختیاری کے سبب تپ لازمی کی فکر میں مبتلا ہے۔ پلکوں کی جانب بھی مخاطب نہیں ہوتا جو سکنڈ سکنڈ میں ٹھوکریں کھاتی اور چشم بیمار پر گری پڑتی ہیں۔ لفظوں کی دنیا میں سنا جاتا ہے علم دو ہیں۔ بدنی اور دینی۔ میں نے ابھی علم کے لفظ تک کو نہیں پہچانا، بدن و دین کا کوچہ بعد میں آئیگا۔

دل گوشت کا ٹکڑا ہے، خون کا انجن گھر ہے یا تخت رب العلمین ہے یا مستانہ دیوانہ کا جیل خانہ ہے۔ مجھے کچھ خبر نہیں دماغ کہاں ہے، کیوں ہے، اس میں آنکھیں کدھر ہیں، کان کس رخ ہیں، ناک کس جانب ہے، زبان کونسے پہلو میں ہے مجھے معلوم نہیں!

معدہ و جگر میں کیا تعلق ہے، گردہ کی کس کس سے دشمنی ہے، خانۂ شکم میں کن رقابتوں کا بازار گرم ہے، ان کو سمجھنے کا وقت نہیں نکال سکتا۔

کیفیات و محسوسات اندرونی و بیرونی اور ملکہ جسم یا رانی بی طبیعت لامکانی سے بھی میری شناسائی نہیں بنتا ہوں وہ میری عاشق زار ہیں رات دن میری ہی خبرگیری و خاطر داری میں گھلی جاتی ہیں۔ مگر ان دنوں مجھے ان کی طرف بھی آنکھ اٹھانیکی فرصت نہیں۔

دلی کی گورنمنٹ ملیریا کے مچھر پکڑتی ہے اور اخباروں کے جراثیم چھوڑتی جاتی ہے اخبار روزانہ ہو تو یومیہ نوبت کا بخار ہے، ہفتہ وار ہو تو آٹھ روزہ۔ ہفتہ میں تین بار ہو تو تہیہ اور دو بار ہو تو چوتھیہ۔

"طبیب" کے ایڈیٹر صاحب کو خدا تندرستی دے، مجھ غریب الوطن کی نبض پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ دردمند عشق فارسی جانتا ہوتا تو کہہ دیتا "خیز اے ناداں طبیب" مگر یہاں تو ایسے عشق کا درد ہے جس کو دارو ئے دیدار بھی مفید نہیں۔ بہت سے شربت دیدار پئے۔ لال بھی، کالے بھی، مگر درد و قابو میں نہ آیا۔

کل رات حکیم سقراط زہر کا پیالہ لیکر میرے پلنگ تک آئے۔ میں نیچے بچھے ہوئے مصلے کو دیکھ رہا تھا کہ اب کوئی دم میں مجھکو اسپر جانا اور خدا کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ بوڑھے حکیم نے ادب سے گھٹنے جھکائے اور کہا اس کو پی لو ہیفر اری جاتی رہیگی میں نے کہا۔ ثبوت دو کہ تمکو جام زہر آلود نے تسلی دیدی۔ شام کو کٹورہ یہ گارڈن میں ایک اسیر قفس طوطے نے بیان کیا تھا کہ قرار جنگل کی آزادی میں بھی نہ تھا اور اس پنجرہ آہنی میں

بھی نہیں ہے۔ پھر اگر میں زہر کا پیالہ پی لوں۔ مسلمان مولویوں کے فتوے سے موت الحرام اور انگریزوں کے قانونِ خودکشی کا سزاوار بنوں، تو کون کہہ سکتا ہے کہ مرض اضطراب دور ہو جائے گا۔

حکیم سقراط کے برابر ایک اور پیر مرد نمودار ہوئے۔ بولے میں سعدی ہوں۔ میں نے کہا جناب شیخ صاحب مجھ کو حیران نہ کیجیے اور اس حکیم کو لے کر جائیے۔ آپ نے دنیا کو خوب دیکھ بھال کر سمجھا اور میں بغیر دیکھے سمجھ گیا۔

سعدی نے بغل سے ایک کتاب نکالی اور کہا اس کشفیہ میں نسخہ دیکھو۔ دم گھٹنے لگا۔ زبان بولی کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے آواز دی۔ آفرین۔ خوب جواب ہے۔ گردن موڑ کر حکیم ہربرٹ کو للکارنا پڑا۔ جاؤ گورے آدمیوں کو آفرین و تحسین دو۔ مجھے درکار نہیں بمبئی کے بازاروں میں ہزاروں بیمار نظر سے گذرتے ہیں۔ ٹرام گاڑیاں دوڑتی ہیں اور ہر بیمار کو اس کے شفاخانہ میں لیجاتی ہیں۔ میرے پاس پرگلائے شہرۂ آفاق خود آئے ہیں۔ فیس و نذرانہ سے انکار کرتے ہیں اور غریب سمجھ کر مفت علاج کرنا چاہتے ہیں، اخبار "طبیب" ان کے نام بھی جاری کر دینا۔ ان کو نسخے خوب یاد ہیں، یہ سب کاغذی حکیم تھے، آسمانی حکیم تھے، روحانی حکیم تھے، طوفانی حکیم تھے۔

میں بیمار نہیں ہوں، حواس باختہ نہیں ہوں، عشقیہ مالیخولیا کے آزار سے آزاد ہوں۔ مولانا روم کے گندم نوازعشق کے زیر بار ہونے سے انکاری ہوں۔ یہ تمہارا طبیب مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سے کہو خلقت عشق سے تباہ ہے اور بڑے بڑے بزرگ خضر صورت اس آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ ابھی اس خط کے لکھتے وقت شیکسپیئر نے قلم پکڑ لیا کہتا تھا۔ خدا اور محبت کا بھید کوئی نہیں جانتا۔ میں نے ایک کہنی مار کر دھکا دے دیا اسٹیج پر رقص کرنے والا مجلس میں ناچنے والے کو سبق دینے آیا ہے۔ ارے میں خدا کو بھی جانتا ہوں اور عشق کو بھی پہچانتا ہوں، یہ دونوں اس ساری کائنات کے

جسم وروح ہیں جسم کے عوارض اور روح کے آلام جن اخلاط سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بغیر سمجھے مجھکو معلوم ہیں، طبیب بیچارے کیا جانیں بلغم وسودا کے صحرا میں سرگرداں رہتے ہیں۔ صفراوی تحقیقات کی محنت میں زرد ہوگئے ہیں خلقت سے کہتے ہیں ہم کو حکیم صاحب کہو، ان کا کہنا جھوٹ نہیں اور سچ بھی نہیں۔

نادان خلقت کی حکمت جانتے ہیں، اس لئے سچے ہیں۔ دانا مخلوقات کی حکمت سے عاجز ہیں، لہذا دروغ گو ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان ہو۔ مگر خطرۂ جسم نہیں ہوتا۔ جان اور چیز ہے حکیم طبیب کو اس سے کیا سروکار، جان کا راز جاناں کو معلوم ہے یا جاناں پرستوں کو وہاں اگر کوئی خام کار پھنس جاتا ہے تو کان پکڑ کر نکال دیا جاتا ہے۔ پروانہ کا سوز مکھی کو نہیں دیا جاتا۔

تم سمجھے، جناب حکمت مآب ایڈیٹر صاحب مستانہ بیمار کے جواب کو۔ ڈرتا ہوں کہ تم لیاقتِ طبی جتانے کھڑے ہو جاؤ اور کہو حسن نظامی کے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ تربوز کا چھلکہ اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ تربوز کا چھلکا اٹھاتے ہو تو وہ سرخ سرخ گودا بھی دو جو رخ شعلہ صفت کا ہمشکل ہے۔ زخمی جگر کی صورت رکھتا ہے۔

طب اچھا فن ہے۔ عرفان جسم کا مرشد ہے جسم کی شناخت ہو جائے تو جان تک رسائی دشوار نہیں۔ جان کیا چیز ہے؟ روح کس کو کہتے ہیں؟ جو طبیب اس کی دانش کا دم مارے وہ بیدم ہے یا بیدم ہونے والا ہے۔

نئی روشنی کے طبیب، جن کو ڈاکٹر کہتے ہیں، تمام کائنات وموجوداتِ عالم کو خشک ہوں یا تر، حیوان ہوں یا بشر، پہاڑ ہوں یا شجر، سلسلۂ جاناں میں منسلک مانتے ہیں۔ ہندو فلاسفر پہلے ہی کہتے تھے مگر ان سرکشوں نے نہ مانا۔ اب آنکھیں کھلیں تو پہچانا کہ حی وقیوم کی حیات ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے۔ موت بھی زندگی رکھتی ہے۔ طاعون اور ہیضہ جیسے بلا کو امراض کے بھی جان ہے۔ نازک کیڑوں میں اس کی پہچان ہے۔ اب چند روز

میں کہیں گے خدا کو بھی خوردبین سے دیکھ لیا مگر وہ چھوٹا سا کیڑا نہیں ہے نہ بڑا سا پہاڑ ہے
وہ نہ خوردبین سے نظر آئے گا نہ دوربین میں سمائے، اس لئے میں پہلے سے کہے دیتا ہوں
کہ ایجاد خوردبین و دوربین سے پہلے میں نے اس کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ ایجاد و اختراع
میرے نام پیٹنٹ ہونی چاہیئے۔ مگر اخبار والوں کا قلم، دریا کا پانی، معترض کی زبان کو کون
روکے؟ کہا جائے گا تم سے پہلے بے شمار انسانوں نے اس کو جانا اور پہچانا۔ رجسٹری تمہارے
نام نہیں ہو سکتی۔ اور خدا کی پہچان کو پیٹنٹ کرنے کا کوئی قانون بھی نہیں ہے۔

ہاں انہوں نے جانا پہچانا مگر نئی روشنی کے آلات سے نہیں، وہ سب پرانی لکیر
کے فقیر ہے۔ مجھکو جو عینک میسر آئی ہے وہ پہلے نہ بنی تھی نہ آئندہ اس جیسی بننی ممکن ہے۔

میری مانو تو کہوں، کامل طبیب کاغذ کے حرفوں اور مریض و امراض کے تجربوں سے
نہیں پہچانا جاتا۔ یہ سب ابن آدم کے کسبی و طبی جوہر ہیں۔ کمال صفت علمی ہے۔ جو کبھی اثر
بے توقع اور کبھی ضرب بے یقین بن کر نمودار ہوتا ہے۔ خدا جب چاہتا ہے کسی طبیب کو یہ
نعمت دے دیتا ہے کہ خلاف امید تاثیریں اس کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مایوس
اور لاعلاج مریض ادنیٰ کوشش سے بستر مرگ سے زندہ ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے عزرائیل سے پوچھا۔ تم بھی زندگی کے ہاتھ سے کبھی آزردہ
ہوئے ہو؟ بولے سات دن میں کئی بار یہ زحمت پیش آتی ہے۔ ایک طرف مجھکو حکم ہوتا ہے
فلاں مریض کی جان نکال لو۔ دوسری طرف طبیب کامل کے ہاتھ میں اثر دیا جاتا ہے
کہ مرنے نہ دو، اور دیکھتا ہوں کہ خاکی انسان جیت جاتا ہے اور مجھکو اپنی حیثیت ہلاکت
کی شکست سے سخت اذیت ہوتی ہے۔

میں نے کہا تم سمجھے بھی خدا یہ دو رخی پالیسی کیوں چلتا ہے۔ جواب دیا اس کا علم مجھ کو
نہیں ہے۔ میں بولا سنو! زندگی کشمکش کامیابی و ناکامی کا نام ہے۔ تم ہمیشہ کامیاب رہو تو زندگی
کے انقلابات کا لطف جاتا رہے۔ یہ حکمت سن کر عزرائیل نے حسرت سے مجھکو دیکھا اور

میں نے جلدی سے اس کو قلم بند کر لیا۔

# تنکے کا سلوک

ازنظام المشائخ ۱۹۱۵ئہ

شیراز کے فلسفی صوفی نے کہا درخت کے ہر پتے پر کردگار رنز کار کی معرفت کے دفتر منقوش ہیں۔ یہ سن کر جنگل کے نیم کی ایک ٹہنی کو میں نے جھکایا اور اس کے پتوں سے پوچھا خدا کی پہچان کا رجسٹر کس ورق میں ہے۔ شاخ جھول کر بولی تم تو ہمکو جھکاتے ہو خود جھکو تب وہ مخفی نوشتے نظر آئیں گے۔

سُنا آپ نے! میں اور نا ہنجار اشجار کے آگے سر کو خم کردوں۔ اغیار کے سامنے اس سر کو جھکنے کی عادت نہیں۔

میرے سکوت اور پس وپیش نے نیم کی ٹہنی کو موقعہ دیا کہ اس نے جھنجھلا کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا اور دوسری شاخ نے متحرک ہو کر اپنی گرفتار بہن کو اپنے اندر بلا لیا۔

قدم بڑھایا۔ چلوں اور کسی دوسرے عارف سے اس نکتے کو حل کروں۔ پاؤں کے نیچے دبے ہوئے گیاہِ سبز کے تنکے نے آواز دی۔ میں بتاؤں سنو تو میں سناؤں میں جھکا اور اس مہین آواز کو سمجھنے کے لئے گردن خم کی۔

نیم کی ٹہنیوں نے جھکتے دیکھ کر نعرۂ شادمانی بلند کیا اور کہا۔ وہ جھکا جس کو انکار تھا۔ گھاس کے تنکوں نے مل کر جواب دیا دیوانیو! یہ آدمی اس جنس کی جانب جھکا ہے جس سے بنا ہے۔ اس کو ایک دن اسی خاک میں آنا ہے اور ہمارے ہی مٹیا محل میں تن گنوانا ہے، تم ہنسی نہ اڑاؤ۔ یہ اشرف المخلوقات ہے۔

اب میں نے کہا۔ پیارے تو ہی مجھ کو سلوک کا راستہ بتا اور خدا تک پہنچا۔ تنکا بولا

لکھنؤ جا۔ کاغذ بننے کی مشین دیکھ۔ وہاں میرے اور تیرے دونوں کے سلوک کی منزلیں طے ہوجائیں گی کہ

کرنا اور سمجھنا دیکھنے اور کہنے سے اچھا ہے

دیکھا لکھنؤ کی پیپر مل کو۔ غریب گھانس کے گٹھے بندھے رکھے ہیں۔ پھٹے پرانے گودڑ کے چھکڑے بھرے کھڑے ہیں۔ انجن سرگرم رفتار ہے پہیئے گردش میں مصروف ہیں۔ بھاپ بیقراریاں دکھا رہی ہے۔ کالا دھواں اونچے مینار سے اور کیطرف اڑا چلا جاتا ہے۔

تنکے کے سلوک کی پہلی منزل، پہلا مقام، پہلا لطیفہ، صفائی ہے۔ مشین اور حجاب غبار کی لڑائی ہے۔ لوہے کے پنجے تنکوں کو لکڑی کے تختے پر سمیٹے ہوئے اوپر کھینچ رہے ہیں اور غریب گھانس عالم بیکسی میں کھنچی چلی جاتی ہے۔

اس منزل کے امتحان سے پہلے تنکے کو دیکھا تو سراپا گرد تھا۔ معراج امتحان میں جا کر دیکھا تو صاف شفاف پایا۔ خاک کا ایک ذرہ بھی اس کے تن نازک پر موجود نہ تھا۔

میں نے کہا لو اب بتاؤ سینہ کدورت سے صاف ہوا۔ تنکا بولا۔ واہ ابھی ایک ہی مقام طے ہوا ہے۔ تزکیۂ ظاہر کے بعد تزکیۂ باطن اور قلب ماہیت درکار ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کھولتے ہوئے گرم چشمے میں۔ تنکے ڈال دیئے گئے اور آسمان سے گر کر زمین پر پہنچے مجھے ان کا گرنا اور گلنا ناگوار ہوا جس طرح کہ میں ایک لب لب خدا کو عروج دنیا سے گرتا دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا کرتا ہوں مگر تنکا ذرا نہ گھبرایا۔

پھر دیکھا تو کرخت تنکوں میں ایک گداخت تھی۔ ابلے ہوئے۔ گلے ہوئے پڑے تھے۔ اب تیسرا دور شروع ہوا۔ مشین نے ان کو پیسنا اور دلنا شروع کیا اور آن کی آن میں بھرتا بنا دیا اللہ تیری شان۔ وہ تنکے کی نکیلی آن اور یہ بربادی و مسماری کے سامان۔

چوتھے مقام پر مرشد تیزاب نے ہاتھ پکڑا۔ جسم افسردہ کو سینے سے لگایا۔ کثیف رنگ کٹ گیا۔ سفیدی کا رنگ چڑھا۔ باطن ہر چیز کا سفید ہے سیاہی عارضی اور حجاب ناپید ہے۔

مقام پنجم میں یہ سفید پھریرتہ اشک محبت سے پانی پانی ہوا اور آہن کے رخسارِ شفاف پر پھیل گیا۔

چھٹے مقام میں حرارتِ عشق نے اس پانی کو جمایا۔ ساتویں میں کاغذ بنایا اور سکھایا اب ساتوں منزل طے کر کے تنکے نے زبان کھولی۔ گھاس سے کاغذ بنا اور ردّید۔ قرآن تورّیت۔ انجیل۔ زبور پر ان کے حرفوں کو لے کر نوشتِ معرفت دکھانے لگا۔ اسوقت کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا۔

کیوں میاں تنکے! خود مٹے جب عرفانِ حق کو سمجھانے اور دکھانے کے قابل ہوئے۔ ہمارا کیا بگڑا کباب کو سوخت ہوئی لذت ہم نے اٹھائی۔

تنکے نے کہا۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے تو اسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے مگر تم خود دار اور آرام طلب رہے۔ اس لئے میں نے یہ بار سر پر اٹھایا اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل میں بکری کھا لیتی، گائے بھینس چر لیتی۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا تو یہ سربلندی کہاں میسر آتی کہ میں استاد اور تم شاگرد ہو۔ میں عارف اور تم جاہل ہو۔

تنکے کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ پرانے گدڑوں میں سے ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ گدڑی نے پکارا۔ دردآشنا بنانے کو آواز دی۔ میں ناک پر رومال رکھ کر اس غلیظ ڈھیر کو دیکھنے لگا گدڑی نے کہا میں ناک ہی سے بات کرنی چاہتی ہوں اور تم نے اسی کو ڈھک لیا۔

صاحب میں ایک ناک والی حسینہ کا لباس ہوں، گو آج انقلاب دہر کے ہاتھوں اُداس ہوں۔

پوچھا کیوں، تم پر کیا بیتی، اس کوڑے میں آنکلی کیا افتاد پڑی۔ گدڑی بولی میرے جسم میں چار رنگ کے کپڑے ہیں جن کو ایک بھکاری فقیر نے جوڑا تھا۔ ایک ٹکڑا کسی طائف کا پارچہ پشواز ہے، دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا حصہ ہے تیسرا پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا

جُزدان ہے۔ چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا ٹکڑا ہے۔

یہ چاروں اپنے اپنے وقت میں ذی رتبہ تھے۔ دُلاری طوائف کی پشواز عیش پرستوں کو عزیز تھی۔ مولانا نجم الحق کا جبہ خدا پرستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان تمام پنڈتوں کا دین وایمان تھا۔ مسٹر ڈگلس کی قمیص سینۂ حکمرانی کی ہم جلیس تھی۔

مگر افتادِ ایام نے ان چاروں کو اپنے مالکوں کی نظر سے آتارا۔ کوڑی پر ّدتوں ڈلوایا۔ پھر بھکاری کے ہاتھوں میں پہنچایا۔ اس نے سب کو جوڑ کر ایک گدڑی بنائی اور لباس غربت کی عزت دلوائی۔ اب بیچارہ فقیر بھی خدا کے ہاں گیا۔ بارہ برس کے بعد دن پھرے ہیں۔ یہاں آئی ہوں۔ سلوک کے مقامات طے کر کے میں بھی کاغذ بنوں گی اور انسان کو بتاؤں گی کہ تیری مصیبت قلب ماہیت سے دور ہو سکتی ہے۔

یہ باتیں سُن کر میں نے نظام المشائخ کے ایڈیٹر کو دیکھا جو خرید کاغذ کی دھن میں تھے چاندی دے کر گدڑیاں اور گھاس کے تنکے لینے چاہتے تھے۔ اس کاغذ پر وہ عقلمندی کی باتیں چھاپیں گے اور خلقت ان حروف کو دیکھ کر اڈیٹر صاحب کی فضیلت پر واہ واہ کریگی۔ مگر کون جانے گا کہ اگر نظام المشائخ کے سفید اوراق پر تحریر نہ ہوتی، سادے صفحے شائع کر دیئے جاتے تو وہ اس باتونی عبارت سیاہ سے زیادہ بلیغ ہوتے۔ بشرطیکہ کسی کو تنکے اور گوڈر کے سلوک سے آگاہی بھی ہوتی۔

# دریائی سُرنگ

ازخطیب ۱۴۔ مارچ ۱۹۱۵ء

لڑائی کی خبروں میں بحری سُرنگوں کا ذکر آیا کرتا ہے۔ یہ مخفی ہتھیار جہازوں کی نقل وحرکت کے لئے بہت خطرناک ہیں۔ کیونکہ جہاز ان سے ٹکرا کر ڈوب جاتے ہیں۔

مگر اردو زبان میں اس کے لئے بحری سرنگ کا لفظ ایک اعتبار سے درست نہیں ہے اس لئے کہ سرنگ اس مخفی راستہ کو کہتے ہیں جو ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ یا ایک مکان سے دوسرے مکان تک کسی جنگی یا پوشیدہ ضرورت کیلئے تیار کیا جائے۔ یہ راستہ زمین کے اندر ہوتا ہے۔

اور بحری سرنگ ایک قسم کا آلہ ہے جس میں مشتعل ہونے والے مسالے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان آلوں یا پیپوں کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ تیرتے رہتے ہیں جب ان سے جہاز ٹکراتا ہے تو یہ پھٹ جاتے ہیں اور جہاز کو تباہ کر دیتے ہیں۔

ان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ جو بیان ہوئی۔ دوسری قسم پابند سرنگوں کی ہے جو تاروں سے بندھی ہوئی سمندر کی تہہ میں رکھی رہتی ہیں اور جس وقت ان پر جہاز آتا ہے تو ٹکرا کر تباہ ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ان پابند سرنگوں کے تار محفوظ مقامات سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جس وقت دشمن کا جہاز ان کے اوپر آتا ہے آدمی ان تاروں میں بجلی کی رو چھوڑ دیتے ہیں جس سے یہ سرنگ پھٹ جاتی ہے اور جہاز کے پرخچے اڑ جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ یہ

# دریائی شہابے

بحری سرنگ خواہ مخواہ سرنگ مشہور ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو بحری شہابے اس واسطے کہا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں عقیدہ ہے کہ جب شیاطین آسمان پر جانا چاہتے ہیں تو خدا کی جانب سے ان پر آتشی شہابوں کی مار پڑتی ہے۔ چنانچہ رات کے وقت جو ہم دیکھا کرتے ہیں کہ آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور دوڑتا ہوا ایک سمت چلا گیا یہ تارہ نہیں ہوتا بلکہ وہی قدرتی شہابا

# آگ کا کوڑا

ہوتا ہے جو شیطانوں کے مارا جاتا ہے۔ چونکہ آجکل زمین کے بعض آدمی اس عقیدہ کی ہنسی

اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہابہ کوئی چیز نہیں۔ یہ روشنی جو نظر آیا کرتی ہے زمین کی گیس ہے جو اوپر فضا میں جاکر بعض اوقات روشن ہو جاتی ہے۔ لہذا ان منکروں کو سمجھانے کے لئے اللہ میاں نے خود انہی کے ہاتھ سے شہابے بنوائے اور پھر انہی کو شیطان بناکر یہ شہابے ان پر مارے۔ جن سے یہ پاش پاش ہوگئے

# حضرت خضر عالم خیال میں

آجکل یورپ کی عالمگیر جنگ درپیش ہے۔ دریائی شہابوں کا تذکرہ روزانہ اخباروں میں چھپتا ہے۔ اس واسطے ایکدن عالم خیال میں حضرت خضر علیہ السلام کا تصور بندھا کہ انہوں نے ایک کشتی میں سوراخ کردیا تھا اور جب حضرت موسیٰؑ نے اس فعل عجیب پر اعتراض کیا تو انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ مشیت الٰہی کے ماتحت میں نے ایسا کیا۔ کیونکہ اس کا فرمان تھا کہ۔ آگے جاکر ایک ایسا بندرگاہ آئے گا جہاں ظالم بادشاہ کی حکومت ہے اور وہ نئی کشتیوں کو غصب کرلیتا ہے۔ اس واسطے میں نے اس کشتی کو عیب دار بنادیا۔

اس روایت سے نتیجہ یہ نکلا کہ مرضی خداوند دنیا کے کام اسباب ظاہری سے انجام دیتی ہے۔ ورنہ وہ چاہتی تو کشتی کو ظالم کے پنجہ سے اور طرح بھی بچالیتی۔ مثلاً یہ کہ غاصب اندھے ہوجاتے۔ اس کشتی کو نہ دیکھ سکتے یا ان پر کوئی اور بلا آجاتی جس کے سبب وہ ظلم نہ کرسکتے لیکن پروردگار نے اس کا انتظام بھی ظاہری حیلے اور سبب سے کیا۔

پس یہ خونریزی اور تباہی بھی، جو آجکل درپیش ہے کسی سبب اور باعث سے ہے مگر اس کا راز کون بتائے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کو بھی بہت مشکل سے یہ بھید بتایا تھا۔

# خود سرنگ بولی

مجھکو مستغرق بحر تخیل دیکھ کر تاروں سے بندھی ہوئی سرنگ بولی۔ مجھ سے سن، مجھ کو دیکھ

مجھ تک آجن کو نقشوں اور جغرافیوں کی شناخت نہ تھی۔ وہ بھی آجکل ان لکیروں تک جاتے ہیں اور ان سے آنکھیں لڑاتے ہیں جو لڑائی کے نام سے کانپتے تھے ان کو بھی ہوائی جہازوں میں سوار ہونے کی پھریریاں آتی ہیں۔ امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کہا دیکھو تمہارے پاس ہوں مجھے بتاؤ کہ تم کیا ہو تم کیوں ہو۔

پابند سرنگ نے جواب دیا کہ آدمی! جو تو ہے وہ میں ہوں۔ جو میں ہوں وہ تو ہے تو بھی فطرتِ الٰہی کے تاروں سے جکڑا ہوا ہے۔ میں بھی انہی کی اسیر ہوں تو بھی ایک اشارہ ہو سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں بھی ایک گردشِ انگشت سے نابود ہو جاتی ہوں۔ میرا اور تیرا ایک ہی حال ہے اور جو اس کو نہ جانے یہ اس کی شامت اعمال ہے۔

میری دوسری بہن کو دیکھ جو آزاد ہے۔ تیرتی پھرتی ہے مگر وہ بھی کشتیِ مرگ میں سوار ہے۔ کوئی جہاز اوپر آجائے تو اس کے وجود کا بھی بیڑا پار ہے۔

تیسری بہن کے تاروں کو کلی نہیں ملی مگر اندر کی آگ کیا کم ہے ٹکر کی دیر ہے ایسی بھڑکے گی کہ وہ اور جہاز دونوں گم ہو جائیں گے۔ اب جرمنی و یورپ کی بحث فضول ہے۔ ہر ہستی موجود مثل تارپیڈو بحری سرنگ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کی اندرونی طاقتوں کو دیکھے اور ان سے کام لے تو باہر کی ان تمام اشیاء کو نظرِ حقارت سے دیکھنے لگے کیونکہ جو شان ابنِ آدم کی ہے وہ اور کسی کی نہیں۔

# دو تحفوں کی رسید

از خطیب ۳۰۔ جون ۱۹۱۵ء

ایک رنگون کو جو برہما کا گاؤں ہے، جہاں سمندری تالاب پر تجارت کی بکریاں چرنے جاتی ہیں اور جس میں آجکل سرکاری سنسر (محتسب) محبت کے خطوط کو بھی دل میں ہاتھ ڈالکر

ٹٹولتے ہیں گویا اپنے بدگمان جلے دل کے پھپولے توڑتے ہیں۔

اس میں رسید ہے ایک تحفہ کی۔ محمود، یوسف، بھائی، میاں چارپتی کے پھول کی خدمت میں۔ رسید پر ٹکٹ ایک آنہ والا نہیں ہے اور اس کا مجھے ڈر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تحفہ جان کا ہے مال کا نہیں جس پر اسٹامپ کی ضرورت ہو۔

اقرار کرتا ہوں کہ تحفہ اس حالت میں کہ وہ بالکل کورا اور کولرا تھا مجھکو ملا اور اقرار کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا تھا، اور اقرار کرتا ہوں کہ کثرت کی ہر شان میں سراپا وحدت تھا یعنی اس کا ہر جزو اپنے دوسرے اجزاء کا ہمشکل تھا۔ میں نے اس تحفہ کے چٹکیاں لیں اور وہ بیچین ہو کر زمین پر لوٹ گیا لہذا یہ چند جملے بطور رسید الفت کے لکھ دیئے تا کہ ماسوا سے فراموشی ہو۔

دوسرا مانسہ پٹیالہ کو جہاں برنالہ بھی ہے اور سکھوں آریوں کے مقدمے بھی ہوا کرتے ہیں اور جہاں سنور یعنی بلی نام کا ایک ملک یا جزیرہ نما ہے جس میں خان سراج اور دین بھی رہتے ہیں۔

ان سب حواشی کے ضمن میں مانسہ نامی دیار ہے اس میں میرا ایک سکھ یار ہے اس کے تحفے کی رسید کا اس وقت بار ہے۔ ست سری اکال کہہ کر میں اس رسید کو شروع کرتا ہوں اور واہ گروجی کا خالصہ اور سری واہ گروجی کی فتح کہہ کر ختم کرتا ہوں۔

تحفہ کی پشت پر ایک مہر ہے۔ اس میں ردی بہادر کاغذی تحریر کو پامال کر رہے ہیں۔ جو اشارہ ہے اس بات کا کہ تحفہ دینے والا بھی کبھی تعلقات کو پامال کرے گا۔

تحفے کے ہونٹ سنہری ہیں۔ ان کو دیکھ کر میرا مٹی کا ہاتھ اور مٹی کی آنکھ شرماتی ہے میں مٹی کا پتلا، مٹی کے برتن میں پانی پیوں، مٹی کے ظرف میں کھانا کھاؤں اور تحفہ طلائی پاؤں تو کیونکر نہ شرماؤں۔

تحفہ بھیجنے والے کاغذی کھیل میں باطنی تفریح کو تلاش کر۔ زندگی اس قماش کی ہوگی

تو زندگی کے کھیل کی لاش بے خراش ہو گی۔
دیدم شنیدم ، ذائقہ تو ہبیں ۔ بشنو و خاموش شو کہ سکوت ذریعۂ نجات ہے۔
دن عید اور رات شب برات ہے۔ لہر دل میں منازل سلوک کی کشید ہے اسواسطے پر معنی یہ تحفہ کی رسید ہے۔

# شملہ کی دیبی ماتا

از خطیب ۔ ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۱۵ء

اس رات کی تاریکی میں سب سوتے ہیں۔ میں پہاڑوں کو کیا کہوں وہ بھی بے خبر پڑے سن سناتے ہیں جن کی آنکھ کھلی ہے۔ ان کو بت خانوں کی دھن لگی ہے۔ ایک شراب کے گلاس کے آگے سر جھکاتا ہے، دوسرا اپنے ہمشکل انسان پر مٹا جاتا ہے کہیں مردوں کی بندگی میں کمر بندھی ہے۔ درگاہ کی قبروں پر ٹکٹکی لگی ہے۔ یا پیر یا پیر کی صدائیں ہیں، کہیں حور و غلماں کا خیال ہے۔ انہی کی تمنا میں سجدۂ بے نماز ہے۔ کوئی پل صراط کے غم میں گرا جاتا ہے۔ دوزخ کی آگ کا خوف اپنے سامنے اپنی پوجا کراتا ہے۔ بیمار کو دیکھو نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدلتا ہے اور حکیم کے نسخہ کو یا معبود کہہ کر سینہ سے لگاتا ہے یہ دوسرا بھی بیدار ہے۔ کل کچہری کا مقدمہ سر پر سوار ہے۔ توکل کا دامن ہاتھ میں ہے یا پلیڈر یا بیرسٹر کی خیالی تسبیح پڑھ رہا ہے۔ افوہ۔ یہ سب اناڑی کتنی بھول میں ہیں آگے بڑھوں یا ٹھہر جاؤں۔ نہیں ذرا اور آگے دیکھوں شاید کوئی حق پرست نظر آجائے جس کی صحبت میں یہ کالی رات کٹ جائے۔

یہ جنگی سپہ سالار ہیں۔ فوجوں کو لڑاتے ہیں۔ ملک جیتنے گھر سے نکلے ہیں۔ کیسے ہوشیار و خوددار ہیں، ان کے دل میں کس کی یاد ہے۔ یہ کس کی عبادت کرتے ہیں، گولہ کی

توپ و بندوق کی خندق و مورچہ کی، رسد کے انبارخانوں کی، زہریلی گیس اور ہوائی جہازوں کی۔ یہاں بھی اپنا نہ مل، شملہ کی کونسلوں میں آ، ریزولیوشن کی دنیا کو دیکھو۔ بڑے بڑے آنریبل اپنی قوتِ استدلال اور ملکہ تقریر پر گھمنڈ کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی خودی کا پرستار ہے۔ یہاں ٹھہرنا بیکار ہے۔

اے دنیا! تیرے اندر اتنے بت خانے ہیں اور سب جاگنے والے۔ انہی بتوں کو پوجتے ہیں تو مجھکو بھی اجازت دے کہ اپنے حجرے کے سامنے اس اونچی چوٹی کے پہاڑ پر دیبی ماتا کے مندر پر جاؤں اور بابل کی اس لاڈلی کے آگے سر جھکاؤں۔

ماتا۔ ماتا۔ سوتی ہے۔ اٹھ اور بتا کہ تجھکو کیونکر پوجوں؟ اے دیبی ماتا آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے پجاریوں کو روندتی ہوئی مجھ تک آئی۔ ماتا۔ میں تجھ پر قربان تو کیوں تکلیف کرتی ہے۔ ماتا نے کہا۔

مورکھ نادان! قبر کا بُت۔ ہڈی کا بُت۔ تحریر کا بُت۔ تقریر کا بُت۔ حکومت کا بُت زندہ بُت۔ مردہ بُت۔ ہنستا بُت۔ روتا بُت۔ میں بُت۔ تو بُت۔ سب ترک کرنے اور چھوڑنے کی چیزیں ہیں۔ ان بادلوں کو دیکھ۔ عرب کی توحید میں سرشار اُمڈے چلے آتے ہیں جنّت دوزخ۔ خوشی و غم۔ رندی و تقویٰ کے خرقے پھاڑ ڈال۔ رام نام جپ۔ خدا نام کی سمرن پھیر۔ صفائی جھگڑوں کو لات مار۔ ذات میں رم۔ ذات میں سما جا۔

اپنے کو دیکھ۔ مجھ کو دھیان میں لا۔ میرا باپ۔ میرا سرچشمہ وہ ذاتِ احدیت ہے میں اسی نور کی شعاع ہوں جس کی جوت اس اندھیرے کے ذرہ ذرہ میں سمائی ہے یہ دیوانے آدمی میری مورتی کو پوجتے ہیں اور میرے بابل کو ناراض کرتے ہیں۔

تو بھی اپنے مداحوں کا بُت ہے۔ ڈر کہ تیرا داتا تجھ سے روٹھ جائے گا۔ جب کوئی تیرے آگے سر جھکائیگا کہہ دے کہ بھروسہ اور ٹھکانا اسپر رکھو جس کے ہم سب جلوے ہیں۔ برساتی کیڑوں کی طرح جان نہ گنواؤ جو چراغ کی لَو کو نور کا دروازہ سمجھ کر اندر داخل ہونے آتا ہے

اور اپنی بھول میں جلا کا جلا رہ جاتا ہے۔

ارے بادل کے غبار، ارے اشکبار طوفانی۔ لا اپنے دل کا پانی۔ جو مدینہ کے چشمہ حیات سے لایا ہے، اور دھو ہمارے دل تاکہ دیکھیں توحید کا اصلی روپ اور پائیں بیقراریوں میں قرار۔ ماتا چلی گئی۔ ایک نشتر لگا کر غائب ہو گئی۔ میں اس بیابان پہاڑ میں کس کو لاؤں جو اس تازہ زخم پر عملی عقل کا پھایہ رکھے۔

کمبل اوڑھ لوں۔ گرم آتشدان کے پاس جاؤں۔ پان چباؤں۔ اندھیرے غار میں گڑ پڑوں یا اس زخم کو نوچ ڈالوں۔ یہ حس کیوں آئی، یہ اور اک کدھر سے آیا۔ اس کا نام عرفان سہی مگر بہت ستانے والا اور رُلانے والا ہے۔

بت خانوں کی بندشوں میں اسیر ہوں اور کان یہ سناتے ہیں کہ آزادی کی توحید پرستار ہو۔ رنگونی پر[1] مو تو آ تجھکو یہ آفت سونپ دوں اور میں آنکھ بند کر کے سو جاؤں۔

# اپنا ماتم

از خطیب ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء

ازل کی صبح کو ابد نے رحلت کی۔ زیست نے آنکھ نہ کھولی تھی کہ مرگ زندہ ہو گئی افسوس میں مر گیا۔ زندگی کے دریا میں ڈوبنے سے یہ واقعہ پیش آیا۔ موت کے ذرے آبحیات میں حسن صورت لیکر آئے اور میری روح قبض کرنے لگے۔ میں ان کے فانی ہونیکا خیال کرکے کُڑھتا تھا، انہوں نے خود مجھے فنا کر دیا۔

اب میں سمجھا کہ میری پیدائش کا مدعا عشق کی اسیری تھی۔ عشق نامدار ہے اپنے طلبگاروں کو گمنام کرتا ہے اسواسطے میرے ماتم کا کہیں چرچا نہیں اور میں خود اپنا ماتم کرتا ہوں۔ میں جاتا ہوں اور حسن مجاز کی شورشوں کو ورثہ میں چھوڑتا ہوں تاکہ کائنات میں حشر تک

[1] پریمی احمد آبادی سے مراد ہے ۱۲

قیامت برپا ہوتی رہے۔

اس عشق کی آگ نے میری آنکھوں کی گنگا جمنا خشک کر دی۔ میں دم توڑتا ہوں تو گنگا جمنا کی وادیاں اپنی ہستی کے بچاؤ میں الجھ جاتی ہیں مجھ پر آنسو بہانیکی ان کو فرصت کہاں میری موت نے ان سب صحراؤں اور لق و دق بیابانوں اور کوہستانوں کو سنسان کر دیا۔ جن کی آبادی میرے دم سے تھی وہ بیدم، بیہوش اور بے نمود ہو گئے۔ ورنہ ضرور میرے غم میں گریبان چاک کرتے۔ ہمالہ جس کو میرے عروج حیات نے آسمان تک پہنچایا تھا اور اپنی چوٹی کی سفیدی میں آلام کی سیاہی کو چھپایا تھا، میرے سرنگوں ہوتے ہی اپنے وجود کی فکر میں پڑ گیا۔ برف گھبرا کر پگھلنے لگی، بلندیاں تیورا کر گرنے لگیں۔ پس میرا رنج وہ بھی بھول گیا۔

تو آ، عبدالرحمٰن[1] اپنا ماتم میں خود کر دل کہ میں کیوں مرا اور کیوں دنیا کے قبرستان میں آیا۔ کاش میں ذاتِ وحدت کی گود میں ہمیشہ زندہ رہتا اور کُن کے مرض سے یہ سامنا نہ ہوتا۔ اب ہو گیا تو صبر میرا ماتم ہے۔

# روح کا خول

ازاسوۂ حسنہ۔ نومبر ۱۹۱۵ء

تربوز کا چھلکا سبز۔ گودا سرخ۔ مزہ جو اس کی روح ہے، میٹھا مگر مٹھاس کی شکل دیکھی نہیں، چکھنے سے جانی۔

آم کا چھلکا سبز، رس زرد، مزا شیریں وہی اسکی جان ہے جس پر آدمیوں کی جان قربان ہے چاہتے سب جان اور روح کو ہیں مگر ہاتھ میں فقط اس کا خول آتا ہے۔ کمہاری ایک چھوٹا سا پر دار کیڑا ہے۔ بھڑ سے ذرا دُبلا پتلا۔ گھروں میں گیلی مٹی سے اپنا گھونسلا بناتا ہے

[1] عبدالرحمٰن پشاوری مراد ہیں۔

اور اس میں جھینگر مار کر اس کی لاش چھپا دیتا ہے اور دروازہ میں خود بیٹھ کر روح کے خول کو توجہ دیتا ہے۔ چند روز میں اس کے مراقبہ کی طاقت جھینگر کو زندہ کر دیتی ہے اور صحبت ہم نشین کا اثر بے رونق جھینگر کو خوبصورت کمہاری کی شکل بنا دیتا ہے اور جھینگر کمہاری بن کر اڑ جاتا ہے۔

توجہ اور مراقبے کی یہ برکت دیکھ کر اور جسم کی ماہیت میں انقلاب مشاہدہ کر کے میں نے ایک دن، جو ستمبر ۱۹۱۵ء کا آخری حصہ تھا، شملہ کے پہاڑ پر اپنے خول کا مراقبہ شروع کیا اور اپنی لاش پر نظریں جمائیں۔

کمہاری نے جس دن جھینگر کا شکار کیا اور اس کے ڈنک مارے تو اس کی تڑپ اور پھڑک سے ایک لالہ صاحب کا جی بہت دکھا تھا اور انہوں نے کمہاری کو ہتیاری جانور کا خطاب دیا تھا اور میں نے، جو اس وقت تک خواجہ حسن نظامی تھا، مظلوم جھینگر کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی۔

یہ واقعہ آج پیش آیا میرے خول کو میرے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا اور اس کے صدمے سے میں نے بھی ہمدردی ظاہر کی مگر جو نعمت مجھکو اس فرقت و زحمت میں نظر آئی تھی اس سے اوسان درست تھے اور اطمینان سامنے تھا اس لئے میں نے اپنے خول سے رسماً غمخواری کا اظہار کیا اور اس کی وہ کہانی سن لی جو اس نے دم توڑتے وقت جی بہلانیکو مجھسے کہی:۔

## نشہ کی کہانی

پہلے میرے خول نے ایک ایسی کہانی کہی جس کو میں سکرات کے نشہ کی نشانی سمجھا اور میں پہاڑ کے ایک پیارے پھول کی پنکھڑی پر لیٹ گیا اور اس کی بہکی بہکی باتوں کو متانت اور مسکراہٹ سے سننے لگا۔

خول نے کہا۔ برا ہو اس عبادت کا جس نے چڑیا کی جان لی۔ خواجہ پیارے آج سے

دس ہزار برس پہلے اس پہاڑ پر ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک عبادت گزار جوگی رہتا تھا ایک دن اس نے اپنے خیال کو خالق کے خیال سے لگایا اور چاہا کہ اس کا نور دیکھے کہ ایک چڑیا چڑ چڑاتی، پروں کو پھلاتی، پھدکتی، چیں چیں کرتی اس کی جھونپڑی میں آگئی۔ چڑا اس کے ساتھ تھا اس نے اپنی لیڈی سے محبت کی گفتگو شروع کی اور کہا پیاری دانہ چگ چکیں۔ آؤ اس فقیر کی تونبی پر چل کر بیٹھیں جس میں یہ پانی پیتا ہے اور باتیں کریں۔ چڑیا اچھلی اور مستانہ ادا سے دو تین جھوٹے ہوا میں کھائے اور تونبی پر جا بیٹھی

چڑے نے کہا۔ یہ آدمی کیا چاہتا ہے؟ چڑیا بولی اپنے خول کی خواہشوں سے درگزر اور نورحق تک رسائی۔ چڑا اچھلا کر بولا۔ دیوانہ ہے۔ خول ملا ہے تو اس کی خواہشوں کو بھی پورا کرنا پڑیگا۔ نورحق خواہشوں سے جدا تھوڑی ہے

جوگی کو سوائے چیں چیں کے غل کے اور کچھ سنائی نہ دیا اور اس نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر ان دونوں پر کھینچ مارا جو چڑے کے سر میں لگا اور وہ بیچارہ تڑپ کر زمین پر گر پڑا اور مرگیا۔ چڑیا یہ دیکھ کر پھُر سے اُڑگئی اور باہر درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی تھی اور اپنے خول کے بچ جانے پر شکر کرتی تھی۔ مگر تھوڑی سی دیر کے بعد اس کے دل کو شوہر کی محبت نے بیقرار کیا۔ وہ الفت کے غم میں اندھی ہوگئی۔ اس کی روح اپنے خول میں سر پیٹنے اور پھڑ پھڑانے لگی جس کے صدمہ سے اس کا خول بھی حرکت میں آگیا اور روح کے اندھے اشارہ سے مجبور ہو کر چڑیا پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔ وہاں اس کے غریب چاہنے والے چڑے کی لاش خاک پر پڑی تھی اور فقیر اپنے خول کو توجہ دے رہا تھا۔ چڑیا نے آہ و نالے شروع کئے کبھی وہ تونبی پر آتی کبھی جھونپڑی کے بانس پر جاتی۔ اس کی زبان تالو سے نہ لگتی تھی۔ وہ چیختی تھی اور بلبلاتی تھی۔

جوگی کے خیال میں پھر رخنہ پڑا۔ اس نے ایک اور جست کی اور چڑیا کو بھی ڈنڈے سے مار ڈالا۔

عاشق و معشوق کی لاشیں اٹھا کر جھونپڑی کے باہر پھینکدیں اور ایک لمبا سانس لیکر
جس سے تضییع اوقات کا صدمہ ظاہر ہو رہا تھا، پھر مراقبہ میں بیٹھ گیا۔
باہر چڑے چڑیا کے جنازے رکھے تھے اندر جوگی اطمینان سے گردن جمائے
بیٹھا تھا کہ نورِ حق ہاتھ میں شعلہ کی تلوار لئے نمودار ہوا۔ جوگی اس کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا
اور اس کی روح اپنے مرکز پر قربان ہونے کو خول میں پھڑ پھڑانے لگی مگر نورِ حق نے جوگی
کے خول پر شعلہ کا ایک ہاتھ مارا اور کہا۔ میری چڑیوں کا خون کیوں کیا جو فطرت کا سبق
سنانے تجھ تک آئی تھیں۔ ان میں زندگی تھی۔ وہ نسل بڑھانے کے ڈیوٹی تھے تیرے
ترکِ وجود سے ان کا رتبہ بڑا تھا۔
جوگی کے خول نے عاجزی سے معافی مانگی مگر اندر کی روح نے اپنے باپ نورِ حق
کو ترشی سے جواب دیا اور کہا۔ مجھ کو یہاں قید کر کے آپ آزاد رہنا چاہتا ہے۔ تو بھی تو
اس قفس کا مزا چکھ۔ دنیا میں تھوڑے پنجرے ہیں جن کے اندر کی ارواح تیری فطرت
کا حکم مانتی ہیں۔ ایک میں اگر تعمیل نہ کروں تو کیا نقصان ہو گا!
نورِ حق نے یہ سُن کر اندر کا سانس لیا اور جوگی کی روح ایک سناٹے کے ساتھ ہاتھ
پھیلائے کھنچکر اُڑی اور نورِ حق میں سما گئی۔
جوگی کا خول پڑا رہ گیا اور چڑیوں کے خول سے زیادہ اسنے اس جنگل کو بدبودار کیا۔
جب میرا خول یہ تشیلی کہانی کہہ چکا تو میں نے کہا۔ کہہ چکا یا کچھ باقی ہے۔ گھبرا مت
میں تجھکو سڑنے سے بچاؤں گا اور اس جنگل کو تیری بدبو سے آلودہ نہ ہونے دونگا۔ اس
وقت وہ خول بولا۔ اب میں ہوشیاری کی ایک کہانی کہنی چاہتا ہوں اس کو سُن لے
پھر جو تیرا جی چاہے کر۔
میں نے پھول کی پنکھڑیوں کو اپنے اوپر لپیٹ کر آنکھیں خول کی طرف پھیر لیں اور اس سے
کہا۔ پہلے یہ تو بتا کہ اس دنیا نے تیری کیا قدر کی جو تو دنیا میں رہنے پر اتنا اصرار کرتا ہے

اور اس کی امیدوں کی اسیری پر فدا ہو جاتا ہے۔ ناحق مثالیں دیکر مجھکو گرفتار کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ میں جب تک تجھ میں تھا ایک اچھا لکھنے والا اور اردو زبان میں ایک نئی روش ایجاد کرنے والا سمجھا جاتا تھا جو قلم سے ظاہر ہوتی تھی۔ یا کبھی کوئی سامنے آکر اس کو ادا کرتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ اس وقت مجھپر کیا حالت گزرتی تھی۔ میں الفاظ پرست خولوں کی یہ تعریف سُن کر بگڑتا تھا کہ یہ ایسے اندھے کیوں ہیں جو میری اس شان کو بیان نہیں کرتے جس پر مجھ کو نورحق نے اقتدار دیا ہے۔ نورحق سے میں جو کہتا ہوں وہ سن لیتا ہے اور اُس کو پورا کر دیتا ہے۔ میں نے جس کی سفارش کی، نورحق نے کبھی اس کو نہ ٹالا یہی نہیں نورحق نے اپنے طلسمی رنگا رنگ جلووں کو میرے پاس تنہا چھوڑ دیا اور میں نے ان میں خوابگاہ بنائی۔ خول کے لئے نہیں رُوح کے لئے۔

اے خول! آدمیوں کے جیل خانہ میں جی نہ لگا۔ یہ آدمی رشک کرنے لگتے ہیں جب کسی کے پاس کچھہ دیکھتے ہیں، اور انسان کو اپنے خول سے محبت ہو تو دوسروں کا رشک وحسد اس کو تکلیف دیتا ہے۔ کیا تو نے پایا کہ دنیا میں کتنے تیرے حاسد ہیں اور ان کی مکاری کینہ وری سے تجھکو کیسے کیسے صدمے اٹھانے پڑے۔ اگر تو اپنی خواہشات خاکی کو فراموش کردے اور میرے مراقبہ و توجہ کے آگے سر جھکا دے تو تیری یہ ساری تکلیفیں دور ہو جائینگی اور تو دنیا کے سب خولوں کا سرتاج بنجائیگا۔ مگر تجھ میں سرتاج بننے کی خوشی نہ ہوگی کیونکہ سرتاجی دکھ و سکھ کے جذبات کی فنائیت کے بعد حاصل ہوتی ہے جب یہ جذبات ہی نہ ہوں گے تو تجھکو اس کی خوشی نہیں ہوسکتی۔ البتہ تجھکو نورحق سے وہ انعام ملیں گے جن کے سامنے دنیا کی سب خوشیاں ہیچ اور بے نتیجہ ہیں۔

میرے خول نے یہ سن کر کہا اچھا تو میری کہانی سن۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا۔

## جڑی بوٹی کا شہید

چادر گل کے مزمل سن۔ کٹڑا ہو۔ قدرت کی حقیر اولاد جو ایک دن میں پیدا ہوتی، بڑھتی

پھولتی پھلتی اور مرجھا کر فنا ہو جاتی ہے جس کا نام گھاس ہے۔ بناس پتی ہے۔ جنگل کی جڑی بوٹی ہے اور جو تیری گلکار مسہریوں کے دامن خاک سے سر نکالے چپ چاپ کھڑی ہے۔ بڑی قاتل ہے، سفاک ہے، بڑی دولت والی ہے۔ امیری کی کنجی ہے بڑی طبیب ہے۔ امراض کی موت ہے۔ بڑی زندگی ہے۔ حیات کی روح رواں ہے۔

ایک پہاڑ کے نیچے میدانی زمین میں ایک راجہ رہتا تھا جس کا ایک ہی بیٹا تھا اس کا نام اندرجوت تھا۔ اس کی عمر سولہ برس کی تھی کہ باپ مرگیا اور گدی اس کے ہاتھ آئی اندرجوت کی رانی کنولا چودہ برس کی اور اندرجوت سے شکل وصورت میں ذرا گھٹیا تھی۔ اندرجوت اپنے زمانہ کا کنہیا تھا۔ اس کے حسن کی دھاک دور دور تھی۔ اس کو اپنی خوبصورتی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ سب سے بڑی سندرتا (خوبصورتی) اس کی آنکھوں میں تھی۔ اندرجوت ان کو دیکھ نہ سکتا تھا مگر جس کو دیکھتا تھا جس چیز پر نظر ڈالتا تھا، اس میں اپنی آنکھوں کی طاقت کو مشاہدہ کرتا تھا۔ کیونکہ آدمی ہو یا جانور، پتھر ہو یا درخت اس کی آنکھوں کے پرتو سے شرماجاتے تھے یا اندرجوت کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والی چیز اس کی آنکھوں کے رعب حسن سے جھک گئی ہے اور بے قابو ہے۔

کنولا اپنے پتی (شوہر) سے بہت کم عمر تھی مگر اس کے دل میں بھی خدا نے ایسی کشش دی تھی کہ اندرجوت اس کا والہ وشیدا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ اندرجوت کنولا کو لیکر دیبی کے درشن کو گیا جو پہاڑ کے دامن میں براجمان تھی۔ راستہ میں اس کو ایک پودنا جنگلی جھاڑی پر نظر آیا جس کے سرمئی پیارے رنگ کے سامنے اس کی بدصورت پودنی بہت بُری معلوم ہوتی تھی۔ اندرجوت نے کنولا سے کہا کہ پودنا اس بدشکل جوڑے سے کیونکر خوش رہ سکتا ہوگا۔ کنولا بولی جس طرح تم میرے ساتھ۔ یہ سن کر اندرجوت ایک خیال میں پڑگیا اور اس کو اپنے حسن کے غرور نے تھوڑی دیر بیخود بنائے رکھا۔

اندرجوت دیبی کے درشن کرکے واپس آرہا تھا کہ ایک مور دکھائی دیا جو اپنے بے مثال حسن کا لباس پہنے اپنی کالی کلوٹی بے ترینہ مورنی کو اپنا ناچ دکھا رہا تھا۔ اندرجوت کو پھر پودنے کا خیال آیا اور اس نے کنولا سے کہا۔ یہ بڑا بیوقوف ہے۔ ایسی بدشکل بیوی پر عاشق ہوا ہے۔ پودنا، مور اور شاید میں تینوں عقل سے دور ہیں۔ میں تجھسے چار مہینے بات نہ کروں گا جب تک اس کا بھید مجھکو معلوم نہ ہوجائے۔

کنولا بڑی عقل مند لڑکی تھی۔ اس نے اندرجوت کے اس بچپن سے برا نہ مانا اور کہا کچھہ ہرج نہیں۔ تم اس کو سوچو اور تحقیق کرو اور چار مہینے مجھ سے الگ رہ سکتے ہو تو رہو۔ میں تم کو اجازت دیتی ہوں۔

اندرجوت یہ سن کر بگڑا اور کہا۔ تم کو اجازت دینے نہ دینے کا کچھہ اختیار نہیں۔ میں نے اپنی خودمختاری سے یہ ارادہ کیا ہے اور اپنے ہی اختیار سے اسپر عمل کروں گا۔ تم میری تابعدار لونڈی ہو مگر بہت بدصورت ہو۔ تم میرا جوڑ نہیں ہوسکتیں۔ تم میری آنکھوں کی جوت تک کو نہیں سہار سکتیں اور میرے نگاہ بھر کر دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتی ہو۔

کنولا بولی جو کچھہ تم نے کہا سچ ہے۔ میں تکرار نہیں کرتی۔ تم چار دن سے زیادہ اپنے ارادہ کی خودمختاری پر قائم رہ جاؤ تو غنیمت ہے۔ مجھکو خدا نے حسن نہیں دیا تو دوسری نعمت دی ہے جو تم کو میسر نہیں۔

**اندرجوت**:۔ وہ کیا نعمت ہے؟

**کنولا**:۔ تمہیں سوال کرنے کا کچھہ اختیار نہیں۔

**اندرجوت**:۔ میں پوچھتا بھی نہیں۔

اتنے میں گھر آگیا اور یہ دونوں علیحدہ علیحدہ حویلیوں میں اتر کر چلے گئے۔

کنولا نے حویلی میں جاتے ہی ماما کو اپنے گرو کے پاس بھیجا جس نے سارا قصہ ان سے کہا۔ گرو صاحب بڑے عالم اور دنیا کے حال سے خبردار تھے۔ انہوں نے ماما کو

دھکا کر نکال دیا اور کہا۔ میں کیا کروں میاں بیوی کے قصہ میں دخل دینے کا مجھے کچھ حق نہیں ہے۔ جا کنولا سے کہدیجیو کہ آیندہ مجھسے اپنے گھر کے جھگڑے بیان نہ کرنا۔

ماما بھی ہوئی کنولا کے پاس آئی اور گروجی جنگل گئے اور وہاں انہوں نے سات کنکروں پر کچھ دم کیا اور نالے میں ڈال دیئے۔ اُدھر کنولا کو گروجی کے برتاؤ سے اتنا رنج ہوا کہ اس نے ہیرے کی کنی کھانے کو منگائی مگر فوراً اس کے دل نے کہا کہ جو تعلیم گروجی نے مجھکو دی ہے اس میں صبر کا بڑا درجہ ہے" سنتوش پرم لابھ" (صبر میں بڑا نفع ہے) رامچندرجی کا قول ہے۔ پس مجھکو بھی اپنے کلیجہ پر پتھر رکھنا چاہیئے۔ دیکھئے غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

کنولا اسی خیال میں تھی کہ اندرجوت آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس کے پاس آیا اور اس کے پیروں میں گر پڑا۔ کنولا نے کہا خیر ہے تم میرے پتی اور مالک ہو اور میں تمہاری ادنےٰ لونڈی۔ یہ کیا کرتے ہو؟

اندرجوت بولا۔ میں نے غلطی کی جو تم سے ایسی سخت باتیں کیں۔ خدا نے میرے دل کو روشنی دی اور میں نے تمہاری شان پہچان لی۔ اب میں کبھی اس کی قدرت میں دخل نہ دوں گا۔

کنولا حیران تھی کہ یہ کیا انقلاب ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ گروجی ہاتھ میں ایک بوٹی لئے چلے آتے ہیں۔ انہوں نے وہ بوٹی اندرجوت کو دی اور کہا لے اسکو اپنی آنکھ پر رکھ اندرجوت نے اس پتہ کو اپنی آنکھ سے لگایا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ کنولا نور کا ایک پتلا ہے اور اسقدر حسین ہے کہ اندرجوت نے اس سے پہلے کبھی ایسی خوبصورت عورت نہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد گروجی نے کہا۔ نادان نظر کے دھوکے میں نہ پڑ۔ اس دنیا میں جو بدصورت ہیں، ان کو قدرت کی آنکھ سے دیکھے گا تو اچھی شکل میں پائیگا۔ مورنی اور پودنی خاکی آنکھوں میں بدنما ہیں مگر مور اور پودنے کی حقیقت شناس نگاہوں میں بیحد خوشنما۔

اندرجوت کو حیرت تھی کہ گروجی کو ہمارے مخفی قصہ کی کیونکر خبر ہوگئی اور ان کی کرامت کا قائل ہوگیا۔

اب اندرجوت گروجی کے پاس روزانہ جانے لگا۔ اس کو جڑی بوٹی کے علم کا عشق ہوگیا تھا۔ گروجی نے بھی اس کے شوق کے موافق بوٹیوں کے صدہا خواص سکھائے۔

# کایا پلٹ بوٹی

ایک دن گروجی نے اندرجوت کو کایا پلٹ بوٹی بتائی اور کہا اس کو اگر ناف پر باندھ لیا جائے تو انسان اپنی روح کو جسم سے نکال کر آزاد کرسکتا ہے اور روح کو جہاں چاہے سیر کرنے کے لئے بھیج سکتا ہے اور پھر جب جی چاہے واپس بلاسکتا ہے۔

اندرجوت نے کہا پھر دوبارہ اپنے جسم میں بھی ڈالنا ممکن ہے یا نہیں؟ گروجی بولے کیوں نہیں۔ یہ نہ ہو تو کمال ہی کیا ہوا۔ مگر شرط یہ ہے کہ روح کو کسی ایسی جگہ نہ بھیجے جہاں سے وہ اُلٹی نہ آسکے۔

**اندرجوت:۔** وہ کونسا مقام ہے جہاں سے روح واپس نہیں آتی؟

**گروجی:۔** خدا کی جھولی جس میں ارواح رہتی ہیں۔ روح کا پسندیدہ مقام ہے۔

**اندرجوت:۔** وہاں مجھے بھیجنے کی کیا ضرورت ہوگی میں کبھی وہاں نہ بھیجوں گا۔

**گروجی:۔** نہیں۔ یہ بات تمہارے اختیار میں نہیں۔ دیکھو جو لوگ کسی نیک کام کی حمایت میں مارے جاتے ہیں ان کی روحیں خدا کی ذات کے قریب ایک نورانی قندیل میں چلی جاتی ہیں اور وہاں ان کو ایسا مزہ ملتا ہے جو دنیا کے کسی سرور کے مشابہ نہیں ہے جس کو تم سمجھ سکو۔ بس یہ خیال کرو کہ وہ بہت ہی بڑا لطف ہے جو خدا کی ذات میں فنا ہونے سے پہلے اس مادی دنیا میں ارواح کو میسر آتا ہے۔

اگر تم نے کایا پلٹ بوٹی سے اپنی روح کو اپنے خول سے الگ کرلیا اور کہیں سیر

کرنے کو بھیجا تو وہ ضرور آزادی کی ہوا سے سرشار ہو کر اپنی شہید روحوں کی قندیل میں چلی جائیگی اور وہاں گئی تو پھر کبھی نہ آئے گی۔

**اندرجوت**:۔ جب اس قندیل میں آپ کے فرمانیکے بموجب بہت بڑا سرور حاصل ہوتا ہے تو میں اپنی روح کو واپس کیوں بلاؤں گا۔ اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں رہے جہاں اس کو راحت اور چین ملتا ہو۔ اس دنیا کی تکلیف اور بے مزہ زندگی سے تو وہ لاکھ درجے بہتر ہے۔

**گروجی**:۔ یہ سچ ہے مگر قندیل مبارک میں غیر شہید روح کو رہنے کا حکم نہیں ہے جو روح جسم کی شہادت کے بغیر محض سیر کے لئے وہاں چلی آتی ہے تو چند روز کے مزے کے بعد ایک دکھ لگ جاتا ہے اور وہ پھر دنیا کے کسی ناپاک جسم میں ڈال دی جاتی ہے اور قید کی تکلیف اٹھاتی ہے۔

**اندرجوت**:۔ تو پھر کسی نیک کام میں شہید ہو کر اپنی روح کو قندیل مبارک میں کیوں نہ بھیجوں۔

**گروجی**:۔ ہاں ایسا کرو گے تو ہمیشہ وہاں رہو گے۔

**اندرجوت**:۔ بتائیے وہ شہادت کونسی ہے؟

**گروجی**:۔ خدا اور اس کے علم کی تلاش میں اگر آدمی مرجائے تو اس کی روح قندیل مبارک میں چلی جاتی ہے کسی مظلوم کی حمایت میں مارا جائے تو اس کو یہ درجہ ملتا ہے۔

لیکن اے اندرجوت اگر تو جسم کی قید میں رہکر اپنی خواہشوں پر قابو رکھے اور خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو نیک کام میں صرف کرے اور نفس کی دشمنی پر فتح پائے تو کسی موت مرے قندیل مبارک میں ضرور تیری روح کو جگہ دی جائے گی اور تیرا نام شہیدوں میں لکھا جائیگا۔ دیکھ جس زمانہ میں اچھی باتوں کی بیقدری ہو جائے اور خلقت نیکیوں کو عقل اور آرام کے خلاف سمجھنے لگے۔ اس وقت میں اگر کوئی شخص ایک نیکی کو بھی زندہ کرے گا تو اس کی روح کو مرنے کے بعد قندیل حق میں اونچی جگہ دی جائیگی۔

اندرجوت نے گروجی سے یہ سن کر اپنے وقت کے دو حصے کئے۔ ایک میں وہ اپنی

حکومت کے کام کرتا تھا اور مظلوموں کی فریاد سنتا تھا اور دوسرے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کرتا تھا اور کنولا بھی اس کے شریک حال رہتی تھی۔ ایک روز وہ کنولا سمیت ایک بوٹی کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں ایک سانپ نے کاٹا۔ کنولا سانپ کو پاؤں سے چھڑانے لگی۔ کیونکہ وہ انگوٹھے کو چمٹ گیا تھا تو سانپ نے کنولا کے ہاتھ میں بھی کاٹ کھایا۔ سانپ ایسا زہریلا تھا کہ دونوں وہیں پانی ہو کر بہہ گئے۔ مگر ان کی ارواح فوراً قندیل مبارک میں اڑ کر چلی گئیں۔ جہاں ان کا ارواح نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا اور یہ دونوں ابدی اور کامل عیش سے وہاں رہنے لگے۔

لہٰذا تو بھی اے میری روح ایسا ہی کر اور مجھ خول میں مقید رہ کر نیک کاموں میں مصروف ہو تا کہ شہیدوں کی قندیل حق تک رسائی پائے۔ یوں خواہ مخواہ مجھکو ترک کرنے اور غیر فطری آزادی سے تجھکو کچھ حاصل نہ ہو گا۔

میں نے اپنے خول کی کہانی سن کر قہقہہ لگایا اور کہا دیوانے تو نے اپنے خاکی جذبات کے مطابق قندیل حق کو بھی عیش خانہ سمجھا۔ کوئی اور مثال دی ہوتی۔ مگر دیتا کیونکر تیری عقل کا عروج تو خواہشات و لذات نفس تک ہے۔

**خول:۔** نہیں میں نے کہا ہے کہ قندیل مبارک میں جو سرور ارواح کو ہوتا ہے اس کی مشابہت ہماری دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہے۔ صرف سمجھنے کو کسی دنیاوی لطف سے نسبت دے سکتے ہیں۔

**میں:۔** خیر اگر تو نے یہ کہا بھی تب بھی میں خیال کرتا ہوں کہ تیری پرواز فانی لذتوں سے آگے نہیں ہے۔ میں قندیل حق میں شہید ہو کر جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہاں مجھکو دوسری ارواح کے ساتھ عیش و راحت نصیب ہو۔ وہاں میرا کام یہ ہو گا کہ سب ارواح کو قندیل کی قید کا دکھ بتاؤں اور ان سے کہوں کہ تم سب جد و جہد کرو اور اس محدود حیات سے نکل کر ذات الٰہی کی لامحدود ہستی میں فنا ہونے کی کوشش کرو۔ کیونکہ قید تعین میں

خواہ ہم کو کیسا ہی لطف ہو۔ پُر وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو محویت و فنائیت ذات میں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ذات الٰہی ہی ہر رُوح کا اصلی مرکز ہے۔

اگر میں تنذیل حق کے بعد بہشت میں گیا تو وہاں بھی جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ کس قسم کا عیش چاہتا ہے تو آزادی بیانِ حق کی طلب کروں گا اور جنت والوں کو بہکاؤنگا کہ وہ بہشت کے جیل خانہ سے نکلیں اور موج الوہیت کی غرقابی خدا سے مانگیں

اے خول! میں تجھ سے نفرت نہیں رکھتا۔ میں تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو قانونِ اسلام اور قانونِ دنیا کے برخلاف ہو۔ میں تجھ کو کسی قسم کی مادی اذیت نہیں دینی چاہتا۔ مجھکو یہ بھی منظور نہیں کہ فطرت کے مقررہ وقت سے پہلے تجھ سے الگ ہوجاؤں یا کسی اور کو ایسا کرنے کی نصیحت کروں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے جدا ہو کر ذرا اپنے اور تیرے حالات کا مطالعہ کیا کروں۔ جب تک تجھ سے جدا نہ ہوں گا، سمجھ نہیں سکتا کہ تو کیا ہے اور میں کیا ہوں۔ تو کس حال میں ہے اور میں کس حال میں ہوں تجھے کیا کرنا چاہیئے اور مجھپر کیا کیا فرائض ہیں۔

میرے مٹی کے پتلے! تیری دید کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ تیرے اندر بند رہکر تو ہی بتا کہ تجھ کو کیوں کر دیکھوں۔ مانتا ہوں کہ دید کے ہزاروں طریقے ہیں مگر جو دید منزل تک پہنچاتی ہے وہ تیرے بندھن سے باہر آئے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی۔

یہ خیال نہ کر کہ میں ہمیشہ اس کھوپل کی سی ہستی پر بستر جمائے رہوں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ محدود رہنا مجھ کو بالکل ناپسند ہے۔ میں ہمیشہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے میں مصروف رہتا ہوں اور اس میں کہیں نہ رکوں گا۔ تاوقتیکہ خدا کو نہ پالوں اور خدا کے پانے پر بھی چپکا نہ رہوں گا۔ یہاں تک کہ اس کی ذات میں سما کر نابود کے اسم سے آزادی حاصل نہ کرلوں۔

**خول:۔** یہ حکم کہاں ہے کہ تو مجھ سے جدا ہو کر مجھکو پڑھے۔ علم اندر رہکر اچھا ہوتا ہے نہ کہ باہر نکل کر؟

میں ۱۔ خدانے اپنے عربی کلام میں کہا ہے ۱۔ و فی انفسکم افلا تبصرون جس کی تعمیل جسم کی قید میں محال ہے

ارے غافل میں تجھ سے جدا کب ہوں۔ تو مجھ میں ہے تو میں تجھ میں ہوں اور تیرے ہی اندر رہکر علم حاصل کر رہا ہوں مگر یہ وہ اندرون نہیں جس کو تو چاہتا ہے کہ خواہشوں میں اسیر ہو کر علم حاصل کروں بلکہ یہ وہ اندرون ہے جو مجھ روح کی اصطلاح میں اندرون ہے اور جس سے حکم خدا کی تعمیل اور دنیا میں آنے کا منشار پورا ہوتا ہے۔

# دامِ مگس

صوفی۔ جنوری ۱۹۱۶ء

بلبل کو اسیر کر کے شاعروں کی یورش مول لے لی جس کو سنو قلم کی تلوار کھینچے آنکھیں بند کئے عالمِ خود فراموشی میں بلبل کے صیاد پر پلا پڑتا ہے گویا غریب صیاد کو کچا چبا جائے گا۔ کوئی پوچھے کہ شاعروں کو بلبل سے کیا ہمدردی ہے عقل مند جانتے ہیں کہ چمن کے موسم گل میں بلبل، اور انسان کی محفل عیش میں شاعر، دونوں کانٹے ہیں۔ بلبل چمن میں آتا ہے تو پھولوں کی مستیاں اور خوش ادائیاں نالہ و فریاد کر کے خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھول عالم سکوت میں اپنی نشیلی آنکھ کھولتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا چاہنے والا بھی ایسا ہی مخمور و خاموش ہو۔ سنجیدگی و متانت سے بہار حسن لوٹے۔ نہ کہ بلبل کی طرح چیخے چلائے۔ ہائے گل ہائے گل کے نعرے لگائے۔ وصل نصیب ہو تو چونچ کی بیتاب بوسہ بازی سے برگ گل کو پاش پاش کر دے۔

شاعر محفل میں جاتا ہے تو کبھی افسردہ دلی سے ساری انجمن کو افسردہ کر دیتا ہے کبھی اپنی زندہ مزاجی سے داب مجلس میں برہمی ڈالتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے، کبھی روتا ہے۔

غرض یہ بھی بلبل کی طرح آزار دہندہ ہے خود تکلیف میں رہتا ہے، دوسروں کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔

شکاری نے دام بچھایا اور شورش کنندہ بلبل کو اسیر کیا تو جناب شاعر کا کیا نقصان ہوا جو شکاری کو کوستے ہیں اور اس کی ہجو میں دفتر کے دفتر کالے کئے ڈالتے ہیں۔ خیر آج میں نے ایک ایسی چیز کے لئے دام بچھایا ہے جو شاعر صاحب کے کوچۂ عشق سے محرم ہے بلکہ بعض اوقات ان کی فکرِ شعر میں حارج ہوئی ہے۔ دیکھوں اس کی اسیری کی نسبت بھی حضرت کے قلم میں کچھ حرارت آتی ہے یا نہیں؟

یہہ دام مگس کے لئے ہے۔ دام بھی بے نقط اور مگس بھی شاعر صاحب کی بے نقط گالیوں کا کچھ اندیشہ نہیں جو خود بے نقط ہوگا وہ دوسرے کی بے نقط صلواتوں سے کیا ڈرے گا۔

# کاغذی جال

میں نے دیکھا کہ اس زمانہ میں اخباروں رسالوں کے کاغذی جال چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور حرص و ہوس کی اسیر ارواح اپنے اجسام کو ان میں پھنسا رہی ہیں۔ اس واسطے میں نے بھی دو آنے کا مکھی مار کاغذ بازار سے خریدا اور اپنے رین بسیرے کی آزاد مکھیوں کے سامنے یہ کاغذی جال لگایا۔

اس وقت میرے دل میں مکھیوں سے کسی انتقام کی خواہش نہ تھی۔ نہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس عقیدہ کو تسلیم کیا تھا کہ مکھی ہر بیماری کی جڑ ہے۔ میرے دماغ میں جرمنی قیصر کی خونخواری کا بھی کچھ دخل نہ تھا۔ نہ مجھ پر موجودہ جنگ کا ارتقائی اثر پڑا تھا جو میں غریب مکھیوں کے قتلِ عام پر آمادہ ہوتا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مکھیوں نے مجھے بہت کم ستایا ہے۔ مچھروں کی جتنی شکایت کروں تھوڑی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرے جسم کے

خون کو شیر مادر سمجھا۔ بچاری مکھیاں میرے دسترخوان کی شریک ہمجولیاں ہیں۔ میں ان سے اس قدر محبت رکھتا ہوں کہ جب کبھی انہوں نے میرے سالن میں ہاتھ ڈالا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور سارا دسترخوان ان کے آگے رکھ دیا۔ خود نہ کھایا۔ سب کچھ ان کو سونپ دیا۔

پھر جو میں نے ان کی گرفتاری و قتل کاری پر کمر باندھی، اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میں فقرہ "مگس بے حیا" کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ خواہش تھی کہ میں اس جانور کی اسیری کا تماشہ دیکھوں جس کو سرمدؒ نے سوزِ عشق سے محروم گردانا ہے اور کہا ہے کہ:۔

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دل پروانہ مگس را ندہند

جب مکھی بوالہوس ہے تو دیکھوں اسیرانِ ہوس کیونکر حرص و ہوس کا شکار ہوتے ہیں اور ان پر کیا کیا بپتائیں پڑتی ہیں۔

سب سے زیادہ مجھکو اس ننھے سے پرندے کی ایک اور آزمائش منظور تھی کہ وہ اپنی جان بچانے میں کہاں تک محتاط ہے اور جب اس پر آفت آجاتی ہے تو کس کس طرح حفاظتِ زندگی میں کوشش کرتا ہے۔ خاصکر یہ کہ مکھی پر سکراتِ موت کی کیسی کیفیت ہوتی ہے اور اس کے بے حقیقت اور ناتواں جسم سے جان کتنی دیر میں نکلتی ہے؟

یہ بہت وحشیانہ تجربہ تھا۔ یہ بہت بیدردانہ تحقیقات تھی۔ اس میں دردمندی اور ترس شعاری کا ذرا دخل نہ تھا مگر جذبۂ بشری نے مجھکو سنگدل بنا دیا۔ رحم میرے خانۂ دل میں منہ چھپا کر جا بیٹھا اور میں نے اپنے بستر کے آس پاس بسنے والی مکھیوں کو جال میں پھانسنے پر کمر باندھی۔

یہ کاغذی جال گورے ملکوں سے آیا ہے اس میں انگریزی حروف ہیں اور بھورے

رنگ کی ایک چیپ دار چیز ہے۔ جب میں نے اس کاغذ کو زمین پر رکھا، ایک بھولی بھالی نشۂ شباب کی متوالی مکھی جست کر کے اسیر آئی اور جھپٹا مار کر ہوس کے پردں سے نیچے اتری قدم رکھنا تھا کہ دام میں اُلجھ گئی۔ یہ حالت دیکھکر اس نے چاہا کہ اُلٹے پاؤں بھاگے اس واسطے وہ پھر بالائی جست کے لئے اُبھری ، ٹھکی ، مگر پاؤں جال میں پھنس چکے تھے۔ اس نے ساڑھے چار سکنڈ توقف کیا اور دَم لیکر لگاتار اکیس سکنڈ اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا۔ اس وقت اس کے پاؤں قید تھے لیکن جسم پروں کی طاقت پرواز سے بار بار جنبش کرتا تھا۔ پَر ایسی تیزی سے ہوا میں لہریں لیتے تھے کہ ان کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ آخر اکیس سکنڈ کے بعد قوت پرواز نے جواب دیدیا، پَر شل ہو گئے اور مکھی اپنے بائیں رُخ جھکی۔ جھکنا تھا کہ بایاں پَر بھی جال میں پھنس گیا اور مکھی آڑی ہو کر بیدم ہو گئی۔ ۳۰ سکنڈ وہ چپ چاپ پڑی رہی اور اس کے بعد پھر زندگی کی تمنا نے اس کو آمادہ کیا کہ ایک بار اور جان بچانے کی کوشش کرے۔ اب کے اس نے مایوسانہ عالم میں اپنے بدن کو حرکت دی اور ایک دلخراش چیخ بھی ماری جو مسلسل گیارہ سکنڈ ہوا میں گونجتی رہی۔ مگر ہائے اس میں بھی اس کو کامیابی نہ ہوئی اور فرشتۂ موت اس کے سامنے آ گیا اور مکھی نے دنیا سے گزر نے کا تہیہ کرلیا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ اتنی جلدی اس کو موت سے سابقہ پڑے۔ وہ اپنی عمر کو بہت دراز تصور کرتی تھی۔ اس کو خیال تھا کہ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی اور میں اس میں آخر تک بھنبھناتی پھرو ں گی۔ آج اس نے موت کا پیام سنا جس نے اس کے ارمانوں میں ہلچل ڈالدی۔ وہ چپ ہو گئی اور موت کے فرشتے کو حیرت و یاس سے دیکھنے لگی۔

جب میں نے معلوم کیا کہ مکھی سکرات میں ہے تو گھڑی کو جلدی سے ہاتھ میں لیلیا اور پھر سکنڈ شمار کرنے لگا۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ اس وقت مجھکو اپنی سکرات کی مشکلات کا خیال کرنا تھا جو ایکدن مجھکو بھی پیش آئے گی۔

مکھی پر سکرات کا عالم ایک منٹ طاری رہا۔ اس کے بعد اس نے داعی اجل کو

اپنی روح دیدی اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ہم سب خدا کے ہیں اور آخر خدا ہی کے پاس جاتا ہے۔

جتنی دیر میں اس نوجوان مکھی کے انجام کار کی دید میں مصروف رہا اتنے عرصہ میں مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ دس بیس اور نئے وجود اسیر بلا ہو چکے تھے اور تڑپ رہے تھے۔ غور کیا تو قریباً ہر مکھی ایک سکنڈ تک کوششِ پرواز اور سعی رہائی میں مصروف رہکر آخر بائیں جانب جھک جاتی تھی اور اس کا بایاں پَر سالہ میں آلودہ ہوکر اس کو جان سے کھو دیتا تھا۔

اس کے بعد اور بھی تماشے دیکھے۔ بعض مکھیاں سرنگوں رہگئیں۔ بعض ایسی آئیں کہ پاؤں رکھتے ہی خاموش ہوگئیں ذرا جنبش نہ کی اور مری کی مری رہگئیں۔ یہہ شاید سالہ کے زہر کا اثر ہوگا۔

# نابینا حرص

میں نے دیکھا کہ سینکڑوں لاشیں مکھیوں کی پڑی ہیں۔ آزاد مکھیاں ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود اس جال میں آتی ہیں اور جان بوجھکر اسیر پنجہ اجل ہو جاتی ہیں۔

دل نے کہا ان میں اتنی عقل نہیں ہے جو اس قتل خانہ کی حقیقت کو سمجھیں غیب کی صدا بولی نہیں۔ قدرت نے ہر جاندار کو موت وحیات کے خطرات کی تمیز و عقل دی ہے مکھی اس سے محروم نہیں ہے لیکن چونکہ حرص وہوس کے آنکھ نہیں ہوتی۔ اسواسطے یہ بیچاری بھی اس کے ہاتھوں اندھی ہوکر موت کے منہ میں جا پڑتی ہے۔

انسان سے زیادہ کس کو عقل ملی ہے کیا اسکے اندھے پن کو نہیں دیکھا کہ وہ جان بوجھکر ہی ہمیشہ موت وہلاکت کے منہ میں جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ شراب سے لاکھوں آدمی تباہ ہوگئے۔ سب کی آنکھوں کے سامنے اس کی مثالیں پیش آتی ہیں مگر پھر

بھی خلقت شر انگاری سے باز نہیں آتی۔ ہر ایک کو معلوم ہو گیا ہے کہ کوکین کھانے سے آدمی
چند روز میں گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ اس کا مال تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کی آبرو خراب ہوتی ہے
حکومت جیل خانے بھجواتی ہے مگر ہوس کی نابینائی اس کو کین سے باز نہیں رہنے دیتی اور وہ
دیدہ و دانستہ موت و بربادی کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

یہی حال قمار بازی کا ہے، عیاشی کا ہے اور ہر اُس چیز کا ہے جس میں جسمانی و روحانی
خطرے ہیں جب عقلمند آدمی نہیں بچتا اور نہیں دیکھتا تو مکھی بیچاری کس گنتی میں ہے۔

دام مگس مکھیوں کی لاشوں سے کالا ہو گیا۔ میرا دل اس قتل عام کی سفاکی سے ہانپنے
لگا تو میں نے اپنی گردن پورے چار گھنٹے کے بعد اوپر سے ہٹائی اور مکھیوں کی ارواح
سے گفتگو کی ٹھہرائی۔

# روح مگس نمبر ایک

جس وقت اجل کا ہاتھ ایک مکھی کی روح کو مٹھی میں لیکر چلا تو میں نے اجل کے دامن کو پکڑ لیا
اور پوچھا۔ کیا مجھکو اجازت ہے کہ چند باتیں آپ کے قیدی سے دریافت کروں؟ دستِ
اجل نے ذرا تامل کے بعد جواب دیا۔

قدرت نے مجھکو اس کا اختیار نہیں دیا ہے لیکن اے آدمی تیری انسانی عظمت کے
سامنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو روح مگس سے مجھکو روک کر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے
پوچھ جو تیرا جی چاہے۔

تب میں نے مکھی کی آزاد روح سے سوال کیا۔

تم قید جسم کے بعد اس حالت اور اُس حالت میں کیا فرق دیکھتی ہو؟

روح مگس:۔ وہ کیفیت مجھکو محسوس ہوتی ہے جس کا سمجھنا محال ہے۔ پہلے میں تعلقات
جسم کے پردوں میں ایسی بندھی تھی کہ باہر آنیکو میرا جی نہ چاہتا تھا اور جانکنی کے وقت نے مجھ پر

حسرتیں اور بیقراریاں برسار کھی تھیں مگر اب مجھکو نظر آتا ہے کہ میں اپنے وقت کی ملکہ ہوں دستِ اجل کی مٹھی میں بند ہوں لیکن تمام کائنات میری آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتی ہے۔ میری آنکھوں سے عالم کی کوئی شئے پوشیدہ نہیں ہے میرا جی چاہتا ہے کہ موت پر میں ہزاروں بار صدقے قربان ہوں جس کی بدولت میں نے منزل راحت پائی۔

میں :- کیا عالم علوی کا بھی مشاہدہ کرتی ہو؟

روح نگس :- نہیں ابھی مجھکو وہ بہت دُور کچھ مٹا مٹا اور دُھندلا دُھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کے وجود کو پاتی ہوں مگر بیان کرنے اور تمیز کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ صرف اتنا کہ اس کے موجود ہونے پر یقین کرسکوں۔

میں نے یہ سن کر دست اجل سے کہا کہ اچھا اس کو لے جاؤ۔ باقی سوال دوسری ارواح سے کئے جائیں گے۔ جب یہ روح غائب ہوگئی تو میں نے دوسری نکھی کی روح کو روکا۔

## روح نگس نمبر ۲ دو

تم بتاؤ کہ اس وقت بے خود ہو یا خودی میں ہو؟

روح نگس :- قید سے آزاد ہوئی اب بیخودی کیسی۔ خودی میں ہوں۔ خودداری کا لطف اس وقت آیا ہے۔ حالتِ جسم میں دیکھنے کو با خود، آزاد، خود مختار تھی۔ مگر درحقیقت عالم سفلی میں اپنی حرص وہوس کی غلام اور بیخود تھی اور عالم علوی میں قانون قدرت کے زبردست دباؤ نے مجھ کو معطل کر رکھا تھا۔ نہ اپنے اختیار سے اُڑتی تھی اپنی طاقت سے نقل وحرکت کرتی تھی نہ اپنے بل پر زندگی بسر کرسکتی تھی ہر چیز میں نیچر و فطرت کی مخفی سلطنت مجھ پر حکمراں تھی۔ تم جان سکتے ہو کہ محکومیت میں خودی کہاں رہ سکتی ہے۔ اس میں تو ہر ہستی بے خود بننے پر مجبور ہوتی ہے۔

کیا تم انسانوں کے حالات پر غور کرنے اور ان میں دخل دینے کی صلاحیت رکھتی ہو؟

روح مگس :- ہاں اس وقت تو میرا ادراک ارواحِ انسانی کے بہت قریب ہوگیا ہے میں بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ مجھ میں سمجھانے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔

تو کیا تم کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نامی ایک مشہور شاعر نے آج کل ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں جسمانی و نفسانی خودی کو قائم کرنے اور دنیا کے تعلقات سے محبت بڑھانے کی تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ خودی کو مٹانا اور تعلقات دنیا سے بے رغبتی سکھاتے ہیں وہ بڑے ہی احمق اور بیوقوف ہیں۔

روح مگس :- ہاں ہاں میری بصیرت اس مثنوی کو صاف دیکھ رہی ہے جس کا نام "اسرار خودی" رکھا گیا ہے اور جس میں حکیم افلاطون اور لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کو نہایت سخت حقارت سے یاد کیا گیا ہے اور ان کی پیروی کو خطرناک بتا کے آدمیوں کو اس سے روکا گیا ہے

اچھا جب تم اس مثنوی کو دیکھ رہی ہو اور اس پر اتنی حاوی ہوگئی ہو کہ تم نے اس کے مضامین بھی بتا دیئے، تو بتاؤ حضرت حافظ شیرازیؒ کی روح اس توہین کی نسبت کیا خیال کرتی ہے؟

روح مگس :- یہ سوال میری حالت سے بہت اونچا ہے۔ اب مجھکو جانے دو کہ آزادی کے بعد عجیب قسم کی تمنائیں مجھ میں پیدا ہوئی ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ میں اس عالم سفلی کے ہر تعلق سے جلدی کنارہ کش ہو کر ان آرزوؤں کی جانب متوجہ ہوں۔

یہ سن کر میں نے دوسری مکھی کی روح کو بھی رخصت کیا اور تیسری روح کو روک کر گفتگو شروع کی۔

## روح مگس نمبر تین

ارے بی ذرا ٹھہرو۔ ایسی بھی کیا گھبراہٹ ہے۔ یا تو یہ حالت تھی کہ موت کی صورت

دیکھتے ہی دردناک آہیں کھینچتی تھیں اور مرنے کے نام سے ہراساں ہوئی جاتی تھیں۔ یا یہ کیفیت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار اُڑی چلی جاتی ہو۔

رُوح مگس "کہو کہو، جلدی کہو وقت خراب نہ کرو" یہ کہہ کر روح مگس نے ایک ایسے پیارے انداز سے انگڑائی لی اور خمار آلود آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا کہ میں سینہ تھام کر رہ گیا۔ میں نے کہا کہ ہریالی، راج دُلاری بنو یہ تم کس کو دیکھتی ہو، یہ تمہاری انکھڑیوں میں لال لال ڈورے کیوں پڑے جاتے ہیں، یہ تم پرستی کس بات کی چھا رہی ہے؟

روح مگس:۔ (مسکرا کر اور اپنے وجود برقی کو کچھ بل دیکر بولی) ارے آدمی کچھ پوچھتا ہے یا خواہ مخواہ مغز زنی کرتا ہے۔ کیا بتائیں کیا ارمان ہیں، کیا کہیں کس کے گلے لگنے کی تمنا ہے۔ تو اپنی سوکھی فلسفیانہ باتوں کو جانے دے اور میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔

یہ کہہ کر مکھی کی روح نے پھر ایک جمائی کے ساتھ انگڑائی لی اور آنکھوں کو مل کر بولی۔ بعد مدت کے غریبوں کا نصیبا جاگا۔ یہ کہا اور پھر آسمان کو للچائی اور شوق بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اب کے اُن نظروں میں اس قدر مستی تھی کہ مجھکو اپنی قید عنصری سے نفرت ہونے لگی اور میں نے چاہا کہ جسم سے آزاد ہو کر اس بہار تک میں بھی پہنچ جاؤں اور روح مگس جس دید میں مصروف ہے میں بھی اس کو دیکھوں۔

اس روح کو جب میں نے بہت بے قرار دیکھا تو کہا عشق دنیا اچھا ہے یا عشق آخرت؟ اور جس دنیا سے تو آئی ہے وہ تجھ کو اب کیسی معلوم ہوتی ہے؟ روح مگس نے جواب دیا دنیا کیسی، آخرت کیسی، عشق آزادی، عشق حیات ابدی کہو یعنی یہ زندگی، جو اس وقت مجھکو حاصل ہے اور جو دوامی ہے، اگر اسی کا نام تمہارے ہاں آخرت ہے، تو کہوں گی کہ عشق آخرت کی آرزو کرو، اس دنیا کو لات مارو۔ یہ کہتے ہی چلی گئی۔

# روحِ مگس نمبر چار

مجھ کو اس گفت و شنید میں ایسا مزہ آیا کہ میں نے ہر مکھی کی روح سے بات چیت کا تہیہ کر لیا اور چوتھی مکھی کی روح سے مخاطب ہوا۔

یہ بہت اُداس اور غمگین تھی اور دستِ اجل کے آغوش میں چپ چاپ گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا کیوں تم افسردہ کیوں ہو؟ بولی اس لیے کہ قیدِ جسم کی تکان نے شل کر دیا۔

اب آزادی نصیب ہوئی مگر سارا وجود حرص و ہوس کی سابقہ زیادتیوں سے کچلا ہوا ہے۔ راحت ملی، مگر دیر میں۔ توانائی جلدی کہاں سے آئے۔ رفتہ رفتہ زخموں کا اندمال ہوگا۔

میں نے کہا۔ کیا مرنے کے بعد بھی تعلقاتِ جسم کا خمیازہ روح پر باقی رہتا ہے؟

روحِ مگس :- جزا و سزا اسی کا نام ہے۔ جو دنیا کے تعلقات سے جی نہیں لگاتا دنیا میں ایک مسافر کی طرح رہتا ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے، کماتا ہے۔ شادی بیاہ کرتا ہے۔ عزت آبرو کے درجوں تک پہنچتا ہے۔ مگر دل کو ان باتوں کا اسیر نہیں کرتا اور اس کو ہر وقت خدا سے لگائے رکھتا ہے تو مرنے کے بعد اس کی روح کو کچھ تکان نہیں ہوتی ورنہ میری طرح کہ دنیا میں بہت زیادہ زندہ رہی اور حرص و ہوس کی غلامی کو مآلِ زندگی سمجھا کھانے اور مٹھاس کی تلاش و طلب کو مقصدِ حیات سمجھتی رہی اور آج جسم سے نکل کر بے انتہا کوفت اور پشیمانی اپنے اوپر پاتی ہوں، اس کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔

میں نے کہا۔ تم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" میں دنیا کو دین پر مقدم بتاتے ہیں اور عیشِ دنیا کی طلب کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

روحِ مگس:- آہ یہ اُن کی بھول ہے۔ اہلِ یورپ کی خوش حالی اور فروغ دنیاوی نے ان کو دھوکہ دیا ہے۔ وہ چار دن کی چاندنی کو نورِ ابد تصور کرنے لگے۔ اُنہوں نے سائنس کی ترقی مشاہدات اور مادہ کی اوپری اعتماد پر قیاس کر لیا کہ بس یہی چیزیں قابل تقلید ہیں۔ حالانکہ ان ترقیوں کی اور ان کے عیش و آرام کی بہت تھوڑی عمر ہے۔ وہ ہوسِ نفس کے بادلوں کی ایک جھلک ہے جو صرف ایک محدود موسم میں چمک کر رہ جاتی ہے۔ وہ خواہشاتِ سفلی کی برسات کے ندی نالے ہیں جو چند ساعت چڑھاؤ دکھا کر اُتر جاتے ہیں۔ بقا اس کائنات میں کسی شکل کو نہیں ہے۔ ہر نیک و بد اسیرِ انقلاب ہوتا ہے مگر جس ہستی کی بنیاد امیدِ آخرت اور توکلِ خدا پر ہو، اُس کو یہ دنیا جلدی فنا ہونے سے بچاتی ہے۔ اور جو خود اس دنیا کے اسباب پر اپنی عمارت کی نیو رکھتا ہے، اس کی چند روزہ ٹیپ ٹاپ اگرچہ پُربہار ہوتی ہے، مگر قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک جنبشِ فطرت میں برباد ہو کر گر پڑتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی نیت بُری نہیں ہے انہوں نے اپنے استادوں کی تعلیم اور اس تعلیم کے وطن کی بود و باش سے یہ خیالات اخذ کئے ہیں اُن کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بھائی بھی کامرانی اور عیشِ جاودانی حاصل کریں لیکن شیطان نے جب کسی ذی عقل کو دھوکا دیا ہے تو اسی طرح زینت دیکر اور اس کی نیک نیتی میں شریک ہو کر دیا ہے۔

میں نے اس افسردہ مکھی کے اتنے لمبے چوڑے لکچر کو سنکر بہت تعجب کیا کہ جو مکھیاں مرنے کے بعد خوش تھیں۔ انہوں نے بات کرنے سے گریز کیا اور یہ غمگین مکھی ایسی طول کلامی کرتی ہے۔

اسپر میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا۔ مکھی بولی:-

جس طرح دنیا میں راحت و آرام انسان کو دوسروں سے بے پرواہ اور بے خبر بنا دیتا ہے

اسی طرح مکھیوں کی ارواح اپنے سرورِ باطنی کی مصروفیت میں تجھ سے ہمکلام ہونا نہ چاہتی تھیں اور آگے بڑھنے سے جہاں ان کا مطلوب تھا، گھبراتی تھیں، مگر میں کہ اب تک اسیرِ رنج و محن ہوں، دوسروں کی تکلیف کا حس رکھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اور ارواح میری طرح مبتلائے عذاب نہ ہوں۔ اسی واسطے میں نے ڈاکٹر اقبال کی مثنوی کی نسبت زیادہ گفتگو کی۔ کیونکہ مجھ کو نظر آتا ہے کہ جو اس کی پیروی کریگا وہ اپنی آخرت کے عیش کو تباہ کرے گا اور جو اس سے بچے گا وہ دائمی حیات کے سرور کا حقدار ہوگا۔

مکھی کی روح اتنا کہنے پائی تھی کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور مکھی مار کاغذ کو جس پر صدہا لاشیں مکھیوں کی پڑی تھیں، اڑا کر لیگیا۔ اس حادثہ کو دیکھ کر مجبوراً عالمِ خیال سے اُلٹا پھرنا پڑا اور ارواح کی بات چیت ادھوری رہ گئی۔

میں اُٹھا اور قتیلانِ تجربہ کو اٹھا کر لایا۔ سامنے رکھا اور کہا۔ اے بے حیا مگس کے بےجان جسموں! تم اس جال میں کیسے سنسان پڑے ہو۔ کچھ اپنی ارواح کا بھی حال معلوم ہے اگر تم سن سکتے ہو تو سنو کہ ان میں سے نیک اعمال بے فنا عیش میں مصروف ہیں اور دنیا کی طلبگار اعراف میں پھڑپھڑا رہی ہیں۔ میں تم کو اپنے گھر کے اندر یہ آواز اس لئے دیتا ہوں کہ یہ صدا غیب کی طاقتوں سے اُڑ کر ہندوستان بھر میں گونج جائے اور ہند کے ہر باشندے کو اس کا آخری وقت یاد دلائے اور خدا کرے کہ یہ آواز پہاڑوں اور دریاؤں اور سمندروں تک سے عبور کر کے اثر کرے۔ آمین۔

---

(یہ مضمون اس وقت شائع ہوا تھا جب کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مثنوی اسرارِ بےخودی لکھی تھی۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی کتاب کا نام مجھ سے مشورہ کر کے اسرارِ بےخودی رکھا تھا مگر جب میں نے اس کتاب میں حضرت حافظؒ اور تصوف کی تحقیر پڑھی تو میں نے اس کے باوجود کہ ڈاکٹر صاحب سے میرے بہت تعلقات تھے اس سے اختلاف کیا اور ڈاکٹر صاحب اور اُن کے مداحوں نے میرے اختلاف کی زور دار تردیدیں شائع کیں۔ آخر حضرت اکبر الہ آبادی کے مشورہ سے جو اس مسئلہ میں میرے ہمخیال تھے۔ میں نے مخالفت ترک کر دی اور ڈاکٹر صاحب نے بھی بعد کی تصنیفات میں اس روشِ تحریر کو بدل دیا۔ حسن نظامی)

# چوتھی منزل

## دین وملّت

## عورتیں کیا کر سکتی ہیں

(از وکیل امرتسر مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء)

اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہوگیا ہے کہ مسلمان اپنی پچھلی حالت پر نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ ان کی عورتوں کو تعلیم یافتہ نہ بنایا جائے۔ اسی لئے نئی روشنی کے جوان ہمہ تن کوشش میں ہیں کہ ہماری عورتیں بھی یورپ کی طرح خوب جی لگا کر لکھنا پڑھنا سیکھیں اور عیسائی لیڈیوں کی طرح کھلم کھلا بازاروں میں گشت لگائیں لیکن ہمارے نوجوان یورپ کی ترقی دیکھ کر ان کی تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو اپنی قدیمی ترقی کے اسباب معلوم ہوجاتے تو وہ ہرگز اس بیہودہ خیال پر توجہ نہ کرتے۔

لہٰذا لازم ہے کہ وہ اپنے ان بزرگوں کے حالات دیکھیں جن کے طفیل آج ہندوستان میں ہماری صورتیں نظر آتی ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے اسم گرامی سے ایسا کونسا ہندوستانی ہے جو نا واقف ہے۔ ان کے والد سید غیاث الدین حسن سنجری نے رحلت فرمائی۔ تو ان کا سنِ شریف پندرہ برس کا تھا اور یہ وہ عمر ہوتی ہے کہ اس میں

آج کل کے صاحب پدر لڑکے بھی آوارہ ہوجاتے ہیں. مگر ان کی والدہ حضرت بی بی خاصۃ الملکہ نے ان کی ایسی قابلیت سے تعلیم وتربیت فرمائی کہ ان کا زمانہ میں غلغلہ مچ گیا. ہندوستان جیسے اجنبی ملک میں مسلمانوں کا جھنڈا اسی دُرِّ یتیم کے صدقہ سے نظر آتا ہے. خیال کیا جائے اگر حضرت خواجہ رح کی والدہ تعلیمیافتہ نہ ہوتیں تو کیا اس نونہال کی یہ مشہور سرسبزی ممکن تھی؟ حضرت ہی کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح دہلوی ماں کی گود میں تھے. کوئی ڈیڑھ برس کی عمر تھی کہ ان کے پدر بزرگوار خواجہ کمال الدین حسن کا وصال ہوگیا. ان کی والدہ حضرت بی بی صالحہ نے پرورش کی. اور جب سن شریف چار سال چار ماہ، چار یوم کا ہوا تو مکتب میں تحصیل علم کے لئے بٹھا دیا. حضرت نے قرآن شریف کے پندرہ پارے اس سہولت سے پڑھ لئے کہ اُستاد حیران رہ گئے. دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اپنی والدہ سے، جو حافظ تھیں، اکثر یہ پارے پڑھتے سُنا کرتے تھے. چونکہ ذہن بہت اچھا تھا ان الفاظ نے پہلے ہی جگہ پکڑ لی تھی، اب تعلیم کے وقت کچھ دشواری نہ ہوئی.

بی بی صالحہ نے اس قطب زمانہ کی جس علم سے تربیت کی تھی اب وہی ہماری عورتوں کو بھی سکھایا جائے تاکہ ان کے بچے بھی اسی طرح لائق وفایق بنیں.

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رح بھی اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید احمد صاحب کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے. حضرت کی مادر محترمہ حضرت بی بی زلیخا رح نے تعلیم کے فرض کو اس خوبصورتی سے ادا کیا کہ آج تک ان کا قرۃ العین خدا کے محبوب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے. سولہ برس کے سن تک محبوب الٰہی رح تمام علوم سے فارغ ہوگئے. یہ بی بی صاحبہ کی تعلیم کا اثر تھا کہ حضرت کو بچپن میں صبر وقناعت سے محبت ہوگئی تھی. چنانچہ خود فرماتے تھے کہ جس دن ہمارے گھر میں فاقہ ہوتا تھا. والدہ صاحبہ فرماتی تھیں "بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں." یعنی آج گھر میں کھانے کو نہیں ہے. حضرت

فرماتے تھے کہ مجھکو والدہ صاحبہ کا یہ فقرہ بہت ہی مزہ دیتا تھا، اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ متواتر کئی روز تک کھانے کو ملے جاتا تو میں دل ہی دل میں کہتا کہ "الٰہی وہ دن کب آئیگا کہ والدہ یہ فرمائیں کہ بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔

بھلا یورپ میں کسی غریب اور مفلس بچے کی ایک بھی ایسی ماں ہے۔ جس کا بچہ ناداری سے مکدر ہوتا ہو، بلکہ اُلٹا خوش اور مگن رہتا ہو۔ نہیں بلکہ وہاں تو طمع و حرص و اسراف کا سب سے پہلے سبق دیا جاتا ہے۔ تو کیا ان ہی عادات کے اختیار کرنے کے لئے مسلمان ان عورتوں کی تقلید کرنی چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کو ان مذکورہ خواتین کی حالت پر غور کرنا چاہیئے کہ اُنھوں نے علم کی بدولت اس قسم کی قابلیت اور شائستگی حاصل کی، نہ پردہ دری سے اور نہ کسی غیر زبان کے یاد کرنے سے، نہ کسی ترقی یافتہ قوم کی طرزِ معاشرت سیکھنے سے، بلکہ محض اپنے کامل مکمل دین کی تعلیم کی بدولت۔ جس کو وہ پوری حد تک حاصل کرتی تھیں۔

اب بھی اگر مسلمان لڑکیوں کو زمانہ کی حالت کا لحاظ رکھ کر تعلیم مذہبی دی جائے تو اُن کی آیندہ نسلیں پہلی سی ترقی کر سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام سب کے نزدیک ظاہر و باطن کے درست کرنے کے لئے ایک مکمل مذہب ہے۔

# ایک ہی ہے اور کچھ نہیں

از خاتون۔ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء

اچھی بابا یہ سختی کے دن کب جائیں گے۔ بے فکری کی نیند بھی کبھی میسر آئیگی یا یونہی ڈر اور خوف سے راتیں آنکھوں میں کٹیں گی۔ چچا عالمگیر ہم کو کیوں ستاتے ہیں

خدا بھی ہماری مدد نہیں کرتا۔ اُس نے بھی حق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دنیا گواہی دیتی ہے کہ تخت دارا کا، تاج دارا کا اور دین کے قاعدے کے موافق بھی آپ ہی تاج و تخت کے اصلی وارث ہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زمین و آسمان دشمن ہیں۔ گھر سے بے گھر جنگلوں میں بسیرا لیتے پھرتے ہیں جب بھی لوگوں کو چین نہیں آتا اور ہم کو دنیا سے فنا کرنے کی ترکیبیں سوچی جا رہی ہیں۔ باپ نے جواب دیا۔

دارا کی جان دل آرا! جو باتیں کل شام کو ہم نے بیان کی تھیں شاید تم نے اُن کو ذہن سے اُتار دیا۔ بیٹی اسی زیردستی اور زبردستی کا نام دنیا ہے۔ یہی ناکامی اور کامیابی ہے جس کے چکر میں تمام عالم گرفتار ہے۔ یہ نہ ہو تو ساری دنیا بے مزہ ہو جائے۔ اسی اُلٹ پھیر سے یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ بھائی اورنگزیب کا کوئی قصور نہیں ہے نہ خدا اور زمانے کی کوئی شکایت ہے۔ قدرت کا دستور یہی ہے کہ ایک بادشاہی کا تاج پہنتا ہے، دوسرا سولی دیا جاتا ہے۔ ایک پاؤں پھیلا کر بیفکری سے سوتا ہے دوسرا پلک جھپکائے کو ترستا رہ جاتا ہے۔ لیکن پیاری اس کی خوشی اور اس کا غم دونوں فانی ہیں۔ قرار ایک کو نہیں بلکہ ذرا اور غور کرو تو معلوم ہو گا کہ خوشی اور رنج فقط وہم و خیال ہے۔ خیال قابو میں ہو تو کیسی ہی سخت مصیبت پیش آئے، انسان اس کو ہیچ سمجھتا ہے اور اُس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ جو باتیں آج کل ہم کو پیش آ رہی ہیں، وہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے جو خدا تعالےٰ کی طرف سے انسان کو دی جاتی ہے جس طرح ایک آدمی بادشاہ بنایا جاتا ہے اور اُس کے ذمے حکومت کے فرائض لگائے جاتے ہیں، اسی طرح ایک غریب کو بھی غربت کی خدمت سپرد کی جاتی ہے۔ بادشاہ کو دولت کی شان سے اپنے کام عمدگی سے پورے کرنے چاہئیں۔ اور غریب کو غریبی کی حیثیت سے اس خدائی نوکری کو بجا لانا چاہیئے۔

بھائی اورنگزیب سے میں اتنا ہی مقابلہ نہ کرتا جتنا کیا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ آیا واقعی قدرت نے اس کی بادشاہت قبول کرلی ہے یا نہیں؟ اب معلوم ہوتا ہے کہ بے شک خدا تعالے اس کی حکومت اور میری غربت چاہتا ہے۔ یہ ہے تو میں ہر طرح راضی ہوں۔ اورنگزیب جس طرح چاہے ستائے ہماری سرکوبی اور بیخ کنی کی جیسی چاہے تدبیریں کرے اس کے لیے یہی شایاں ہے کیونکہ اس کو شاہی طرز کی نوکری پوری کرنی ہے۔ ہم کو سب سختیاں برداشت کرنی چاہیئں کیونکہ ہمارے ذمہ غربت بیکسی لاچاری اور ہر طرح کی مصیبت لگائی گئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم سہیں

## دارا شکوہ کی یہ تقریر سن کر اس کی بیٹی دل آرا بولی۔

یا اللہ! دل میں اور خلجان پیدا ہوا۔ آپ روز سمجھاتے ہیں مگر مجھ بیوقوف کی عقل میں نہیں آتا۔ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی جو چیز آنکھوں کو نظر آتی ہے، اور جن چیزوں کی صورت خیال کرنے سے ذہن میں جمتی ہے۔ سب کی حقیقت ایک ہے شکلیں الگ الگ ہیں۔ جیسے مٹی کے برتن۔ ایک مٹکا ہے تو ایک آبخورہ ایک ایک کونڈا ہے اور ایک چلپچی۔ نام الگ الگ۔ کام الگ الگ شکل وصورت الگ الگ۔ مگر مٹی سب کی ایک۔ یا مثلاً ایک ڈورا ہے جس میں کئی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ گرہ ایک ابھری ہوئی صورت کا نام ہے مگر اصل اس کا ڈورا ہے جو لپٹ کر گرہ بن گیا ہے۔ پہلی چیز جو مسلمان بچہ کو سکھائی جاتی ہے وہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے جس کے معنی عام طور پر یہ بتائے جاتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں ہے اور محمد اس کے رسول ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ کلمہ ہی تمام دین و دنیا کی بنیاد بتا دیتا ہے۔ اگر اس کے معنی یوں سمجھائے جائیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں ہے یا لفظی معنی کہ نہیں ہے کچھ مگر خدا اور محمد اس کے رسول ہیں۔ ابا جان یہ تعلیم میں نے اپنے استاد مولوی صاحب سے بیان کی تھی۔ وہ یہ سنکر بہت ناراض

ہوئے اور فرمایا کہ یہ شرک کی باتیں ہیں۔ ان میں پڑ کر آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ دارا شکوہ نے ہندوؤں کی صحبت اور اُن کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ باتیں سیکھی ہیں۔ دین اسلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں ہے اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ خدا ایک ہے اور سب مخلوقات اُس نے بنائی ہے مگر ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا ہے۔ درخت بھی خدا، اور جانور و آسمان و زمین بھی خدا۔ توبہ توبہ بالکل کفر کے کلمے ہیں۔ سو حضرت اول تو میں پرسوں کی باتوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ آج آپ نے یہ اور نئی باتیں سنائیں کہ مصیبت بھی ایک نوکری ہے جس کو خوشی خوشی بجا لانا چاہیئے۔ پرسوں کی باتوں کی نسبت مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے یہ ہندوؤں کی ویدانت کا مسئلہ ہے جس کو مسلمانوں میں صوفیوں کا گروہ بھی ان کے دیکھا دیکھی ماننے لگا اور آج کی تقریر سُن کر تو میں پیشگی حکم لگاتی ہوں کہ مولوی صاحب اس کو بالکل مسلمانی کے خلاف بیان کریں گے اور سچی بات یہ ہے کہ میرے جی کو بھی مولوی صاحب کی باتیں لگتی معلوم ہوتی ہیں۔ بھلا جس کا ذکر قرآن شریف میں نہ ہو۔ وہ ہم کس طرح مان لیں۔ اور بات بھی ایسی کہ سب چیز خدا ہے

دل آرا کی مشکیہ باتیں سُن کر اشکرہ کو جوش آگیا مگر وہ جوش خفگی و ناراضگی کا نہ تھا بلکہ جس طرح کوئی آدمی جانی پہچانی چیز کا انکار کسی نادان کی زبانی سن کر افسوس کے جوش میں آجاتا ہے۔ ایسے ہی دارا کے چہرے پر جوش کے آثار نمایاں ہو گئے اور نہایت بے پروائی سے بولا۔ دیوانی اس چیز کے وجود پر شبہہ کرتی ہے جو سورج کی طرح ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کی نافہمی ہے جو قرآن شریف کو اس تعلیم سے خالی بتاتے ہیں۔ اری نادان قرآن کے دل میں اِنہی باتوں کا خزانہ ہے۔ ظاہری الفاظ پر عمل کرنا بے کار ہے۔ اصلی معانی پر غور کرنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے، وہ سب پر محیط ہے۔ وہ اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے

باطن ہے، نیچے ہے، اوپر ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ مگر جس طرح قرآن شریف
میں ارشاد ہے کہ ہدایت انہی کو ہے جو غور کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ غور نہیں کرتے
بیشک ویدانت کے بھی یہی اصول ہیں۔ لیکن اسلام کی تعلیم اگر اس کے موافق
ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کب کہا تھا کہ ہر چیز کو خدا کہنا چاہیئے۔ وہ تو میری مثال
سے خیال میں آسکتا ہے کہ جب تک آبخورہ اپنی صورت پر اور مٹکا اپنی شکل پر قائم ہے
اس کو مٹی نہیں کہہ سکتے۔ یا جب تک ڈورے میں گرہ ہے گرہ نام رہیگا، ڈورا نہیں کہا
جائے گا لیکن سمجھنا یونہی چاہیئے کہ حقیقت سب کی ایک ہے۔

رہی دوسری بات کہ رنج و راحت آدمی کے فرائض ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے
جب ہم نے مان لیا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں، یعنی جو کچھ ہے سب خدا کا ظہور ہے، تو کہیں
اس کی شان کرم ظاہر ہے اور کہیں شان غضب۔ ایک کانٹے دار درخت جس میں پھول
پھل نہیں آتے، شکایت کرے کہ دوسرے درخت میں پھول بھی خوبصورت ہیں اور
پھل بھی مزے دار ہیں۔ مجھے اس سے محروم کیوں کیا گیا تو ہم یہی جواب
دیں گے کہ تجھ کو وہ میسر ہے جو پھول دار بیل دار درخت کو نصیب نہیں ہے جو شان تجھ
میں ہے وہ اس میں نہیں، جو اُس میں ہے وہ تجھ میں نہیں۔ پھر شکوہ کرنا لا حاصل
ہے۔ دل آرا! یہ ایسی اچھی تعلیم ہے کہ اگر انسان اس کو خوب سمجھ کر ذہن نشین
کرلے تو دنیا کے عیش و راحت اور رنج و غم کے جھگڑوں سے آزاد ہو جائے۔ دنیا
کا ترک اسی کا نام ہے کہ اُس کے اتار چڑھاؤ کی تکلیف جاتی رہے۔ یہ نہیں کہ انسان
مال و دولت۔ جورو بچے چھوڑ بیٹھے۔ سو پیاری جب میں اپنے بھائی کے برتاؤ کا شاکی
نہیں تو پھر تو کیوں شکایت کرتی ہے۔ پس ہر وقت اس خیال میں غرق رہ کہ

**ایک ہے اور کچھ نہیں۔**

# دُعا

از نظام المشائخ۔ جولائی ۱۹۰۹ء

دعا مذہبی زندگی کی جان ہے۔ اہلِ مذہب کے نزدیک مذہب کی عملی صورت کا ظہور بہت کچھ دعا پر منحصر ہے۔ دعا سے مطلوب کا حاصل ہونا اور پیغمبرانِ الٰہی کا خاص خاص مطالب کے لئے دعا مانگنا اور اس کا قبول ہونا آسمانی کتابوں سے ثابت ہے۔

اسلام میں دعا کا مرتبہ ضروری اور اہم عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ مسئلہ ذات وصفات اور فطرۃ اور قوانین فطرت کی طرح یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق ہے اور اس کی نسبت صدہا مختلف رائیں اور جداگانہ اقوال بزرگان اسلام کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

قرآن شریف میں ارشاد ہے ۔ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ یعنی اور جب تم سے میرا بندہ مجھ کو طلب کرے (تو کہہ دو کہ) میں اس کے قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کا سوال جبکہ وہ مجھ سے مانگے۔

دوسری جگہ فرمایا ۔ اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ "مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔"

دعا چونکہ تمام رسولوں کا ورثہ ہے جو امتِ مرحومہ کو عطا ہوا ہے اور جس میں خدائے تعالےٰ نے اعجاز رسالت کی شان باقی رکھی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو دعا کے معاملہ میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک فرقہ دعا کی تاثیر کا بالکل منکر ہے۔ دوسرا اس کے اثر کو خیالی بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن شریف کی اس آیت اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم جو کچھ دعائیں مانگو قبول کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں دو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اول یہ کہ ہزاروں دعائیں نہایت عاجزی اور خلوص سے کی جاتی ہیں مگر سوال پورا نہیں ہوتا جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ خدا نے استجابت کا وعدہ فرمایا ہے۔ دوسری یہ کہ جو امور ہونے والے ہیں وہ مقدر

ہیں اور جو نہیں ہونے والے وہ بھی مقدر ہیں۔ ان مقدرات کے برخلاف ہرگز نہیں ہو سکتا
پس استجابت دعا کے معنی سوال کا پورا کرنا قرار دیئے جائیں تو خدا کا یہ دعویٰ کہ اُدْعُوْنِیْ
اَسْتَجِبْ لَکُمْ ان سوالوں پر جن کا پورا ہونا مقدر نہیں ہے، صادق نہیں آسکتا۔ یعنی ان معنوں
کی رو سے یہ عام وعدہ استجابت دعا کا باطل ٹھہرے گا کیونکہ سوالوں کا وہی حصہ
پورا کیا جاتا ہے جس کا پورا کرنا مقدر ہے لیکن استجابت دعا کا وعدہ عام ہے جس میں
کوئی بھی استثنا نہیں ہے پھر جس حالت میں بعض آیتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ جن چیزوں
کا دیا جانا مقدر نہیں، وہ ہرگز نہیں دی جائیں۔ لہذا استجابت دعا کے یہ معنی سمجھنے
چاہئیں کہ دعا ایک عبادت ہے اور جب وہ قلبی خشوع وخضوع سے کی جائے تو اس کے
قبول کرنے کا خدا تعالے نے وعدہ فرمایا ہے۔ گویا دعا عبادت متصور ہو کر عندا للہ
ثواب کا مستحق بناتی ہے اور کسی خاص مسئول عنہ کے حصول سے اسے اسی حد تک
تعلق ہے کہ مسئول داعی کے نصیب میں مقدر بھی ہو۔ اس قاعدے سے دعا کا اثر
بے کار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو چیز دعا میں مانگی گئی تھی وہ مل تو گئی مگر اس کو تاثیر دعا
سے کچھ لگاؤ نہیں۔ تقدیر کی خوبی سے یہ نتیجہ ظاہر ہوا۔ دعا کا صرف یہ فائدہ ہے کہ
دعا کرنے کے وقت خدا کی عظمت اور بے انتہا قدرت کا خیال دل میں جم جاتا ہے تو
خیالات کی لہریں بھی جمع ہو کر ایک مرکز پر ٹھہر جاتی ہیں اور انسان کی پریشانی و گھبراہٹ،
جو کسی خاص فکر سے پیدا ہوئی ہو، مغلوب ہو کر صبر و استقلال سے بدل جاتی ہے
اور استقلال کی کیفیت کا دل میں ہونا عبادت کے لئے لازمی امر ہے۔ پس یہی دعا کا
مستجاب ہونا ہے۔

دوسرا فریق دعا کی قبولیت پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک دعا کا نتیجہ
ضرور حاصل ہوتا ہے اور وہ مذکورہ اعتراض کے جواب میں کہتا ہے کہ دنیا میں
کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں۔ تاہم قدرت نے اس کے حصول کے لئے

ایسے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جن کے صحیح اور موثر ہونے میں کسی عقلمند کو کلام نہیں ہے
پہلے فرقہ نے دعا اور ترک دعا میں جس تقدیر کا ذکر کیا وہ تقدیر دوا میں بھی تو موجود ہے
مگر سب دیکھتے ہیں کہ دوا کے اثر کو ایسا یقینی مانا جاتا ہے کہ تقدیر کا خیال بھی نہیں آتا
اور دوا سے دوری مرض کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ جسمانی معاملات میں تو تقدیر کا لحاظ نہ کیا
جائے اور روحانی مسئلہ میں تقدیر کو شامل کر کے تاثیرِ دعا کا انکار کر دیا جائے، یہ کسی طرح
قرینِ انصاف نہیں ہو سکتا۔

ادعونی استجب لکم میں بیشک دعا سے عبادت مراد ہے چنانچہ نعمان بن
بشیر سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:- ان الدعاء هو العبادۃ
ثم قرأ ادعونی استجب لکم۔ یعنی فرمایا۔ دعا عبادت ہے۔ اس کے بعد آیت
ادعونی استجب لکم تلاوت فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں دعا سے مراد
عبادت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دعا کی تعلیم امر کے صیغہ سے کی گئی ہے۔ گویا دعا
کو فرض کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ دعا انسان پر فرض نہیں ہے۔ پس معلوم یہ ہوا کہ اس
آیت میں دعا سے عبادت ہی مقصود ہے۔ لہٰذا جو فریق استجابت دعا کے یقینی ہونے
کو اس آیت سے نکال کر مسئلہ تقدیر کے ذریعہ سے اشکال پیدا کرتا ہے، اس کو
معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ آیت عبادت کے متعلق ہے۔ ہاں اس کے علاوہ اور کئی
آیتیں ہیں جن سے قبولیتِ دعا ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایک آیت میں تو گویا صاف
صاف انہی شکوک کا جواب دیا گیا ہے جو سورۂ انعام میں ہے بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ ۔ تم خاص اُسی سے دعا مانگتے ہو تو وہ دے
دیتا ہے تمہارے مطلوب کو اگر چاہے۔ یہاں تقدیر کا صاف طور سے ذکر کر دیا گیا
ہے۔ مگر دنیا میں کوئی چیز تقدیر سے خالی نہیں ہے۔ آگ جلا دیتی ہے۔ پانی ڈبو دیتا
ہے۔ ان تاثیرات سے کسی کو انکار نہیں مگر اثر تقدیر کے وقت ظاہر ہوتا ہے۔

ایسے ہی دعا بھی آگ کی طرح یقینی اثر دار چیز ہے۔ دواؤں کی مثل خدا نے اس میں بھی تاثیر پیدا کی ہے مگر جس طرح تقدیری گردش کے سبب باوجود دوا استعمال کرنے کے مریض کو فائدہ نہیں ہوتا۔ دعا کا نتیجہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔

آج کل نئی روشنی کے مسلمانوں میں یورپ کی تقلید کے سبب دعا سے بے توجہی ہوتی جاتی ہے اور وہ اس کو ایک فعلِ عبث خیال کرنے لگے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کے دل کو مصیبت کے وقت تسلی و تسکین کسی صورت سے میسر نہیں آتی۔ کیونکہ دعا کا مانگنا صرف اس یقین پر مبنی ہے کہ خدا تعالےٰ قادر مطلق اور فاعل مختار ہے۔ بیقرار دل کی نکلی ہوئی دعا کا سننے والا اور اس کی حاجت پوری کرنے والا ہے۔ اگر ایک لحظہ کے لئے اس یقین میں تذبذب ہو تو کون سا دل ہوگا جو بیقراری کی حالت میں اس کی طرف رجوع کرے، اور وہ کونسا خیال ہوگا جو اس کے اضطرار کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔ اس لئے کہ صرف یہ خیال کہ خدا دعائیں سننے اور حاجت پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اضطرار کی حالت میں بندے کا خیال خدا کی طرف رجوع کراتا ہے اور محض اس اعتقاد سے کہ باوجود قدرت کے خدا کا دعا قبول نہ کرنا کسی مصلحت پر مبنی ہوگا اور وہ مسؤل عنہ سے بہتر کوئی چیز دے گا۔ دعا کرنے والے کے دل کو تسلی ہوتی ہے اگر دعا کا عمل موقوف ہو گیا اور خدا سے دعاؤں کے سننے اور حاجتوں کے پورا کرنے کا خدائی حق لے لیا گیا تو مذہبی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دعا ذریعۂ حصول مقصد نہیں ہے اور یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے بندوں کی مصیبتوں کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور نہ کسی کی گریہ وزاری اور اضطرار و بیقراری کا اثر ہوتا ہے تو دعا بیکار اور توکل فضول ہے۔ پھر یقین اور اعتقاد کو بھی اپنے قدم جمانے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی اور بندہ کو بجز اس کے کہ وہ غیر تغیر پذیر قوانین فطرت کو اپنا خدا مانے، دوسرا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں انسان کو بے جان قانون سے

واسطہ رہتا ہے نہ ایک زندہ خدا سے، اور یہ خیال اس محبت کے رشتے کو جو خدا اور اس کے بندوں کے بیچ میں ہے توڑ دیتا ہے۔ اگر اس میں مدد کرنے کی طاقت نہیں ہے تو ہم کس لئے اس پر بھروسہ کریں، اور اگر وہ ہماری دعائیں نہیں سنتا تو ہم کیونکر اسے رحیم مانیں، اور اگر اس میں رحم نہیں ہے تو ہم کیوں اس سے محبت کریں۔ پس اس عقیدہ سے ہمارا یقین جاتا رہتا ہے۔ ہم کو خدا سے محبت باقی نہیں رہتی اور ہم ایسے مذہب کے ماننے والے رہ جاتے ہیں جس میں نہ یقین ہے نہ محبت ہے۔ لہذا اگر دعا کی اجابت ناممکن ہے تو مذہب بھی ناممکن ہے۔

صوفیائے کرام کے تمام سلسلے اجابت دعا کے قائل ہیں اور صرف قائل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو خدا کی طرف سے تاثیرات دعا کا وہ مرتبہ عطا ہوا ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کو حاصل تھا۔ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ نبوت کے آثار میں اس امت کو مقبول دعا دی گئی ہے یعنی جس طرح اگلے زمانہ کے پیغمبر دعا کے ذریعہ اپنے اعجاز دکھاتے تھے ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولیاء اسی دعا سے کرامتیں دکھانے پر قادر بنائے گئے ہیں۔ آئندہ پرچہ میں خدا نے چاہا تو ہم ثابت کریں گے کہ صوفیوں کے مختلف خاندانوں کے مشائخ کی دعا کیا کیا تاثیریں ظاہر ہوئی ہیں۔ چشتیوں، قادریوں، نقشبندیوں، سہروردیوں وغیرہ کل سلسلوں کے بزرگوں نے اپنی ذات اور قوم کے لئے دعائیں کی ہیں اور اگر ہر دعا کے الفاظ علیحدہ علیحدہ نظر تعمق سے دیکھے جائیں تو صاحب دعا بزرگ کی باطنی کیفیت و اندرونی احساس اور جذبہ کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر کبھی اس کو وضاحت سے لکھا جائے گا۔

اب یہ بات ثابت کرنے کے بعد کہ دعا میں تاثیر ہے اور دعا ہمارے صوفیائے کرام کے کل فرقوں کی مسلمہ چیز ہے، اس رسالہ کا شروع جو صوفیوں کی دینی و دنیوی اغراض کی خدمت

گزاری کے لئے جاری کیا جاتا ہے اور جس کا آج پہلا پارہ نمودار ہوتا ہے" فضل الٰہی سے یقین ہے کہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے صوفیائے کرام کی دعاؤں میں تاثیر عطا فرما کے ان کو ہمیشہ مقبول فرمایا اسی طرح ان کا یہ ماہوار رسالہ بھی اپنی دعا کے ذریعہ سے بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگا اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہنچائے گا۔

# گلیم درویشی کی تنگی
# اور
# ایک المناک فسانہ

از نظام المشائخ ۱۹۰۹ء

اگلے وقتوں میں کہا کرتے تھے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے مگر دس درویش ایک کمبل میں بسر کر سکتے ہیں۔ آجکل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ بادشاہت کا تو یہ عالم ہو گیا کہ ہر فرد واحد اپنے تئیں ملک کا حاکم سمجھتا ہے جس سے ایک اقلیم میں کروڑوں بادشاہ نظر آتے ہیں اور درویشوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ ایک گلیم میں دس تو کجا دو درویش بھی نہیں سما سکتے۔ قادری ہوں یا نقشبندی، چشتی ہوں یا سہروردی سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اصول کے لحاظ سے ان میں کوئی بیّن فرق یا تفاوت نہیں ہے۔ فروعات ہر مشرب کی علیحدہ ہیں مگر افسوس ہے کہ فروعات کے جھگڑوں سے ان سلسلوں میں ایسی اجنبیت اور غیریت قائم ہوگئی ہے کہ باہم ایکدوسرے سے جدا نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تفریق حد سے زیادہ محبت کرنے سے پیدا ہوئی یعنی اپنے سلسلہ کے مشائخ سے جب مریدین کو تعلق بڑھا تو انہوں نے اس کو اتنا بڑھایا کہ اور تمام مشائخ کو پست کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر دیگر مشائخ کے متوسلین نے بھی اپنے بزرگوں کو ناجائز طور سے

دوسروں پر ترجیح اور فوقیت دینی شروع کی اور اس طرح درویشی خاندانوں میں نفسانی کش مکش شروع ہوگئی سب سے پہلے قادری سلسلہ سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ یہ لوگ حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی رح کو تمام مشایخ عالم پر ترجیح دیتے ہیں اور حضرت غوث الثقلین کا یہ قول کہ قدمی علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ (یعنی یہ میرا قدم سب ولیوں کی گردن پر ہے) اس شد ومد سے بیان کرتے ہیں جس سے دوسرے خاندان والے بتقاضائے بشریت مشتعل ہوں۔ اس کے بعد چشتیہ طریق کی آزادی اور نقشبندیہ طریق کی محدود خیالی کی نسبت لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی۔ خود چشتیہ خاندانوں میں کئی شاخیں ہوگئیں۔ نظامی، صابری، جمالی اور ان شاخوں میں بھی وہی فضیلت کے جھگڑے برپا ہوگئے۔ نظامی کہتے ہیں کہ حضرت بابا گنج شکر رح کے اصلی جانشین اور خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رح ہوئے۔ صابری کہتے ہیں کہ تمام باطنی امور کا حصہ حضرت مخدوم صابر رح کو ملا۔ جمالی کہتے ہیں کہ جو نظر خاص حضرت بابا صاحب کی حضرت قطب جمال الدین ہانسوی رح پر تھی وہ کسی اور کو میسر نہ ہوئی۔ نقشبندیوں میں مجددیہ شاخ کے دعوے تمام خاندان سے نرالے ہوگئے حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رح کے ایسے عجیب وغریب دعوے اور ان کے ایسے فضائل بیان کیے جاتے ہیں جو تمام متقدمین مشایخ نقشبندیہ سے مجدد صاحب رح کو بڑھا دیتے ہیں۔

الغرض نہایت سخت کش مکش سلسلوں میں معمولی باتوں کے سبب پڑی ہوئی ہے جس قدر ذکر کیا گیا سب جانتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہر شخص اپنے بزرگ اور اپنے شیخ کو سب سے بڑھ کر سمجھتا ہے یہ کوئی شکایت کی بات نہیں ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس ولولے میں دوسرے بزرگوں کی تحقیر اور تنقیص کی جاتی ہے ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جہاں دو شخص جمع ہوتے ہیں اور ان میں ایک چشتی ہوتا ہے، ایک قادری۔ تو وہ بجائے اس کے کہ کسی مسئلہ تصوف پر بات چیت کریں، فضیلت حضرت

غوث الاعظمؒ اور حضرت خواجۂ خواجگان اجمیریؒ پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ حضرت غوث الاعظم سے حضرت خواجۂ بزرگ رحنے فیض پایا۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں۔ بلکہ حضرت غوث الاعظم رح حضرت خواجۂ بزرگ سے فیضیاب ہوئے۔ ان فضول باتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں بزرگوں کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرنے لگتے ہیں اور اس نعمت سے محروم ہوجاتے ہیں جو ادب اور تعظیم سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

ہم کو بڑا افسوس ہوتا ہے جب سماع کی محفلوں میں حضرت صابرؒ صاحب کا نام قوال کی زبان سے سُن کر نظامی درویشوں کو یہ نام لینے سے منع کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ایسے ہی صابری محفل میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا نام لینے سے قوال کو روکا جاتا ہے تو بیحد قلق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی دانست میں حضرت محبوب الٰہی رح اور حضرت مخدوم صابرؒ کی محبت اس میں سمجھتے ہیں کہ دوسرے بزرگ کا نام نہ لیا جائے۔ حالانکہ یہ اُن کی کورباطنی اور جہالت ہے۔ یہ سب بزرگ ایک شان رکھتے ہیں۔ ان میں تفریق کرنا ملتِ عشق میں کفر کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے لانفرق بین احدٍ من رسلہٖ (یعنی ہم کسی رسول (کے مرتبہ) میں فرق نہیں کرتے) اولیاء اللہ مثل انبیاء ہوتے ہیں پھر بھلا ان میں تفریق کیونکر ہوسکتی ہے۔

الغرض تکمیم درویشی کی وسعت کو تنگ خیال لوگوں نے اس قدر چھوٹا کردیا ہے کہ اس میں ایک درویش بھی نہیں سما سکتا۔ اور جتنی باتیں لکھی گئی ہیں یہ سب تو ایک حد تک محبت یا غلط روایتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ افسوس آجکل کے زمانے پر ہے کہ محض دنیاوی اور نفسانی کدورتوں سے مشائخ میں تفریق اور جدائی پھیلتی جاتی ہے نقشبندی، قادری، چشتی، سہروردی تو خیر الگ الگ خاندان ہیں، غضب تو یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کی مختلف شاخوں میں اس قدر تضاد پایا جاتا ہے کہ کوئی

نہیں کہہ سکتا کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہے۔

مثلاً نقشبندیہ طریق میں مجدّدی حضرات غیر مجدّدی لوگوں سے بالکل نا آشنا اور بے غرض ہیں اور ان کو سوائے مجدّد صاحب کے اپنے سلسلہ میں اور کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ امیر حبیب اللہ خان والی کابل جب ہندوستان میں آئے تو تمام مشہور مزارات پر حاضری دی مگر حضرت خواجہ باقی باللہ رح کے مزار کی زیارت کو نہ گئے۔ کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ مجدد صاحبؒ کے پیر و مرشد کے مزار کی زیارت بیکار سمجھی گئی مگر اس میں شاہ کابل کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر ان کو بتایا جاتا کہ مجدد صاحبؒ کے شیخ کا مزار دہلی میں ہے تو وہ ضرور حاضر ہوتے۔ مگر جو حضرات اُن کے گرد و پیش تھے وہ سب مجدد صاحبؒ کے مقابلہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ رح کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے یا سمجھتے تھے تو بہت معمولی۔ ورنہ وہ ضرور شاہ کو وہاں کی حاضری کے لئے آمادہ کرتے۔

اسی طرح چشتیوں کا عالم ہے۔ ان کی ایک مشہور شاخ نظامیہ پر غور کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے حضرت مولانا فخر الدین رح سے پنجاب اور پورب میں کئی مسندیں نظامیوں کی قائم ہوئیں۔ بریلی میں نیازیہ، تونسہ شریف میں سلیمانیہ فخریہ خاندان کی مشہور شاخیں ہیں۔ مگر ہم نے کبھی نہیں سُنا کہ سلیمانیہ اور نظامیہ مشایخ میں کبھی اس قسم کا ارتباط پیدا ہوا ہو جو ہم طریقہ اور ہم سلسلہ مشائخ میں ہوا کرتا ہے اور ہونا چاہیئے پنجاب میں فخریہ سلسلہ سے جس طرح تونسہ شریف میں سلیمانیہ مسند قائم ہوئی اسی طرح چاچڑاں شریف میں حضرت قاضی محمد عاقل صاحب کی خانقاہ بڑی مشہور اور با اثر مانی جاتی ہے۔ اس خانقاہ کے مشہور سجادہ نشین حضرت خواجہ غلام فرید صاحب تھے جن کا ابھی حال میں وصال ہوا ہے، اور تونسوی خانقاہ میں خواجہ غلام فرید صاحب کے ہمعصر حضرت خواجہ اللہ بخش صاحبؒ تھے۔ جن کی رحلت کا زمانہ بھی خواجہ غلام فرید صاحب کے

قریب واقع ہوا ان دونوں حضرات کی نسبت مشہور تھا کہ تعلقات کشیدہ رکھتے ہیں مگر مہار شریف کے عرس میں ایک دفعہ یہ دونوں بزرگ جمع ہوگئے اور باہمی ملاقاتیں ہوئیں جس خلوص اور تپاک سے ان بزرگوں نے باہم ملاقات کی ہے وہ اس بات کا نمونہ تھا کہ مشایخ ایسے عمدہ اخلاق رکھتے ہیں۔ عوام کی سب غلط فہمیاں دُور ہوگئیں اور جو فرضی روایتیں کشیدگی اور رنجش کی مشہور تھیں، مجمع کی ایک ہی ملاقات میں صاف ہوگئیں. مگر افسوس ان بزرگوں کے بعد ان کے جانشیوں نے رسم مودت و اتحاد کو تازہ نہ کیا۔ ہر ایک اپنے مشاغل میں مصروف ہے اور اس عظیم الشان ضرورت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

جس قدر بڑے بڑے عرس نظامیہ خانقاہوں میں ہوتے ہیں، وہاں سوائے انہی مشایخ کے، جن کو صاحب عرس سے کچھ تعلق ہے، اور کوئی عرس میں نہیں آتا اور آتے ہیں تو اس طرح کہ ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اجمیر شریف میں چشتیوں کے تمام مشایخ، خواہ وہ کسی شاخ کے ہوں، جمع ہوتے ہیں اور محفل سماع میں بازو سے بازو ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے پوچھا جائے کہ چھ دن کی محفلوں میں تم نے کتنے مشایخ سے واقفیت حاصل کی تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم واقفیت حاصل کرنے نہیں جاتے۔ ہمارا مقصد سماع کی شرکت ہوتا ہے. اس میں کوئی شک نہیں کہ محفلِ سماع کے آداب کے خلاف ہے کہ وہاں بات چیت اور کلمہ کلام ہو لیکن اس کا کیا علاج کہ ان مشایخ کے باہمی میل جول کا اور ایک جگہ جمع ہونے کا اس سے بہتر اور کوئی موقعہ میسر نہیں آسکتا اگر سماع سے پہلے یا بعد کوئی وقت ایسا مقرر کیا جائے جس میں مشایخ آپس میں میل جول اور تبادلہ خیالات کریں تو کوئی ہرج نہیں۔ یہ بات جب ہی ہوسکتی ہے کہ مشایخ اس کی ضرورت اور اہمیت اور مفاد کو سمجھتے بھی ہوں۔ وہاں تو یہ عالم

ہے کہ ہر بزرگ دوسرے بزرگ سے مصافحہ کرنا یا آنکھ ملانا اپنی شان اور وقار کے خلاف سمجھتا ہے۔ پھر کیونکر یہ رسم جاری ہو سکتی ہے کہ "ملاقاتی محفل" قائم ہو۔

قصہ مختصر اس تنگ خیالی اور نقصان رساں کشیدگی اور علیحدگی کو سالہا سال مشاہدہ کرنے کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دور کرنے کا خیال مشائخ میں پیدا کریں، اور یہ خیال جب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کے سامنے بزرگوں کی مثالیں پیش کی جائیں اور یہ دکھایا جائے کہ مشائخ قدیم کا باہمی برتاؤ کیسا تھا اور تم آجکل کیا برتاؤ کر رہے ہو۔ اُن کا طرزِ عمل دین و ملت کے لئے مفید تھا یا تمہارا؟ خدا کو منظور ہے تو ان اوراق میں ہم کل سلسلوں کے مشائخ متقدمین کا وہ تذکرہ شائع کرتے رہیں گے جس سے ہمارا مذکورہ مقصد ہویدا ہو سکے۔ سردست چشتیوں اور سہروردیوں کے پرانے تعلقات لکھے جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں انہی سلسلوں کا قدم پہلے آیا تھا۔ گو آجکل سہروردی طریقہ کی اشاعت عام نہیں ہے مگر جس زمانہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ سہروردیوں کے عروج و کمال کا زمانہ تھا۔ امید ہے کہ تمام مشائخ عظام ان واقعات کو غور و خوض اور تعمق سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

## التمش کی خرقہ پوشی

قبل اس کے کہ چشتیوں اور سہروردیوں کے تعلقات کا ذکر شروع کیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہانِ ہند کے مذہبی خیالات کا تھوڑا سا تذکرہ کر دیا جائے۔

جب شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان فتح کر لیا تو اس کے نائب اور غلام قطب الدین ایبک نے پایۂ تخت کی بنیاد دہلی میں قائم کی اور فتح کی یادگار میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار بنانا شروع کیا۔ یہ بادشاہ درویشوں کی طرف خاص

میلان رکھتا تھا. مگر اس کی زندگی نے بہت کم وفا کی. اس کے بعد جس قدر بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ عموماً سب چشتیہ طریق کے تھے کیونکہ دہلی میں چشتیوں کے بہت بڑے پیشوا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح اجمیری خواجہ کے دربار کی جانب سے تشریف رکھتے تھے.

ان غلام بادشاہوں میں سلطان شمس الدین التمش سب سے بڑھ گیا اور اس نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے اس قدر عقیدت پیدا کی کہ حضرت کے ممتاز مریدوں میں شمار ہونے لگا. بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اس کو خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا تھا اور حضرت کے وصال کے بعد اسی بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے حضرت کی میت کو غسل دیا. مشائخ میں خیال کیا جاتا ہے کہ التمش کو مرتبۂ قطبیت بھی حاصل ہوا تھا. بہرحال التمش کی خرقہ پوشی اور چشتیہ خاندان سے گرویدہ ہونے کے سبب ملک میں چشتیوں کی طرف عام میلان ہوگیا تھا اور لوگ جوق جوق اسی طریقہ کے مرید ہو رہے تھے.

اس زمانے میں ملتان اور دیپالپور وغیرہ سرحدی مقامات میں سہروردی سلسلہ نے قدم بڑھانے شروع کئے تھے. چونکہ ملتان بیرونی دشمنوں کے حملہ کی پہلی ٹکر پر واقع تھا. اس واسطے شاہان دہلی اس کے استحکام کے لئے چیدہ افسر مقرر کرتے تھے اور ملک کی زبردست فوجیں وہاں رہتی تھیں. اس ظاہری انتظام کے ساتھ باطنی انتظام بھی تھا. ملک کے نامور علماء و مشائخ خلقت کی روحانی تربیت کے لئے ملتان میں رہتے تھے. چنانچہ سہروردیہ طریق کے نامور پیشوا حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ یہیں تشریف رکھتے تھے. لوگوں کو ان سے بڑا اعتقاد تھا اور سہروردی سلسلہ نہایت سرعت سے پھیل رہا تھا. اسی اثناء میں دہلی سے حضرت خواجہ قطب صاحب کے خلیفۂ اعظم حضرت بابا فرید گنج شکر بھی ملتان کے قریب قصبۂ اجودھن میں تشریف

لے گئے اور وہیں قیام اختیار کیا۔ حضرت بابا صاحب کے تشریف لے جانے سے سہروردیہ سلسلہ کی ترقی میں پہلی سی تیزی نہ رہی۔ مگر اس کا نہ حضرت شیخ الشیوخ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کو افسوس تھا اور نہ حضرت بابا صاحب کو خوشی تھی۔ کیونکہ یہ دونوں بزرگ دینی خدمت کر رہے تھے۔ اُن کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ کون خاندان زیادہ پھیل رہا ہے۔

التمش کے بعد سب غلام بادشاہ چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے۔ غیاث الدین بلبن حضرت بابا صاحب کی زیارت کے لئے خود اجودھن (پاکپتن) حاضر ہوا اور ایک روایت کے بموجب اپنی لڑکی حضرت سے منسوب کی۔ بلبن کے آخری زمانے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحب کی اجازت سے دہلی کے نائب مقرر ہو کر تشریف لائے، اور حضورؒ کا غلغلہ اس کی موت سے پہلے اچھی طرح تمام ملک میں پھیل گیا۔ بلبن اور اس کا بیٹا محمد خان شہید، جو ملتان کا صوبے دار تھا، حضرت محبوب الٰہیؒ سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ بلکہ محمد خان تو حضرت کے دو مقبول مریدوں حضرت امیر حسن علا سنجریؒ اور حضرت امیر خسروؒ کو اپنے ہمراہ ملتان لے گیا اور مرتے دم تک پاس رکھا۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کا خاص عقیدت شعار رہا اور اس طرح چشتیوں کی دھاک تمام ملک کے دل پر بیٹھ گئی۔

کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی بھی چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے۔ مگر علاؤ الدین کا جانشین قطب الدین خلجی چشتیوں سے منحرف ہو گیا اور اپنی نادانی و ناتجربہ کاری کے سبب اس کے درپے ہوا کہ پولیٹیکل چال سے

## چشتیوں کا زور

توڑ دے چنانچہ اس کے مشیروں نے اس کو صلاح دی کہ جب تک حضرت

محبوب الٰہیؒ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا بزرگ دہلی میں نہ آئے گا۔ ان کا زور قائم رہے گا۔ شاہی اختیارات سے ایسے ہر دلعزیز لوگوں کا زیر کرنا آسان کام نہیں ملتان سے سہروردیہ خاندان کے سب سے بڑے پیشوا حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو دہلی بلوائیے۔ اوّل تو یقیناً ان کے آپس میں زور آزمائی ہوگی حضرت محبوب الٰہی کبھی گوارا نہ کریں گے کہ ان کی اقلیم میں غیر خاندان کا آدمی سکہ چلائے۔ مولانا رکن الدین چونکہ سلطان کی شہ سے آئیں گے اس واسطے وہ بھی مضبوطی سے چشتیوں کا مقابلہ کرینگے اور دہلی سے اُن کا اثر زائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کش مکش میں سلطان کا مطلب حاصل ہو جائے گا۔ سلطان نے اس مشورہ کو پسند کیا اور ملتان سے حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو بلوایا۔ چنانچہ حضرت مولانا ملتان سے روانہ ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔ اور وہ وقت قریب آگیا کہ

# تلوار اور تسبیح کا مقابلہ

شروع ہو۔ کیونکہ سلطان تلوار کے زور سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی تسبیح کو زک دینی چاہتا تھا۔ آجکل کا زمانہ ہوتا تو خبر نہیں کیا حالت ہوتی۔ خود مختار، جابر، ظالم سلطان کا زمانہ اور ایسی خطرناک چال کہ بھائی کو بھائی سے جنگ کا اندیشہ مگر حضرت محبوب الٰہی رح نے اپنی خداداد حقانیت اور حسن نیت سے سلطان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے جونہی حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح شہر میں داخل ہوئے سلطان نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا اور پوچھا کہ دہلی میں سب سے پہلے کون ملا؟ آپ نے ارشاد کیا جو سب سے اچھے ہیں۔ سلطان نے گھبرا کر دریافت کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا، مولانا نظام الدین محبوب الٰہیؒ! یہ سُن کر سلطان کا چہرہ فق ہوگیا اور اس نے غیظ و پشیمانی میں اپنا منہ حضرت کی طرف سے پھیر لیا۔ وہ اپنے ہونٹھ چباتا تھا اور حضرت محبوب الٰہی رح کی ایسی

صاف کامیابی سے مبہوت تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ لوگ دنیا کے آدمیوں کی طرح چالبازیاں نہیں کیا کرتے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جو چراغ خدا نے روشن کیا تھا وہ ان فریب کاریوں کی پھونکوں سے بجھنا دشوار ہے۔ اس کے مشیروں نے چشتیوں اور سہروردیوں کو جدا گانہ مذہب تصور کر کے یہ چال چلی تھی مگر اب انہیں معلوم ہوا کہ یہ سب تو ایک ہی گھر کے رہنے والے ہیں اور ان میں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات وہم و گمان کی طرح نہ آئی تھی کہ حضرت محبوب الٰہی، باوجود اس قدر عظمت و شان کے کہ تمام ہندوستان ان کے قدموں پر سر جھکاتا ہے، مولینا رکن الدین ابوالفتح کے استقبال کو شہر سے باہر تشریف لے جائیں گے اور اس طرح بادشاہ کی کی کرائی محنت کو خاک میں ملا دیں گے۔

مولانا رکن الدین بشر تھے۔ امکان میں تھا کہ وہ دہلی میں بادشاہ کے پاس ٹھہر کر اغوا میں آجاتے اور حضرت محبوب الٰہی سے مخاصمت شروع کر دیتے۔ مگر حضرت محبوب الٰہی نے کمال دور اندیشی، کمال اخلاص شعاری، کمال مہمان نوازی اور کمال فروتنی کو کام میں لا کر خود تکلیف اٹھائی۔ شہر سے باہر استقبال کو تشریف لے گئے اور بادشاہ سے پہلے حضرت سے ملاقات کر لی جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت محبوب الٰہی ہی تمام دہلی میں سب سے اچھے ہیں جو بادشاہ کے دل پر تیر کی طرح زخم انداز ہوا

## ہند کے تاج کو دھمکی

قطب الدین خلجی اس واقعہ کے بعد فکر میں رہا کہ مولانا رکن الدین کو حضرت محبوب الٰہی سے برہم کرانے کی کوئی اور صورت پیدا ہو مگر مرتے دم تک اس کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ادھر تو وہ اس خیال میں تھا ادھر حضرت مولانا رکن الدین خود کیلو کھری کی جامع مسجد میں

نماز کو تشریف لے گئے جہاں حضرت محبوب الٰہی نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا صحن بہت وسیع تھا نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کو خبر دی گئی کہ مولانا رکن الدین اس مسجد میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت یہ سن کر مولانا سے ملنے تشریف لے چلے اور تمام وسیع صحن پیادہ طے کر کے مسجد کے دوسرے حصے میں پہنچے۔ اس وقت مولانا صاحب نماز میں مصروف تھے حضرت محبوب الٰہیؒ مولانا کے پس پشت بیٹھ گئے خلقت کا یہ عالم تھا کہ ٹوٹی پڑتی تھی عوام کو نہایت تعجب تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے شاندار بزرگ نے مولانا کے پس پشت بیٹھنا کیونکر گوارا کر لیا۔ حالانکہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ عارفین ان ظاہری تکلفات کو ہیچ سمجھتے ہیں مگر آج کل کے زمانہ میں کوئی کبھی کوئی درویش اس بات کو قبول نہ کرے گا کہ دوسرے درویش کے پیچھے بیٹھ جائے اور ہزاروں مرید یہ تماشہ دیکھ رہے ہوں کیونکہ اس کے دل میں ضرور اندیشہ ہوگا کہ اس سے میرے مریدوں کے عقیدے میں کمزوری واقع ہوگی اور میری وقعت کے مقابلہ میں اس شخص کی وقعت بڑھ جائے گی جس کی تعظیم کر رہا ہوں۔ لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ نے چھ سو برس پہلے اس وہم کو جھوٹا ثابت کر کے دکھا دیا کہ ایک غیر سلسلہ کے فقیر کی ایسی غیر معمولی تعظیم اپنے مریدوں کے سامنے کی۔ مگر حضرت کی وقعت کو بال بھر صدمہ نہ پہنچا بلکہ اور گرویدگی بڑھ گئی۔

جب حضرت مولانا نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ کمال تپاک سے مصافحہ و معانقہ کیا اور دونوں بزرگ ہاتھ پکڑ کے باتیں کرتے ہوئے دروازے پر تشریف لائے اور پالکیوں میں سوار ہو کر اپنے اپنے مقامات پر تشریف لے گئے۔

اس ملاقات کی خبر سلطان کو ہوئی تو اس نے بہت پیچ و تاب کھایا مگر کیا کر سکتا تھا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ آخر اسی آتش حسد میں جلتا ہوا ایک دن اپنے مرغوب غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے محل ہزار ستون کی چھت پر قتل کیا گیا۔

# ایک اور پُر اسرار مباحثہ

حضرت مولینا رکن الدینؒ جس کام کے لئے بلائے گئے تھے، وہ قطب الدین کے ساتھ قبر میں گیا۔ اب ان دونوں بزرگوں کی ایک اور ملاقات کا ذکر لکھا جاتا ہے جو موجودہ مشائخ کی سبق آموزی کے لئے از بس مؤثر ہے اور اتحاد کا جذبہ ہر قلب میں پیدا کرتا ہے۔

ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ اس مقام پر تشریف رکھتے تھے۔ جہاں آپ کا مزار ہے کہ ایک شخص خبر لائے کہ حضرت مولانا رکن الدین ملاقات کو تشریف لاتے ہیں حضرت نے خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرو۔ اسی اثناء میں خبر آئی کہ تشریف لے آئے۔ حضرت بالاخانے سے تشریف لائے اور حضرت مولانا کا استقبال فرمایا۔ مولانا پالکی میں سوار تھے اور پاؤں میں کچھ تکلیف تھی لیکن اسی حالت میں نیچے اُترنے کی کوشش فرمانے لگے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اصرار کیا اور نیچے نہ اترنے دیا پالکی زمین پر رکھ دی اور حضرت محبوب الٰہیؒ بھی وہیں رونق افروز ہوگئے۔ اقبال نے دسترخوان چنا۔ کھانے لگائے گئے۔ انگوری سرکہ دور رکھا تھا مولانا نے فرمایا، سرکہ قریب لاؤ۔ پیالی قریب سرکا دی گئی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا اسی شہر کا ہے۔ مولانا نے جواب دیا، اسی لئے تیز ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں اور اسی واسطے عزیز ہے۔ اس پر لطف بات چیت کے بعد کھانا بڑھایا گیا۔ خواجہ اقبال نے ایک باریک کپڑے میں سو اشرفیاں باندھ کر اور چند تھان نہایت نفیس کپڑوں کے ان کے ہمراہ مولانا کے سامنے رکھے۔ اشرفیوں کی زردی کپڑے سے جھلک رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا استر ذہبک۔ (اپنے سونے کو چھپاؤ) حضرت محبوب الٰہی رض نے جواب میں فرمایا استر ذہبک وذھابک ومذہبک اپنے سونے کو چھپاؤ، اپنے جانے کو

چھپاؤ، اپنے مذہب کو چھپاؤ) اس جواب سے مولانا بہت محظوظ ہوئے۔ کیونکہ یہ تمام باتیں سلوک کے مقاموں کی تھیں جن کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس برجستگی اور فصاحت سے ادا کردیا کہ مزاح کا مزاح اور بیان کا بیان۔ کوئی شخص اس اختصار اور موزونیت سے درویشی کی باتیں ادا نہیں کرسکتا۔

اس پُراسرار و لطیف گفتگو کے درمیان میں مولانا رکن الدین کے بھائی مولینا عماد الدین اسمٰعیل نے عرض کیا کہ اس وقت ہندوستان کے دو نامور بزرگ ایک جگہ جمع ہیں۔ اس سے بہتر اور کوئی موقعہ میسر نہیں آسکتا۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہجرت کا کیا سبب تھا؟ یعنی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کیوں فرمائی اگرچہ ظاہری طور پر تو ہر شخص جانتا ہے کہ کفار قریش کی یورش و آزار دہی کے سبب سے ہجرت ہوئی مگر

# ہر ظاہر کا ایک باطن ہے

اس ظاہری وجہ کا باطن بھی ضرور ہوگا۔ اس کی تشریح و توضیح کا طلب گار ہوں۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ حضرت سلطان المشائخ جواب ارشاد کریں گے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ سلطان المشائخ نے فرمایا۔ نہیں آپ ہی فرمائیں۔ آخر اس کسرِ نفسی کے تبادلہ کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے اول ارشاد کیا کہ فقیر کے خیال میں مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل اس بات پر منحصر تھی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر بار چھوڑیں، سفر کی تکلیف برداشت کریں۔ عزیز و اقارب سے جدا ہوں اور مدینہ میں ہجرت کرکے تشریف لے جائیں تاکہ مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل حضور کے فیض صحبت سے ہوجائے۔

مولانا رکن الدینؒ نے یہ جواب سن کر فرمایا، میرے نزدیک خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات کی تکمیل ہجرت پر منحصر تھی۔ جب حضورؐ نے کامل طور سے تمام

تعلقات خانہ کو ترک کر کے بے وطنی اختیار کی اس وقت دین مکمل ہوا۔ ان دونوں
جوابوں میں ہر بزرگ نے نہایت بڑے دار اشارے کئے تھے جن کی تشریح
ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مولانا عماد الدین کا سوال تو محض ہجرت کے متعلق تھا مگر ان
حضرات نے جواب ایسے پیرایہ سے دیا کہ اپنی ذات کے متعلق بھی اشارے کنائے ہوگئے
مثلاً حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہہ فرمانا کہ ہجرت مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل کے لئے ہوئی
بظاہر نہایت سادہ و مودب جواب ہے۔ مگر حقیقت میں حضرت نے خود اپنی ذات
کی نسبت اشارہ کیا ہے کہ مولانا رکن الدین کا ملتان سے ہجرت کر کے دہلی آنا،
میرے نقص کی تکمیل کے لئے ہے۔ اس کے جواب میں مولانا رکن الدین نے فرمایا
کہ نہیں بلکہ خود میری تکمیل دہلی آنے اور آپ سے فیضیاب ہونے پر منحصر تھی۔ بہرحال
یہ وہ برتاوے ہیں جن سے اعلےٰ درجے کی یگانگت و اخلاصمندی ترشح ہوتی ہے۔ کون
کہہ سکتا ہے کہ یہہ دونوں بزرگ علیحدہ علیحدہ سلسلہ کے تھے۔ گو اس میں سے ایک
چشتیہ گھرانے کا آفتاب اور دوسرا سہروردیہ طریق کا ماہتاب تھا۔ لیکن طرز عمل سے وہ
دونوں ایک جان و دو قالب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج کل کے مشائخ نے گلیم
درویشی کو اس قدر تنگ کردیا ہے اور میل جول و رسم اتحاد کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ حلقہ
نظام المشائخ نے اس بات کا بیڑا اٹھایا ہے کہ مشائخ میں پھر وہی اگلا سا اتحاد پیدا ہو۔
قادری، چشتی، نقشبندی، سہروردی، نظامی، صابری، مجددی وغیرہ سب شیر و شکر ہوکر
رہیں اور اپنی ان اغراض کی، جو سب طریقوں میں شامل ہیں، اغیار کے مقابلے میں
حفاظت کریں۔ اس اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب سلسلے خلط ملط ہو کر ایک معجون
مرکب بن جائیں بلکہ منشاء یہ ہے کہ فروعات کے ناجائز اختلافات مٹا دیئے
جائیں۔ ہر شخص دوسرے سلسلہ کے بزرگ کا ادب اسی طرح ملحوظ رکھے جس طرح کہ
وہ اپنے سلسلہ کا ادب کرتا ہے۔ اگر ایسا ہونے لگا اور ہمیں تسلی دی گئی ہے

کہ ایسا ہی ہوگا، تو گلیم درویشی کی وسعت پھر اپنی اصلی شان پر آجائے گی.

# خوش خلقی

از صوفی۔ نومبر ۱۹۰۹ء

## خوش خلقی کی فضیلت

جس طرح ہمارے رسول صلعم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے، اسی طرح اُن کے اوصاف وخصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں. اللہ تعالےٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے. مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے. چنانچہ ارشاد ہوا اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ. تمہاری پیدائش (اے محمد) بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے. اس سے معلوم ہوا کہ حُسنِ خلق ایسی شاندار چیز ہے کہ حضور رسول مقبولؐ کے اعلےٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا. خود رسول مقبول صلعم نے حسن خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کو ذیل میں قلم بند کر کے بدخلقی کی برائی کو لکھا جائے گا اور اس کے بعد بتایا جائے گا کہ حسنِ اخلاق کیا چیز ہے۔

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہ رضؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں. ابوداؤد اور ترمذی نے ابوالدرداءؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا کہ سب سے بھاری چیز جو میزان عمل میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی. ایک دفعہ کسی نے حضورؐ سے دریافت کیا دین کیا چیز ہے؟ حضورؐ نے فرمایا خوش خلقی! اُس شخص نے حضورؐ کے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا اور یہی جواب پایا. یہاں تک کہ

چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔ ایک اور آدمی نے دریافت کیا، اعمال میں افضل کیا چیز ہے؟ فرمایا حسنِ خلق۔ کسی نے دریافت کیا باعتبار ایمان کون افضل ہے؟ ارشاد ہوا جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی نے "مکارم الاخلاق" میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے، تو خندہ پیشانی اور خلق حسن میں بڑھ جاؤ۔ حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا۔ تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے، اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم اکثر یوں دعا فرماتے تھے۔

(الٰہی تو نے میری اچھی صورت بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا) دریافت کیا گیا بندہ کو سب سے اچھی کیا چیز دی گئی ہے؟ فرمایا خلق حسن! دوسری جگہ فرمایا۔ قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو۔ فرمایا۔ کوئی تدبیر عقل کی موافق نہیں ہوتی مگر خوش خلقی۔

## بد خلقی کی بُرائی

حضرت صلعم سے کسی نے دریافت کیا نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا بد خلقی! فرمایا بد خلقی اعمال نیک کو اس طرح خراب کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ بد خلق ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا نہیں جائیگا نیز حضورؐ نے فرمایا۔ بد خلق آدمی دوزخ کی تہہ میں ڈالا جائے گا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا۔ بد خلق انسان اپنی جان کو آفت میں خود پھنساتا ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں۔ بد خلق ٹوٹا ہوا برتن ہے۔ نہ جُڑ سکتا ہے، نہ مٹی بن سکتا

ہے حضرت فضیل نے فرمایا بدکار خوش خلق کو بدخلق عابد پر ترجیح ہے۔

# خوش خلقی کیا چیز ہے

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ کشادہ پیشانی رہے اور دولت کو خرچ کرے اور کسی کو ایذا نہ دے۔ واسطی فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کی یہ علامت ہے کہ نہ آدمی خود کسی سے دشمنی کرے، نہ کوئی اس سے خصومت رکھے اور مفلسی اور تونگری میں خلقت اس سے راضی رہے۔ شاہ کرمانی کے خیال میں ایذاء سے باز رہنا اور شفقتوں کا سہنا خوش خلقی ہے۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں۔ غربت کی شان سے لوگوں کے قریب رہنا خوش خلقی ہے۔ حضرت مولا علیؓ فرماتے ہیں۔ خوش خلقی تین چیزوں میں ہے۔ محرمات سے بچنا، حلال روزی کا تلاش کرنا اور عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔ امام غزالیؒ کی رائے میں خلق کی تعریف یہ ہے کہ انسان سے افعال بآسانی بلا فکر وتامّل صادر ہوں۔ اگر وہ افعال عقلاً و شرعاً عمدہ ہیں تو خوش خلقی ہے، ورنہ بد خلقی۔ نیز فرمایا خلق فعل کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے آدمی طبیعت کے اعتبار سے سخی ہوتے ہیں مگر مفلسی کے سبب سخاوت نہیں کر سکتے یا بعض آدمیوں کی طبیعت بخیل ہوتی ہے لیکن ریاکاری سے خرچ کرتے ہیں اور فرمایا جس طرح ظاہری جسم محض آنکھوں یا صرف رخساروں کی موزونیت سے مکمل نہیں کہلاتا جب تک کہ کل جسم کے اعضاء، موزوں نہ ہوں۔ اسی طرح خوش خلقی، جو انسان کا باطنی حسن ہے چار چیزوں سے مکمل ہوتی ہے۔

ایک قوت علم، دوسرے قوت غضب تیسرے قوت خواہش، چوتھے قوت عدل۔
یعنی ان چاروں طاقتوں کو درجہ اعتدال پر رکھنا، علمی طاقت کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی اس کے سبب اپنے اعمال اور عقائد میں راست رو رہ جاتا ہے۔ اسی طرح

سے غضب اور شہوانی طاقت پر قابو ہونا محاسنِ اخلاق کے لئے لازمی ہے اور یہ قابو قوتِ عدل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

# خوش خلقی کیونکر پیدا ہوتی ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان سے ظاہری جسم کی اصلاح ناممکن ہے اسی طرح باطنی درستی بھی دشوار ہے۔ بُونا آدمی کوشش سے دراز قد نہیں بن سکتا، کالا رنگ گورا نہیں ہو سکتا، بدصورتی خوبصورتی سے نہیں بدل سکتی۔ ایسے ہی جس کی سرشت میں کج اخلاقی ہے، وہ تدبیر سے خوش اخلاق نہیں بن سکتا۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو یہ بعض جسمانی مثالیں اس مسئلہ پر کما حقہٗ صادق نہیں آتیں دوسرے یورپ کے محققین نے اس کلیہ کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے اور جسم کے وہ عارضے، جن کی صحت ناممکن مانی گئی تھی، ان کی تدبیروں سے کم ہوتے جاتے ہیں۔

بدخلقی کا بدل جانا فطرت سے ثابت ہے۔ درندے جانور انسان کی تربیت سے اپنی خونخوار خصلت کو بھول جاتے ہیں تو خود انسان دوسرے انسانوں کی تربیت سے اصلاح پذیر کیوں نہ ہو سکے گا۔ بعض آدمی تو پیدائشی نیک اور خوش خلق ہوتے ہیں لیکن جن کی عادت ابتدا سے بدخوئی اور تنگ مزاجی کی ہوتی ہے وہ بھی خوش خلق بن سکتے ہیں۔ جس کی سب سے آسان ترکیب خوش اخلاق لوگوں کی صحبت ہے۔ صحبت زمانہ قدیم سے لے کر اس نئے زمانہ تک (جو پرانے عہد کی باتوں پر خندہ زنی کرتا ہے) یہ امر مسلّم ہے کہ صحبت کا اثر تمام تعلیمات سے بڑھکر ہے۔ ملنے جلنے کی تاثیر سے آدمی میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی واسطے مشائخ عظام نے حسنِ صحبت کو تصوف کی درسگاہ مانا ہے۔

جس کو خوش خلقی سیکھی ہو یا کسی دوسرے کو خوش خلق بنانا ہو تو چاہیئے کہ ایک ایسے شخص کی صحبت اختیار کرے جو خوش اخلاقی کا مکمل نمونہ ہو۔

# انسانِ کامل کے اخلاق

خوش خلقی کی ذہن نشین تعلیم ایک انسان کامل کی اخلاقی مثالوں کے بغیر دشوار ہے۔ اس واسطے حضرت سالت پناہ صلعم کے اخلاق کی چند مثالیں معتبر و مستند کتب سے اخذ کر کے لکھی جاتی ہیں مشائخ صوفیہ ان مثالوں کو توجہ اور غور سے ملاحظہ فرمائیں اور اپنے متکبرانہ اخلاق کی تبدیلی میں متوجہ ہوں۔

حضرت رسول مقبول صلعم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لے جاتے غلام کی دعوت منظور کر لیتے، پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے، کپڑوں میں پیوند لگا لیتے، اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے صحابہ کو تکلیف نہ دیتے بلکہ جو کام خود نہ کر سکتے تھے اس کو دوسرے سے کرانا برا تصور فرماتے تھے جب حضور کا گزر لڑکوں پر ہوتا، اُن کو سلام کرتے۔ ایک شخص حضور کے پاس آیا۔ وہ حضور کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ حضور نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے، میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضور کا دستور تھا کہ حضور اپنے اصحاب میں اس طرح سے مِل جُل کر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی حضور کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پہ حضور تشریف رکھنے لگے اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی۔

ایک دفعہ حضرت عائشہ رض نے حضور سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں، تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجیے تاکہ تکلیف نہ ہو۔ حضور نے ارشاد کیا میں اسی طرح کھاؤں گا

جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ حضور کے اصحاب میں سے یا اور کوئی آدمی حضور کو پکارتا تو حضور جواب میں لبیک فرماتے جس قسم کی بات کا حضور کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا تو حضور بھی اُسی کے متعلق باتیں کرتے اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو حضور بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو حضور بھی تبسم فرماتے اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور کسی بات میں اصحاب کو زجر و توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے اساکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ جو لوگ اخلاق میں افضل ہوتے ان کا احترام فرماتے تھے۔ جو حضور کے سامنے عذر کرتا اُس عذر کو قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے تھے۔ مباح کھیل کو دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ حضور بچوں کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے لوگ حضور کے سامنے بلند آواز سے بولتے تھے جس سے حضور کو اذیت ہوتی تھی مگر حضور صبر فرماتے۔ کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے کسی بادشاہ سے اس کی دنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

حضور نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کی۔ اگر حضور سے کہا جاتا کہ کسی کے لئے بد دعا کیجئے، تو حضور اس کو دعا دیتے۔ سوائے جہاد کے حضور نے کسی پر وار نہیں کیا۔ اگر حضور کے واسطے بچھونا بچھا دیا جاتا تو حضور اس پر لیٹ رہتے اور اگر بچھونا نہ بچھایا جاتا تو حضور زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی حضور سے ملتا، سلام میں سبقت فرماتے اور جب تک وہ چلا نہ جاتا وہاں کھڑے رہتے۔ اگر کوئی حضور کا ہاتھ پکڑ لیتا تو حضور چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا حضور کے پاس کوئی آتا اور حضور نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے کچھ کام ہو تو کہو۔ کسی مجمع میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ کسی کو اٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی کبھی

پاؤں پھیلا کر بیٹھتے تھے جو لوگ حضور کے پاس آتے تھے ان کی خاطر اور تعظیم فرماتے قرابت داروں کے لئے اپنی چادر بچھا دیتے تھے جس تکیہ کے سہارے حضور تشریف رکھتے تھے، آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دیکر تکیے کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ حضور کے حسنِ اخلاق کا مجمل سا بیان ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان، خاصکر صوفیائے کرام، جو حضور کی پیروی و تقلید کو مقصود و تصور کرتے ہیں، آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اب تو مشائخ کی صحبتیں متکبر امراء کے درباروں سے بڑھ کر پائی جاتی ہیں۔ جہاں غرباء اور کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فقراء میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان زمین کا فرق پڑ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشدِ حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلعم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں اور یورپ کی خود غرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا زندہ نمونہ بنکر نمودار ہوں تا کہ نیت تمنا کی پیاسی دنیا اسلامی چشمۂ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے۔

# خونی درویش

از نظام المشائخ۔ جنوری ۱۹۱۰ء

درویشی اور خونخواری، یہ دونوں الفاظ آپس میں کیسے اجنبی اور نا آشنا معلوم

ہوتے ہیں جو وجود خاک نشینی کے سبب میدان ہستی میں موجود نظر آتا ہو۔ اس کو خدنگ اندازی سے کیا سروکار، مگر زمانہ نے اور اس کی غلط گو زبانوں نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا سوڈانی ملا صاحب کے ہمراہیوں کا نام درویش مقرر کر دیا تھا۔

سوڈان مصری حکومت کے جوار میں ایک علاقہ ہے جہاں کوئی ملا صاحب مہدی کے لقب سے نمودار ہوئے تھے اور چند جنگجو اعراب کو ساتھ لیکر سوڈان فتح کر لیا تھا۔ انگریزوں نے جو مصری حکومت کے محافظ ہیں، مصری فوج کے ساتھ ہو کر ملا مہدی صاحب اور ان کے رفقا سے جنگ بازی کی اور آخر شکست و فتح کی متعدد گردشوں کے بعد سوڈان فتح کر لیا جو اب تک قبضے میں ہے۔ مجھکو اس سے بحث نہیں کہ ملا حق پر تھے یا ناحق پر، انگریزوں نے ان سے جنگ بازی انصاف سے کی یا ناانصافی سے۔ کیونکہ غیر ملک اور غیر حکومت کے معاملات سے ہمیں کیا واسطہ؟ گفتگو اس معاملہ میں ہے کہ ملا مہدی کے سپاہیوں کو لفظ درویش سے یاد کیا جاتا تھا اور تمام عربی، اردو، انگریزی اخبارات مہدی کی فوج کو درویش کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ آیا یہ لفظ موزوں تھا یا ناموزوں، غلط تھا یا صحیح، جائز تھا یا ناجائز؟

میں کہتا ہوں کہ ملائی لشکر کو درویش کا نام دینے والا یا تو کوئی بڑا ہی نادان اور درویشی طریق سے بے خبر تھا، اور یا اس کو فقرا سے کچھ عداوت تھی اور دانستہ اس نے ان کے غیر متحرک اور ساکت گروہ کو بدنام و مشتبہ کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

درویشوں کی پرامن معاشرت پر اس سے بڑھ کر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کو شرّی، فسادی طبقے میں شمار کرانے کے واسطے ایسے ناجائز وسائل اختیار کئے جائیں۔

ملا مہدی کی فوج میں سوائے اسکے کہ وہ بدویانہ زندگی کے مسلمان تھے، کوئی بات درویشی کی نہ تھی۔ خود ملا مہدی صاحب عالمانہ حیثیت سے ایک بزرگ تھے جنہوں نے ظاہری اتقا کے سبب عوام پر ایک خاص اثر حاصل کر لیا تھا۔ اور یہ اثر ان کی دانش مندی سے حصول مملکت میں اُن کے لئے مفید ہو گیا تھا نہ ان کا باضابطہ کوئی سلسلہ تھا اور نہ وہ درویشی طریقے پر سلسلہ چلانا پسند کرتے تھے۔ بلکہ وہ ایک ملکی اور جنگی بیعت لیتے تھے۔ جس کو فقیری بیعت سے کچھ علاقہ نہیں تھا

ایسی صاف صورتوں میں کوئی منصف مزاج ملا صاحب کی فوج کو درویش نہیں کہہ سکتا۔ لہذا ان خونی درویشوں کو اصلی اور حقیقی درویشوں سے جدا کیا جانا ضروری ہے۔

اب مسلمانوں میں کوئی خونی درویش باقی نہیں رہتا جس کی ہستی پر غور کر سکیں اور نظر ہندوؤں کے ایک فرقے پر جاتی ہے جو باعتبار لباس درویش معلوم ہوتا ہے مگر کام درویشی کے نہیں کرتا۔ فقیری لباس کی آڑ میں پوشیدہ ہو کر حصول مملکت کے منصوبے پورے کرتا، بم اندازی اور پستول بازی کے کرشمے دکھاتا ہے۔

یہاں بھی ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ ان کی یہ کوشش جائز ہے یا ناجائز بلکہ کلام اس روش اور طرز میں ہے کہ اس سیاسی جماعت کو خرقۂ درویشی استعمال کرنا زیبا ہے یا نہیں۔

کلکتہ میں مَیں نے ان مصلحتی درویشوں کے سرگروہ بابو آربند و گھوش سے اسی مسئلہ کے متعلق باتیں کرنے کے لئے ملاقات کی۔ آربند و گھوش بنگال کے نامور فضلاء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی انگریزی قابلیت کا بڑے سے بڑے انگریزی

واں کو اعتراف ہے۔ اگر نوکری کرنی چاہیں تو نہایت معزز عہدہ انگریزی گورنمنٹ
ان کو عطا کرے۔ مگر انہوں نے اپنی دانست میں زندگی ملک پر قربان کر دی ہے
اس لئے بہت سادہ طریق سے بسر اوقات کرتے ہیں اور نوکری نہیں کرنی چاہتے
ابھی تھوڑا عرصہ ہوا چند بنگالی بم اندازی اور بم سازی کے جرائم میں پکڑے گئے
تھے جن کی مدت تک اخباروں میں شہرت رہی تھی۔ بابو آربندو گھوش بھی اس
جماعت کے ساتھ ماخوذ تھے لیکن تحقیقات سے ان کی شرکت کا کوئی قانونی ثبوت
نہ پہنچ سکا اس لئے بری کر دیئے گئے۔ جیل خانے سے واپس آکر انہوں نے
کلکتہ میں ایک ہفتہ وار انگریزی زبان کا اخبار جاری کیا جس کا نام "کرم یوگ" ہے
کہتے ہیں کہ اس اخبار کا لہجہ انقلاب انگیز ہے مگر ایسے عاقلانہ پیرائے سے مرتب
کیا جاتا ہے کہ قانونی مواخذہ کی حد دُور رہ جاتی ہے۔

القصہ جب مَیں نے معلوم کیا کہ بابو آربندو گھوش خود بھی سنیاسی ہو گئے
ہیں اور سنیاسی لباس میں پولٹیکل مشن چلا رہے ہیں اور تمام پولٹیکل سنیاسیوں
کی افسری بھی انہی کو حاصل ہے تو ملنا ضروری سمجھ کر ایک دن ملاقات کی۔ آربندو
اردو بہت کم جانتے ہیں اس لئے ترجمان کے ذریعے سے انگریزی میں
باتیں ہوئیں۔

اول تو مَیں نے یہ دیکھا کہ آربندو کا لباس درویشی نہیں ہے اور نہ ان کے
گرد و پیش کوئی اس لباس کا نظر آیا۔ اس لئے جو خبر مجھ کو دی گئی تھی اس میں شبہ
پیدا ہوا۔ پہلا سوال میں نے آربندو سے یہی کیا کہ کیا تم سنیاسی ہو گئے ہو؟ جس کا
جواب انہوں نے متانت آمیز تبسم سے یہ دیا کہ باعتبار ظاہر سنیاسی نہیں ہوں۔
مگر میرا دل سنیاس کو پسند کرتا ہے اور وہ سنیاسی ہو چکا ہے۔ میں نے دریافت کیا
تمہارے گرو کون ہیں؟ کہا سوامی ددیکا نندجی! اس کے بعد میں نے "کرم یوگ"

کی حقیقت پر گفتگو شروع کی اور پوچھا اخبار کا نام "کرم یوگ" کیوں رکھا ہے؟
جس کا جواب معمولی طور پر یہ دیا گیا کہ اس اخبار کا مقصد لوگوں کو ان کے
فرائض سے آگاہ کرنا ہے اور یہی معنی کرم یوگ کے ہیں۔ کہا گیا کہ کیا گیتا کے
کرم یوگ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے جہاں سری کرشن جی نے ارجن کو
انقلاب پیدا کرنے کا فلسفہ بتایا ہے؟ یہ سن کر آر بند و نے اپنے دور اندیش
دماغ کو جنبش دی اور کہنیاں میز پر ٹیک کر مصنوعی مسکراہٹ ظاہر کر کے سر ہلایا
اور گیتا کی پیروی کا اقرار کیا لیکن اس اقرار کے بعد ان کا چہرہ فکر مند نظر آنے
لگا جس کو وہ اپنی عقلمندی سے دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آخر سوالات کی نوبت اس مقام پر آگئی جو ملاقات کا اصل مقصود تھا کیونکہ
اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ گو یہ خود درویشی لباس میں نہیں ہیں مگر پولیٹکل درویشوں
کی مرشدی کا منصب انہی کو حاصل ہے۔ یہ باتیں بطور سوال وجواب کے نہیں
ہوئیں بلکہ مشورے کے طریق سے کہا گیا کہ جس طرح آپ کو ہندوستان اور اُس
کے علوم سے محبت ہے میں بھی بحیثیت ایک ہندوستانی کے ان علوم کا
شیدا ہوں۔ ویدانت نے اپنی برتری و خوبی کا سکہ یورپ و امریکہ میں بھی چلانا
شروع کر دیا ہے، اور اس سے ہم کو اسی قدر خوشی ہے جتنی آپ کو ہوتی ہوگی
مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض پولیٹکل کام کرنے والے، جن کو ویدانت سے
کچھ تعلق نہیں ہوتا جو سنیاسی لوگ کی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہوتے ہیں محض
ملکی مصلحت سے سنیاسیوں کا لباس پہنتے ہیں اور اس لباس میں بم اندازی
و پستول بازی کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے کیونکہ اس سے درویشی لباس
سلطنت کی نگاہ میں مشتبہ ہو جاتا ہے اور بیچارے غیر پولیٹکل درویش خواہ
مخواہ پولیس کے شک کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر حالات کی یہی صورت رہی تو ایکدن

تمام ملک کے فقرا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اطمینان سے یادِ الٰہی نہ کرسکیں گے اور روحانیت کی تلقین کمزور ہوجائے گی اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ روحانیت کو ضرر پہنچنا ملک کا کتنا بڑا نقصان ہے، جس دولت کے سبب ہندوستان اور ایشیا، تمام یورپ وامریکہ میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، وہ یہی روحانی جواہرات ہیں۔ آپ مادی دولت وحکومت کی طلبگاری میں اس اصلی دولت کو برباد نہ کیجئے اور اپنی جماعت کو فہمائش کیجئے کہ درویشی لباس ترک کردے۔

اس کا جواب بابو آربندو نے ایسا دیا کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اعلیٰ قابلیت کے اس اعتراض کا تسلی بخش جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ عذر کرکے بات کو ٹالنا چاہا کہ سادھو اور درویش اپنی بداعمالیوں کے سبب پہلے ہی مشتبہ وبدنام ہورہے ہیں، اب مزید بدنامی کا انہیں اندیشہ نہ کرنا چاہیئے۔

میں نے کہا اعمال کی بدنامی اصلاحِ حال سے درست ہوسکتی ہے لیکن اس ناجائز اور خوفناک شبہہ کی بدنامی ہرگز دور نہیں ہوگی۔ جب تک کہ یہ طریقہ ترک نہ کیا جائے جو پولٹیکل درویشوں نے شروع کیا ہے۔ اس کا جواب کچھ نہ دیا گیا اور معلوم ہوا کہ بابو صاحب مکالمہ کی اہمیت کے سبب زیادہ توضیح وتشریح پسند نہیں کرتے لہذا گفتگو کسی مفید نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ختم ہوگئی۔

لیکن ہر محبِ وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس گفتگو کے مقصد کو ختم نہ سمجھے اور اس بات کی کوشش کرے کہ پولٹیکل مشنری درویشی ہیئت سے مبرا رہیں۔ سوامی ودیکانند بابو آربندو گھوش کے گرو تھے اور سوامی ودیکانند کے گرو سوامی رام کرشن پرم ہنس جی تھے جو دورِ آخر میں بنگال کے نہایت خدارسیدہ اور عارف بزرگ مانے جاتے تھے۔ میں نے ان کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں عجب

پراثر زندگی تھی۔ دہلی کے رسالہ "زبان" نے اردو زبان میں اُن کے سوانح شائع کئے ہیں
جو لالہ چندو لال صاحب چاول والے سے چھ آنے میں دستیاب ہوتے ہیں۔ پرم ہنس
جی کے تارک دنیا چیلے دو چار اب بھی کلکتہ میں موجود ہیں اور ایک مٹھ میں رہتے ہیں،
سوامی سر دھانند جی سے، جو باغ بازار کلکتہ میں رہتے ہیں، میں نے بھی ملاقات کی۔
بہت اچھے درویش ہیں اور اپنے گرو کے فیضان کا موثر حصہ رکھتے ہیں مگر ان درویشوں
میں پولٹیکل ہلچل کا کوئی لگاؤ میں نے محسوس نہ کیا میری خواہش ہے کہ سوامی پرم ہنس کے
تمام ممتاز چیلے بالاتفاق اس بات کی کوشش کریں کہ درویشی صورت میں پولٹیکل مشن بند
ہو جائے اور میں یقین کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔
بہر حال اس تمام سمع خراشی کا نتیجہ یہ ہے کہ درویشی لباس کی شان اور اصلی حیثیت
کی حفاظت میں ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، یکساں کوشش کریں۔ کیونکہ
درویشی ہی ایک ایسا کوچہ ہے جس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نظر نہیں آتا۔

# درویشی شہادت نامہ

از نظام المشائخ فروری ۱۹۱۰ء

## شہادت کیا چیز ہے؟

اصطلاح میں شہادت ایک قسم کی قربانی کو کہتے ہیں جو مذہبی یا ملکی یا معاشرتی
امور کی حمایت میں ظاہر ہو یعنی اگر کوئی شخص مذہب یا ملک یا رسم و رواج کی حفاظت میں
جان دیدے تو اُس کو شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ دیگر ممالک
اور مذاہب میں بھی شہادت کے لفظ کا کوئی مفہوم باقاعدہ موجود ہو۔ مگر ہم کو

جہاں تک اس مسئلہ میں گفتگو کرنی ہے اس کا تعلق صرف اسلام سے ہے۔

اسلام نے ظاہر ہو کر جو زبردست اور زلزلہ انگیز چیز پیدا کی وہ شہادت کا عقیدہ تھا ہر شخص جس نے اپنے سر کو اسلام کے آگے جھکایا تھا وہ اپنے وجود کو شہادت کی قربان گاہ میں فنا کر دینے کا متمنی اور طلبگار نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کو یقین آگیا تھا کہ

## ایک وجود کی فنا دوسرے کی بقا

کے لئے لازمی ہے۔ جب تک ہم یہ اجسام اسلام پر نثار اور فدا نہ کریں گے، جسد اسلام مستحکم کائنات نہیں بن سکتا۔ لہذا ان کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں تک میں شوق شہادت کا جذبہ موجیں مارا کرتا تھا اور بارہا دیکھا گیا کہ اُن جنگی میدانوں میں، جہاں بڑے بڑے شیروں، جوانمردوں کا کلیجہ کانپ جاتا ہے، وہاں مسلمانوں کی خانہ نشین نازک کلائیوں والی عورتیں دلیری وبیباکی سے تلوار چلاتی تھیں۔ انسانی خون کے رنگ کی مہندی لگاتی تھیں۔ خاک وخون سے لتھڑے ہوئے کپڑے ان کو اطلسی وحریری لباس کا لطف دیتے تھے اور عرصۂ کارزار کی جگر خراش آہ وبکا اُن کے کانوں میں شیریں نغمے بن کر جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ تکبیروں کے نعرے مارتی ہوئی برچھیوں اور تلواروں کی نوکوں سے رزم گاہ کو درہم برہم کر ڈالتی تھیں۔

یہ ذوق شہادت جس گھرانے کا عطیہ تھا، خدا تعالےٰ نے اسی خاندان کو نمونہ بنا کر دکھایا جس سے شہادت کی اصلی شان نظر آگئی۔ مگر پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں آکر اشیاء کا ظہور دوسری اشیاء کی شہادت یعنی فنا سے ہوتا ہے۔

جنس آدم سے قطع نظر کرکے عناصر اربعہ کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ دیکھیے کہ جب تک ایک وجود فنا نہیں ہوتا، دوسرا وجود موجود و ہستی پذیر نہیں ہو سکتا۔ آگ کی ہستی کو معدوم کرنا ہو تو پانی کا وجود قربان کیجیے۔ پانی کا نشان مٹانا ہو تو آگ کی زندگی خرچ کیجیے۔

بھاپ، جس کے بل پر نئی دنیا کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں، جہاز سمندر میں ہراتے ہیں، یہ کیا ہے؟ اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ پانی کی شہادت و قربانی سے جو آگ کی تپش سے ہوتی ہے، بھاپ کا طلسماتی جسم تیار ہوتا ہے یعنی پانی آتشی حرارت کے خنجر سے ذبح ہو کر اپنا جسم چھوڑ دیتا ہے اور بھاپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دانہ خاک میں ملتا ہے، اپنا نام و نشان مٹاتا ہے تو شگوفہ اور درخت کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ دانہ شہید نہ ہو، اپنی ہستی قربان نہ کرے اور کہے کہ میں کیوں پرائے واسطے اپنے تئیں خاک میں ملاؤں اور برباد کروں تو تمام دنیا بھوکی مر جائے کیونکہ دانہ ہی کی قربانی ہے جس کی بدولت چار دانے پیدا ہوتے ہیں اور انسان و حیوان ان کو کھا کر اپنی زندگی قائم رکھتے ہیں۔

روئی اپنے وجود کی قربانی کرتی ہے تو سوت تیار ہوتا ہے اور آدمی کے تن پوشی کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ سب برہنہ مادر زاد پھرا کرتے یا درخت کے پتوں سے ستر پوشی کرتے۔ مگر اس میں بھی یہ اندیشہ تھا کہ درخت پتوں کی قربانی سے انکار نہ کر دیں۔

کھانے میں صرف دانے کی مثال پر موقوف نہیں ہے۔ دانہ کے بعد شہادت اور قربانی کا سلسلہ دور تک جاتا ہے۔ دانوں کی شہادت سے آٹا ظاہر ہوتا ہے، آٹے کی شہادت سے روٹی نمودار ہوتی ہے۔ روٹی کی شہادت سے پرورش کا

ظہور ہوتا ہے۔ الغرض اسی شہادت کی بنیاد پر سب کارخانہ قائم ہے۔

تیل نہ جلے تو تاریکی کون دُور کرے۔ روشنی کہاں سے پیدا ہو۔ بتی آتشی آرہ سر پر نہ چلوائے تو لوگ اندھیرے میں ٹکراتے پھریں؛ اور ہاں جن کے دم سے سب گھروں میں روشنی ہے اور جن کو حقارت سے تنکا سمجھا جاتا ہے، وہ تو شہادت کی خاص شان رکھتے ہیں۔ اُن کی مقبول شہادت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

## دیاسلائی کی شہادت

پر ذرا تفصیل سے غور کیجیے۔ عجب دردناک قصہ ہے جنگل میں ایک ہرا بھرا درخت لچکدار شاخوں اور نرم نرم پتّوں سے چھایا ہوا کھڑا تھا ایک صاحب گئے اور ایک نئے وجود کے لالچ میں درخت کو شہید کرڈالا۔ اس کے بعد ایک گرم چشمے کے کھولتے ہوئے پانی میں جوش دے کر کھال کھینچ لی۔ پھر مشین کے دوسرے خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔ تیسری مشین نے یہ صورت بھی مٹادی اور چھیل کر پرت بنا دیئے۔ چوتھی نے ان پرتوں کو بھی کتر ڈالا اور دیاسلائی کے ننھے ننھے تنکے بن گئے ان تنکوں کو اول گندھک اور تیزاب کے پانی سے وضو کرایا گیا۔ اس کے بعد بکس کی مسجد میں بھیجدیا۔ اب میاں تنکے بکس کی سیاہ جانماز پر ایک ہی رگڑ دار سجدہ کرنے پائے تھے کہ غیبی خنجر آگ کی صورت میں نمودار ہوا اور تنکے کو شہید کردیا تنکا تو آن کی آن میں جل کر نابود ہوگیا مگر اس کی شہادت ایسی مقبول ہوئی کہ فوراً خانۂ تاریک روشنی میں آگیا مسجد۔ گرجا۔ مندر۔ شراب خانہ غرض ہر مقام نے تنکے کی شہادت سے فائدہ اٹھایا۔

باغ میں تشریف لیجائیے۔ نہر کا پانی درختوں میں آکر جذب ہوتا ہور ہا ہوگا

باغ کی شادابی اسی شہادت پر منحصر ہے۔ پانی قربان نہ ہو تو درخت جل کر رہ جائیں۔

ذرا پھولوں کو بھی دیکھئے۔ کیا بہار ہے۔ توڑ لیجئے۔ یہ نازک ہستی بھی شہادت کا ارمان رکھتی ہے اور وہ یہی ہے کہ آپ ان کو توڑ لیں اور ٹہنیوں کے سایہ سے جدا کر کے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ ہار بنا کر گلے میں ڈالیں۔ چادر بنا کر قبر پر چڑھائیں۔ سہرا گوندھ کر سر پر رکھیں یا شکر ملا کر گلقند بنائیں ہر حال میں خدمت کو حاضر ہیں۔ یہ قربانی سے انکار کرتے تو تفریح کی کتنی کیفیتیں نابود رہتیں۔

ہا۔ مگر آپ بھی کس قدر ناانصاف ہیں۔ ان پھولوں کو شہید کر کے گھر لے چلے تو پتوں کو دونا بنا لیا تاکہ سورج کی تپش سے ان کا جسم کمھلا نہ جائے۔ مگر کربلا میں اپنے رسولؐ کے نواسے کو شہید کر کے دھوپ میں تپنے دیا اور حرم رسولؐ کو جو گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور لطیف تھیں، بے چادر کر کے پھرایا۔ یہ خیال نہ کیا کہ یہ بھی پھول ہیں، مرجھا جائیں گے۔

القصہ نتیجہ ان سب مثالوں سے یہ نکلا کہ شہادت دوسرے کے فائدے کے واسطے اپنا وجود فنا کر دینے کا نام ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کی تمام موجودات میں ضرورت ہے۔ جو شخص اس ضرورت سے انکار کرے وہ گویا تمام بدیہات سے انکار کرتا ہے اور اس کو بصارت و بصیرت سے محروم سمجھنا چاہیئے۔

## شہادت خوشی کی چیز ہے یا غم کی

اب یہاں ایک نہایت باریک اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہادت کارخانۂ عالم میں ایسی مفید اور ضروری شئے ہے تو اس کے سبب ماتم کیوں کیا جاتا ہے غمگینی و افسوس کو اس سے کیا تعلق، آہ و بکا کا اس سے کیا سروکار۔ مگر یہ کچھ ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے جس کا جواب نہ ہو جو چیز شہید ہو رہی ہے اُس کو تو اپنی

موت کا کچھ افسوس اور غم نہیں ہوتا اور نہایت بے پروائی اور اطمینان سے اپنی ہستی مٹانے کو آمادہ ہوتی ہے۔ مگر غیروں کے دل پر اس کی چوٹ کا لگنا فطرتی امر ہے۔ بشرطیکہ ان دلوں میں آدمیت کا حس اور درد شناسی کا مادہ بھی ہو۔ پروانہ اگر شمع کی شہادت دیکھ نہ سکے اور بے چین ہوکر در و دیوار سے سر ٹکرائے تو شمع اور نفس شہادت پر کوئی الزام قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ تو بہت خود غرضی ہے کہ جس چیز نے ہمارے فائدہ کے لیے اپنی جان دے دی اُس کا ہم رنج بھی نہ کریں۔

جو بتی پہلے جل چکی ہوتی ہے اس کا سرا آگ جلدی پکڑ لیتا ہے۔ لیکن کوری اور نئی بتی کو جس نے پہلے آگ کی شکل نہ دیکھی ہو مشکل سے روشن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جن دلوں میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی آگ کا نشان لگا دیا وہ تو عالم کی تمام شہادتوں میں درد محسوس کرتے اور اثر پذیر ہوتے ہیں لیکن جو ازل سے سنگین سرشت پیدا ہوئے ہیں، وہ اس بھید کو سمجھنا کجا سمجھنا چاہتے بھی نہیں۔

شہادت حضرت امام علیہ السلام کے جس قدر واقعات شعرا نے لکھے ہیں اور اُن میں شہیدوں کی بے سروسامانی اور مایوسی کی تصویریں کھینچی ہیں یا اُنکے اہلبیتؑ کی بیقراری و نالہ وزاری کے نقشے دکھائے ہیں۔ یہ سب ہمارے غم کو استوار اور اثر دار کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ ان باتوں کی کچھ اصلیت نہیں ہے حضرت امام اور ان کے خاندان نے شمع سے بڑھکر سکوت و اطمینان ظاہر کیا اور نہایت دلیری و ثابت قدمی سے ظہور حق کے لئے جانیں قربان کر دیں۔

## اسلام میں شہادت کی ابتدا

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ شہادت کیا چیز ہے اور دنیا میں اسی کے بل پر صدہا

کام چلتے ہیں اب یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام میں شہادت کا دور کب شروع ہوا اور کون کون بزرگ درجۂ شہادت کے وارث قرار پاتے؟

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے معرکہ کی لڑائی بدر میں پیش آئی تھی جہاں حضورؐ کے مٹھی بھر صحابہ نے کفار قریش کے دل بادل لشکر کو پیس کر رکھ دیا۔ اس معرکہ میں جو مسلمان شہید ہوئے ان کا مرتبہ بعد کی لڑائیوں کے شہدا سے زیادہ مانا جاتا ہے بلکہ جو لوگ زندہ واپس آ گئے وہ بھی شرکت بدر کا فخر شہدا کی طرح کرتے تھے اور مسلمان ان کے فخر کو تسلیم کر کے ان کی عظمت و بزرگی کو دیگر مجاہدین پر فوقیت دیتے تھے۔ اسی طرح شہادت کا سلسلہ بدر سے احد وغیرہ میدانوں کے سبب جڑ پکڑتا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں آج تک دین کی حمایت و حفاظت میں جان دینا شہادت خیال کیا جاتا ہے۔

مگر مشائخ صوفیہ نے جس شہادت کو سب سے برگزیدہ شہادت مانا ہے وہ فنائے نفس اور فنائے ماسوی اللہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں سب سے بڑی عمر والوں میں حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے اور چھوٹی عمر میں حضرت مولی علیؓ تھے، اور عورتوں میں بی بی خدیجۃ الکبریٰ تھیں جنھوں نے تمام قوم، تمام ملک بلکہ تمام دنیا کو لات مار کے کلمۂ توحید کے آگے سر جھکا دیا اور تمام ملکی، قومی خاندانی تعلقات کو ترک کر کے خنجر سے ذبح کر ڈالا۔

اس شہادت کے بعد دوسری شہادت کا رتبہ حضرت مولی علیؓ کو ادراک حاصل ہوا اور وہ ہجرت کا زمانہ تھا جبکہ کفار نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو آنحضرتؐ نے مدینہ شریف کو ہجرت کرنی چاہی مگر کفار نے گھیر اڈال رکھا تھا جس سے بچ کر نکلنا آسان نہ تھا۔ اس وقت ایک فدائی کی قربانی درکار تھی جو حضورؐ کے بستر پر لیٹ رہے اور حضورؐ کے عوض اپنی جان دیدے

لڑکر مرجانا دوسری بات ہے یوں موت کے منہ میں کوئی نہیں جاسکتا مگر آنحضرت کے قدیمی فدائی علیؓ نے، جو ایک بار شہادت کا رتبہ حاصل کر بھی چکے تھے اس جان جوکھوں خدمت کو قبول کیا اور بستر رسولؐ پر لیٹ گئے۔ ان دو شہادتوں کے بعد حضرت کو تیسری شہادت بھی خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی یعنی ابن ملجم کے خنجر سے زخمی ہو کر شہید ہوئے جو امیر معاویہ کا بھیجا ہوا تھا

لڑائیوں سے قطع نظر، اسلام میں سب سے پہلے شہید عمر فاروقؓ ہیں جو ایک پارسی غلام کے ہاتھ سے مسجد میں شہید ہوئے۔ اُن کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضؓ کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے غلط فہمی سے شہید کر دیا۔ اگرچہ ان کی شہادت محض غلط فہمی کے سبب ہوئی یعنی محمد بن ابی بکر وغیرہ کی جماعت کو ان کی نسبت وہ شبہہ ہوا جس کا ان کو مطلق علم نہیں تھا اور جس میں ان کی بے گناہی کا سب کو اقرار ہے۔ مگر ان کی شہادت نے اس امر کا راستہ کھول دیا کہ خود مسلمان اپنے ہم مذہب لوگوں کو شہید کرنے لگے۔ حالانکہ کفار کے ہاتھوں شہادت کا جام حاصل ہوا کرتا تھا۔

حضرت مولیٰ علیؓ کی شہادت کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے سیدنا حضرت امام حسنؓ کو معاویہ نے زہر دیکر شہید کرا دیا اور پھر ان کے چھوٹے فرزند سیدنا حضرت امام حسینؓ کو کربلا میں لے جاکر مسلمانوں ہی نے بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا اور یہی وہ شہادت ہے جو اسلام میں سب شہادتوں سے زیادہ مشہور، زیادہ پُر درد، زیادہ درجہ والی زیادہ ہر دل عزیز اور نہایت مہتم بالشان چیز مانی جاتی ہے۔ اسی شہادت کی یادگار میں ہم نے بھی اپنے رسالہ کا شہید نمبر نکالا ہے۔

سیدنا و مولانا حسینؓ کی شہادت کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ حالانکہ ان سے پہلے اور ان کے بعد سینکڑوں مسلمان نہایت بے کسی اور بے بسی کے عالم میں

شہید کئے گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو حالات اور واقعات سیدنا و مولانا حسینؑ کو پیش آئے اُن کا سا نہ گذشتہ تاریخوں میں ذکر پایا جاتا ہے نہ بعد کے تذکروں میں اس قسم اور اس طرز کا کوئی واقعہ موجود ہے۔

سیدنا و مولانا حسینؑ کی شہادت میں حسب ذیل خصوصیات تھیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔

حضرت اُس زمانہ میں تھے جبکہ اسلام کا نشوونما تازہ تازہ ہوا تھا اور ہر فرد کے دل میں اپنے مذہب کی محبت ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ خاصکر اپنے رسولؐ کی اُلفت میں ہر مسلمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دل و جان سے آنحضرتؐ پر نثار تھا اور حضورؐ کے تعلق کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مسلمانوں میں بہت بڑے ادب کی مستحق مانی جاتی تھی۔ ایسی حالت اور ایسے زمانہ میں خاص رسولؐ کے نواسے پر مسلمانوں کا یہ ظلم و ستم کرنا کس قدر عجیب تھا اور حضرت مولانا و سیدنا حسینؑ کے دل پر جو صدمہ اُن لوگوں کی بے وفائی و جفا شعاری کا گذرتا ہوگا وہ ہزار خنجر و سنان سے بڑھ کر تھا کہ کل کے دن جو لوگ رسولؐ کے نواسے کی حیثیت سے اپنی آنکھیں میرے قدموں میں بچھاتے تھے، آج وہ میرے سینہ پر پاؤں رکھ کر گلا کاٹتے ہیں۔

(۲) اہل و عیال کی معیت بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ ممکن ہے کہ کسی مقتول کے ساتھ اُس کے خاندان والے بھی ہوں مگر جو حالات سیدنا و مولانا حسینؑ کو بال بچوں کے ہمراہ ہونے سے پیش آئے وہ اور کسی کو ہرگز ہرگز پیش نہ آئے ہوں گے

مختلف سن و سال کی عورتیں، ننھے ننھے بچے اور وہ بھی بیمار جن کو ہر مذہب و قوم نے قابل رحم سمجھا ہے، تین روز بھوک پیاس سے تڑپے مگر حضرت کو بے کسی کے سبب کچھ چارہ کار نہ تھا۔

ہمارے عقیدہ میں اُس وقت خیمۂ امامؑ کی یہ تصویر تھی۔

ظہر کا وقت صحرائے عرب کی تپش، خیمے کی قناتوں سے آگ کی لپٹیں آ رہی ہیں پانی کو بند ہوئے دوسرا دن ہے حضرت امام مستورات کے خیمے میں تشریف لے گئے دیکھا سب کے چہروں پر بھوک پیاس کی شدت سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ ہونٹ خشک ہیں اور آنے والے وقت کے کھٹکے سے سب پر یاس و ہراس کا عالم طاری ہے حضرت نے اپنی ہمشیرہ حضرت زینبؑ سے کہا۔ بہن! اگر تمہاری رائے ہو تو یزید کی بیعت قبول کر لوں کیونکہ مجھ سے تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جاتی اور خبر نہیں میرے بعد تم پر اور کیا کیا ظلم و ستم ہوں بیعت کے اقرار سے یہ مصیبت جاتی رہے گی۔

اکیلے اور بے یار و مددگار بھائی کی زبان سے یہ کلمے سن کر حضرت زینبؓ نے اپنی چادر کے آنچلوں کو الٹ دیا اور بنی ہاشم کے تیوروں میں بے باک ہو کر بولیں۔ بھائی! تم میرا امتحان لیتے ہو۔ ہاشم کے گھر کی لڑکیاں کم ہمت اور ڈرپوک نہیں ہوئیں وہ اپنی آن اور حق کی حمایت میں جان دینی کچھ بات نہیں جانتیں۔ اے بھائی۔ جاہلیت کے زمانہ میں عرب کی عورتیں بچہ کی پیدائش کے وقت سب سے بڑی آرزو اُس بچہ کی یہ کرتی تھیں کہ یہ میدانوں میں تلوار چلانے والا، خون میں نہلانے اور نہانے والا ہو۔ پھر اسلام نے اس جنگی خیال کو شہادت کے درجات بیان کر کے اور بھی مستحکم کر دیا تو کیا ہم میں عرب نسل اور مسلمان ہونے کے باوجود حرارت نہیں ہے۔ یاحسین! میں علیؑ کی بیٹی ہوں۔ جو خون کے میدانوں میں بے پروائی سے گھوڑا دوڑاتا تھا۔ جو دشمن سے ڈرتا نہیں تھا بلکہ شیر کی طرح اپنے پنجوں سے کھلاڑیاں کرتا تھا۔ وہ جو فقر و فاقہ میں بھوک پیاس کو شرافت کا جوہر سمجھتا تھا۔ میں اپنے باپ کی اصل نسل لڑکی ہوں مجھکو عیب نہ لگا میں تیرے سر کو خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھ کر فخر کروں گی کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ حق کی پاسداری میں کٹ کر مر جاتے ہیں اگر تو نے یزید کی بیعت قبول

کرلی تو ہمارے خاندان کے لئے اس سے بڑھکر کوئی ننگ و عار نہ ہوگی کہ ایک فاسق فاجر کی بیعت زندگی کے لالچ سے منظور کرلی۔ میں جانتی ہوں کہ تو میری زندگی کا سہارا ہے تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور ایک فقط مجھ پر کیا منحصر ہے رسول کے خاندان میں ہر شخص تیرے وجود کو اپنا سہارا اور پناہ سمجھتا ہے مگر غریب زینبؑ کے لاچار بھائی! حق بات کی حمایت میں جان دیدے۔ ہمارا کچھہ فکر نہ کر۔ ہم تکلیف و مصیبت کو آسانی سے برداشت کرنے والے لوگ ہیں۔

حضرت زینبؑ کی تقریر ختم ہوچکی تو امام اپنی زوجہ شہربانو کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

تم کہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ بانو نے شرم آلود ادب سے نظریں جھکا کر کہا میں ہر حال میں تابع فرمان ہوں۔ جو میرے مالک کی مرضی ہو اُس کی تعمیل کروں گی۔ اگرچہ میں حضرت زینبؑ کی طرح فخر تو نہیں کرسکتی مگر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ میری پیدایش ایران کے شہنشاہ کے گھر میں ہوئی تھی اور اب بھی ایک شہنشاہ کے گھر میں ہوں پس ایک حرارت والا اور ہمت والا دل میرے سینہ میں بھی حرکت زن ہے۔ نازک وقت میں میری بے صبری کا اندیشہ میری توہین و حقارت ہے۔ اے امام! ان سب بچوں کو جو میری گود کی زینت ہیں بلکہ برسوں کی محنت سے پالا ہے، جن کے دیکھنے سے میری زندگی قائم ہے۔ میدان میں لے جایئے قربان کردیجئے۔ میں بھی قربان اور یہ بچے بھی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ حق کی پاسداری کے خیال کو میرے خیال سے چھوڑدیں۔ چلیئے تاجدار ایران کی لڑکی اپنے شریف خون کا وصف دکھائے۔ میدان میں چلیئے۔ میں رکاب تھام کر چلوں گی اور تیروسنان کے میدان میں آپ کے قدموں پر جان دیدوں گی۔

حضرت امامؑ عورتوں کی اس دلیری سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا شاباش

ایسا ہی خیال رکھنا۔

ان باتوں کے باوجود حضرت امام بشر تھے۔ جوان جوان بچوں کا سامنے کٹ جانا، ننھے ننھے بچوں کا بھوک پیاس سے بلکنا اور اس پر یہ خیال کرنا کہ میرے بعد میرے ناموس کا کیا حال ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بنی ہاشم اور رسولؐ کے گھر کی مستورات کے ساتھ دشمن ناروا بے عنوانی کریں۔

الغرض بال بچوں کی ہمراہی بھی ایک بڑا امتحان تھا جس نے حضرت کی شہادت میں خاص خصوصیت پیدا کر دی تھی۔

(۳) بھوک پیاس میں بہت آدمی شہید ہوئے ہوں گے مگر جو کیفیت حضرت امام اور ان کے خاندن کی تھی وہ کسی کو پیش نہیں آئی۔ پورے تین شب و روز کا بھوکا پیاسا رہنا، گرمی کا موسم عراق کی گرمی، چاروں طرف سے تکلیف کے اسباب گھیرے ہوئے تھے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ بچوں کی زبانیں پیاس کے مارے نکلی پڑتی تھیں اور حضرت امامؑ آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتے تھے۔

آمریکہ کے ایک تشریح داں ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ جب انسان ۲۷ گھنٹہ پیاسا رہتا ہے تو اس کے ہر رونگ میں ایسی تکلیف ہوتی ہے گویا ایک ایک زخم پڑ گیا ہے پس حضرت امامؑ اور ان کے فدائی ۲۷ گھنٹے کامل پیاسے رہکر جب برچھی و تلوار کے زخم کھاتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ایسی دردناک تکالیف کو برداشت کرنا اور امر حق سے قدم نہ ہٹانا شہادت کی اعلیٰ خصوصیت ہے۔

(۴) سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا۔ سوائے ایک طفل بیمار کے کوئی باقی نہ رہا جس سے بقائے نسل کی امید ہو۔ اس پر بھی قول کی حمایت کرنا اور مرنے کو تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے۔

(۵) آخر وقت تک اپنے اشغال و قواعد کو جاری رکھنا اور مصیبت سے حواس

باختہ نہ ہونا بھی خصوصیات امامؑ سے ہے۔ حد ہے کہ سر کٹتے کٹتے نماز پڑھی اور سجدہ ناغہ نہ کیا۔

# اس شہادت کے بعد

اکثر سادات و مشائخ اسی قصور پر شہید ہوئے جو حضرت امامؑ کے ذمہ لگایا گیا تھا یعنی جس طرح یزید بن معاویہ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کی زندگی میں اُس کی بادشاہت پختگی سے نہیں جم سکتی اس لئے کسی بہانہ سے ان کا قصہ پاک کر دینا چاہیئے۔ ایسے ہی حضرت امام کے بعد متعدد اماموں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سب ائمہ اطہار کو ہوس پرست نام کے مسلمان بادشاہوں نے شہید کیا بعض سادات کو ایسی بے رحمی سے شہید کیا گیا کہ ان کی تفصیل بیان کی جائے تو کلیجہ کانپ اٹھے۔ سیدوں کے نازک جسم، جو ریشمی کپڑوں کی طرح نرم اور خوبصورت تھے، اُموی اور عباسی خلفاء نے زندہ دیواروں میں چنوا دیئے اور اُن غریبوں نے پھڑک پھڑک کر جان دے دی۔

حضرت امام حسینؑ اور اُن کی اولاد کے بعد پولٹیکل بدگمانی کی وبا ایسی پھیلی کہ جو شخص عبادت و یاد خدا کے سبب خلقت میں ذرا عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اُس بیچارہ پر آفت آجاتی۔ یا تو جلاوطن ہوتا۔ یا کسی شرعی بہانہ کی آڑ میں قتل کر دیا جاتا۔ اس کی صدہا مثالیں تاریخ کے صفحوں پر موجود ہیں جس میں سے چند اس شہید نمبر میں لکھی گئی ہیں باقی پھر کسی موقع پر بیان ہونگی۔

حضرت شہاب الدین مقتول کو محض ان کے کمالات و تسخیر خلائق کے سبب بیدردی سے مار ڈالا گیا حضرت منصور کو خفیہ منصوبہ باز تصور کر کے دار پر کھینچ دیا۔ سرمد کو آزار کا دردمند یقین کر کے، اور اس اندیشہ سے کہ کہیں سرمد لوگوں کو انتقام کے لیئے

کھڑا نہ کر دے، بے سروپا الزام لگایا گیا اور بے گناہ قتل کیا گیا سیدی مولہ کی ہر دل عزیزی و بزرگی و سخاوت جلال الدین خلجی جیسے نیک سلطان کو بھی کھٹکی اور بیچارے درویش کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔

اب آخر زمانے میں ترکی سلطان کے پیر و مرشد سید ابو الہدیٰ رفاعی کو نوجوان ترکوں نے تاریک کوٹھری میں بند کر کے محض اس جھوٹے شبہ میں مار ڈالا کہ سید صاحب ان کے پولیٹیکل منصوبوں میں حارج تھے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں مسلمان بادشاہوں پر ظلم و سفاکی کا بیجا الزام لگاتا ہوں یا میرے دل میں اسلامی حکومت کی کوئی عظمت نہیں ہے بلکہ مقصود بزرگان دین کی شہادت کا احوال لکھنا ہے۔ اس کے ضمن میں لازمی طور پر قاتل و مقتول کے حق و باطل پر نظر جاتی ہے اور ائمہ اطہار و مشائخ کبار بے گناہ و مظلوم معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ سب تصور شخصی و خود مختارانہ حکومتوں کا تھا جو قاعدہ اسلام کے برخلاف تھیں۔ اس لئے ہر مسلمان خود ایسی حکومت ہی کو سرے سے ظلم و سفاکی کا مظہر خیال کرتا ہے۔ اسلام نے جمہوریت و مساوات کی حکومت قائم کر کے کامل حریت انسانوں کو عطا فرمائی تھی۔ مگر لوگوں نے اپنے ذاتی فوائد کی خاطر اصول اسلامی کو کچل ڈالا اور شخصی بادشاہت قائم کر دی۔

شخصی حکومتوں میں ہمیشہ خود غرض لوگ بادشاہ کے گرد جمع رہتے ہیں اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہوتا ہے اور کٹ پتلی نہ بنے تو کیا کرے۔ اکیلا بشر تمام ملک کی خبر گیری و حفاظت میں مجبور محض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مختار بادشاہ حاشیہ نشین لوگوں کے بہکانے سے خوں ریزیاں اور بے انصافیاں کیا کرتے ہیں۔ ہم کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ خود مختار بادشاہوں میں بعض ایسے دل و دماغ کے تھے کہ ہزاروں آدمیوں کی متفقہ رائے ان کی رائے کے سامنے نکمی اور کمزور ثابت ہوتی تھی۔ لیکن ایک آدمی

سچ ایک ہی ہے ہمیشہ اس کی رائے پر بھروسہ نہیں ہوسکتا۔

جو بزرگان دین خود مختار بادشاہوں کی غلطیوں سے شہید ہوئے وہ سب بے گناہ ومظلوم تھے۔ اس کی نسبت ہم کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مگر جن شہدار کا اس شہیدنمبر میں ذکر ہے وہ یقیناً ناکردہ گناہ شہید کئے گئے۔

غالباً یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ بعض مشایخ کبار نے جب خود مختار بادشاہوں کی دست درازیاں دیکھیں اور ان کو اپنی جان کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں بددعا کی۔ جس سے وہ بادشاہ ہلاک وتباہ ہوگئے۔ مثلاً ہمارے سرتاج سلطان المشایخ خواجہ نظام الدین اولیار محبوب الٰہیؒ کی نسبت جب ناتجربہ کار سلطان قطب الدین خلجی کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت سلطان المشایخ کا وجود پولیٹکل حیثیت سے تیری تاجداری کو نقصان پہونچائے گا تو اس نے آپ کو آزار پہونچانا چاہا۔ اور قریب تھا کہ ایک چاندرات کو حضرت کا آفتاب حیات ابر شمشیر میں پوشیدہ کردیا جائے تو خدا نے حضرت میں اپنی شان قہاری کو ظاہر فرمایا اور حضرت نے گرج کر یہ شعر پڑھنا شروع کیا ؎

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش | باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

یعنی او لومڑی اپنی جگہ کیوں نہ بیٹھی رہی۔ شیر سے پنجہ کیا۔ اپنی سزا دیکھی حضور کا یہ شعر پڑھنا تہا کہ بادشاہ کے ایک منظور نظر غلام نے بادشاہ کا سر کاٹ ڈالا۔ اور اس طرح وہ آہنی پنجہ جو حضرت سلطان المشایخ محبوب الٰہیؒ کی اذیت کے لئے بڑہایا گیا تھا غیب کے فولادی پنجے سے آن کی آن میں شکست کھا گیا۔

اب نئے زمانہ کے مؤرخ اس واقعہ پر طرح طرح کے حاشیے چڑہاتے ہیں مگر ہمارا ایمان یہ ہے کہ خود مختار سلطان کو اور تمام دنیا کو یہ دکھانے کے واسطے کہ کوئی دوسری با اختیار طاقت بھی موجود ہے جو سب طاقتوں وحکومتوں کی

نگران ہے اور زبردست کو زیردست کردینا اس کو کچھ مشکل نہیں۔ یہ واقعہ ظاہر ہوا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کو ظالم کے شر سے بچایا گیا۔

ناظرین! خود مختار بادشاہوں کی حرکات پر اگر انصاف کی نظر ڈالیں گے تو انکو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت انسان انسان نہ تھا بلکہ گھاس پھوس کی طرح پامال زندگی بسر کرنا تھا۔ جس کو ہر وقت جان و آبرو کا خوف دامنگیر تھا۔ آزادی جو ہر آدمی کی فطرت میں رکھی گئی ہے ہمیشہ دل کے قیدخانہ میں بند رہتی تھی۔ زبان اور قلم پر مہر لگی ہوئی تھی کہ آزادی نکل نہ آئے۔ اس میں مذہب کو کچھ دخل نہ دینا چاہیئے۔ کیونکہ خود مختاری ہر ملک۔ ہر مذہب۔ ہر قوم میں یکساں ضرر پہونچاتی تھی۔ اس لئے میرا روئے سخن مسلمان بادشاہوں کی طرف نہیں ہے۔

اس زمانہ میں زیادہ دولت مند ہونا۔ زیادہ بارسوخ ہونا۔ زیادہ خدا پرست ہونا قابل دار جرم تھا۔ کیونکہ اسی قسم کے آدمی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا کرتے تھے۔ مگر آج خدا کے فضل سے جمہوریت و مساوات کا دور ہے آزادی خوش و خرم ہر گھر میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ زیادہ دولت مندی زیادہ عزت کی علامت ہے۔ زیادہ رسوخ ہونا بادشاہ کی نظر میں ممتاز بناتا ہے۔ عبادت و خدا پرستی کی روک ٹوک نہیں ہے بلکہ آزادی اتنی بڑھی ہے کہ شیطان پرستی سے بھی کوئی نہیں روکتا۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا آسمان سے مینہ برساتا ہے تاکہ زمین میں سبزی و غلہ پیدا ہو۔ ہوا چلاتا ہے تاکہ ہم اس کے سہارے زندہ رہیں۔ یا اس نے چاند سورج۔ پانی۔ بجلی۔ وغیرہ چیزیں انسان کے عام فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں اور انکو دیکھکر ہم اپنے محسن اور رحیم خدا کا شکر و حمد بجا لاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اس کا شکر بھی ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے آزادی کی حکومت عطا فرمائی۔ جس کے سایہ میں ہم نہایت بے فکری اور امن سے زندگی بسر کرتے ہیں اور جس طرح چاہیں اور

جس قدر چاہیں خدا کی عبادت کر سکتے ہیں۔ کوئی مخل اور حارج نہیں ہے اب ہماری مذہبی برتری یا تقدس کی عالمگیری سے کسی کو بدگمانی نہیں ہوتی ؛

# اس لئے

اے حجروں اور گوشوں میں رہنے والے بزرگو باہر نکلو اور آزادی سے حق کے نعرے لگاؤ۔ اب منصور و سرمد کی طرح تم کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیگا۔ یہ توپ خانے یہ فوجیں۔ یہ رسالے یہ سنگینیں۔ یہ چھاؤنیاں سب تمہاری ہیں۔ اور تمہارے ہی امن و سکون کی خاطر پہرے جمائے کھڑی ہیں۔ شکر کرو۔ کس کا ؟ آدمی کا نہیں۔ خدا کا۔ جس نے اپنی رحمت سے یہ آزاد حکومت عطا فرمائی ؛

انگریز و ترک۔ افغان و ایران۔ ہند و جاپان۔ سب الفاظ ہیں جن کو دیکھنا تمہاری شان سے بعید ہے۔ تم تو حقیقت و معانی کو دیکھنے والے ہو۔ یہ اشکال و صُور تو تمہارے عقیدے میں نابود و بے حقیقت ہیں ؛

ہاں یہ مت سمجھو کہ حکومت عیسائیوں کی ہے یا موسائیوں کی۔ انگریزوں کی ہے یا افغانیوں کی ہے۔ کالوں کی ہے یا گوروں کی۔ بلکہ طریق حکومت کو دیکھو اس کے اثر و کیفیت کو مشاہدہ کرو۔ کہ اس میں کس قدر راحت۔ آسایش۔ سکون و خاموشی ہے۔ خدا تعالیٰ اس آزادی کو برقرار رکھے۔ اور ہم کو دوسرا درویشی شہادت نامہ لکھنے کے وقت موجودہ وقت میں کوئی ظاہری واقعہ نہ ملے۔ اور مجبور ہو کر باطنی شہادت کی طرف رجوع کریں جو شہادت اکبر ہے اور جس کا حاصل کرنا ہر صوفی کا مقصود حقیقی ہے ؛

---

نوٹ :۔ یہ مضمون فلسفۂ شہادت کے نام سے علیحدہ رسالہ میں بھی شائع ہوا ہے جو ہر سال محرم میں بکثرت تقسیم ہوتا ہے یہ نظام المشائخ کے شہید نمبر میں شائع ہوا تھا۔ حسن نظامی۔

# مستانہ بزم مولود

## نئے الفاظ میں پرانے مطالب

از رسالہ نظام المشائخ دہلی

دن آ گئے کہ ہم فراق کی راتوں سے رخصت ہوں۔ ربیع الاول کا چاند عرب کے افق سے بلند ہونے کو ہے۔ آؤ سب ملکر اس کو دیکھیں اور چشم منتظر کو ٹھنڈا کریں۔

سارا جہان اس ماہِ مبارک میں اس پاکیزہ وجود کے میلاد کا ذکر کرے گا جو تمام موجودات کے وجود کا سبب ہے۔ ہم بھی جہان میں ہیں۔ کیوں نہ ایک بزم میلاد منعقد کریں ؛

نظام المشائخ کے اوراق کا فرش بچھا دو۔ حروف کے نقش ونگار سے محفل کو آراستہ کردو۔ اور صدائے مستانہ سُنو ؛

ہم اپنی محفل میں اغیار کو نہیں بلائیں گے۔ نہ کوئی اس قابل ہے کہ اس شاندار بزم میں مدعو ہو سکے۔ رقعہ خدا کو گیا تھا اور اس سے درخواست کی گئی تھی کہ ہماری مجلس کی صدارت قبول فرمائے اور اپنی مرضی سے جسکو چاہے شرکت جلسہ کی دعوت دے۔ سو اس نے لوح محفوظ کے چکنے کاغذ پر مطبع وحی میں حسب ذیل اعلان چھپوا کر اخبار القرآن میں شایع کردیا ؛

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ؕ

"خدا اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود پڑھتے ہیں۔ تم بھی اے ایمان والوں اسپر درود سلام بھیجو" ؛

چونکہ القرآن کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ بیشمار اہل ایمان اس بزم درود وسلام وذکر خیر الانام کی شرکت کے لئے جمع ہو گئے اس وقت صدر انجمن صاحب جل جلالہ وعم نوالہ کرسی لامکان پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنی افتتاحی تقریر آواز ہو میں شروع کی جو یہ تھی:۔

فرشتوں! اور جینٹلمین (ایمان دار آدمیوں)! میں خوش ہوں کہ تم سے آج کے دن شان تعین میں خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تمہاری کوئی بزم ایسی نہیں ہے، جو میرے دائرہ وجود سے باہر ہو۔ مگر یہ محفل ایک خاص محفل ہے جسمیں علانیہ میری تجلی تم سے ہمکلام ہوتی ہے۔ آج کے جلسہ کی غرض یہ ہے کہ ہم سب اسم کثرت کی شان میں اس نور کا ذکر کریں جو ہماری ذات وحدت مآب کا ذکر بشکل حمد وثنا میں تھا جسکو ہم نے احمدؐ بھی کہا اور محمدؐ بھی ؛

میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ کس کا ذکر کیونکر کیا جائیگا۔ سنو سنو۔ ہر وجود اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے اس کا ذکر کرے۔ مگر ہم کبریائی کے مالک ہیں سب کچھ ہمارا ہے سب کچھ ہم میں ہے۔ سب کچھ ہم سے ہے۔ اور سب کچھ ہم ہیں۔ اسلئے ہمارا ذکر صرف ان الفاظ میں ہوگا ؛

اے کملی اوڑھنے والے اُٹھ۔ رات کو ہماری یاد کر۔ لوگوں کو ہدایت کا رستہ بتا۔ ہماری شان سے ان کو آگاہ کر۔ مانگ۔ تجھ کو دیا جائیگا۔ بول اس کو سنا جائیگا سفارش کر۔ قبولیت ہوگی۔ اے اندھیری رات کی مثل سیاہ گیسو والے۔ اے صبح کی روشنی کی مانند منور چہرے والے میں تجھ کو پسند کرتا ہوں۔ تو ازل سے ابد تک میرا ہے۔ تجھ پر میرا سلام ؛

فرشتوں! تمہارا ذکر یہ ہے کہ اس آدم زاد کو سجدہ کرو۔ مومنوں! تم اس کے احکام

کی اطاعت کرو۔ یہی تمہارا ذکر ہے۔

جب حضرت قدس اپنا ایڈریس ختم کر چکے تو ایک گدڑی پوش مست کھڑا ہوا اور جھوم جھوم کر کہنے لگا۔

جناب باری اور دیگر یاران خرابانی! میں دیوانہ ہوں اور عقل و خرد سے بیگانہ۔ اجازت دیجیے کہ میں اپنے ممدوح کا ذکر اس قاعدہ اور ضابطہ سے نہ کروں جس کا مجمل خاکہ پریسیڈنٹ صاحب نے قایم کرکے دکھایا ہے بلکہ ذوق و شوق اور ولولے میں جو چاہوں کہہ جاؤں۔ چیرز (نعرۂ حق) امید ہے کہ آنریبل چیرمین مجھ ذرہ بمقدار کی گستاخی و بے ادبی سے ناراض ہو کر طلوعاً جھولاً سے زیادہ کوئی اور دوسرا خطاب تجویز نہ فرمائیں گے خندہ اور زور شور سے چیرز (نعرۂ حق)

میں حضرت سبحانی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنی دعوت نامہ میں جس نبیؐ پر درود وسلام بھیجنے کا ذکر ہے وہ کونسا نبی ہے۔ کیا وہ جس کا خاکی وجود سب سے پہلے بنا۔ اور جس کے متحرک ہونے کیواسطے خود ذات ربانی نے اپنے دم کو بلایا۔ اور آدم کے حکم کو سنکر سب موجودات نے اس پیکر خاک کو آدم کا لقب دیا۔ یا وہ جسکو نوحؑ کہتے ہیں۔ جس نے حضرت کی شان قہر کو طوفان آب پر علانیہ جنبش کرتے دیکھا۔ یا نبی مراد آپ پر قطعاً ایمان لانے والے ابراہیمؑ ہے ان سے ہی یا جنہوں نے طور پر راز و نیاز کے کلام کے بعد ذرا بیباکانہ جرأت پردہ اٹھانے کی کی تھی۔ یا نبی کا لفظ ابن مریم کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ جو آپ کی حیران کرنے والی نشانیوں میں ایک نشانی تھے۔

اگر یہ سب نہیں تو کیا وہ یتیم جو آمنہ کی آغوش میں پلا۔ وہ جو چھوٹے سے قد پر لمبے لمبے بال بکھیرے لکڑی ہاتھ میں لئے بکریاں چراتا تھا۔ وہ جو کمبل اوڑھ کر آیا اور دوشالہ اڑھا کر گیا۔ جس نے جو کا آٹا کھایا اور گیہوں کا کھلایا؟

پروردگارا! ہمیں بتا۔ کیا وہی جو امن میں شبیر کی طرح شیریں اور صاف اور جنگ میں

شیر کی مانند دلیر وصف شکن تھا۔ کیا وہی جو نیزہ و شمشیر کا مالک اور میدان کارزار کی رونق تھا۔ جس کی پشت دشمن نے کبھی نہیں دیکھی۔ جسکا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ جس کو آپ کی گورنمنٹ نے خلق عظیم کی ڈگری عطا فرمائی۔ وہ جو غریبوں۔ بیکسوں۔ لاوارثوں کا دلی دست پرست تھا۔ وہ جو مدینہ کی گلیوں میں معمولی آدمیوں کی طرح چلتا پھرتا تھا۔ آہ۔ آہ آہ۔ وہ تو نہیں جس کی آنکھوں کی یاد نے ہم کو آنسوؤں کے دریا میں ڈبو رکھا ہے؟

اگر وہ ہے تو ہم کو اجازت دیجائے کہ اس کی محبت کا جام سر جلسہ نوش کریں رحیم زر اور اس دربار میں جتنے مجھ جیسے مستانے ہیں ان کو رخصت ملے تا کہ ؎

خراباتیاں مے پرستی کنند
محمدؐ بگویند و مستی کنند

رند خراباتی اس قدر گفتگو کرنے پایا تھا کہ محفل میں گردش پیدا ہوئی اور عاشقان سوختہ تڑپنے لگے۔ تجلی کی بجلیاں چمکنے اور کڑکنے لگیں۔ اور ہوا جو ہوا۔ بیچارہ حسنؔ کی مجال نہیں کہ اس سے زیادہ اس محفل کی نسبت زبان کھولے ؎

# صاحب بزم میلاد کے اخلاق

اس مستانہ و بیباکانہ بیان کے بعد بزم میلاد کے سالکانہ طریق کو ادا کیا جاتا ہے جس میں میرے عقیدے میں سب سے زیادہ مفید اور ضروری صاحب میلاد کی اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ ہے۔ جن کو احادیث کی معتبر روایتوں سے اخذ کر کے لکھا جاتا ہے ؎

جس طرح ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے اسی طرح ان کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ یہ ارشاد ہوا۔ انک لعلی خلق عظیم تمہاری پیدائش اے محمدؐ

بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حُسن خلق محمدی شاندار چیز ہے۔ کہ حضور رسول مقبولؐ کے اعلےٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حسن خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کو ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے؛

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں۔ ابو داؤد اور ترمذی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سب سے بھاری چیز جو میزان اعمال میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی۔ ایک دفعہ کسی نے حضورؐ سے دریافت کیا۔ دین کیا چیز ہے؟ فرمایا۔ خوش خلقی۔ اس شخص نے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا؛

ایک اور آدمی نے دریافت کیا۔ اعمال میں افضل کیا چیز ہے؟ فرمایا حُسن خلق۔ کسی نے عرض کیا۔ باعتبار ایمان افضل کون ہے۔ فرمایا۔ جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ کے بیان کیا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلقِ حسن میں بڑھ جاؤ۔

حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر یوں دعا فرمانے تھے اللھم احسنت خلقی فحسن خلقی الٰہی تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا؛

دریافت کیا گیا۔ بندہ کو سب سے اچھی چیز کیا دی گئی ہے؟ فرمایا۔ خلق حسن۔ دنیا کی

جگہ فرمایا۔ قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلا دیتی ہے جس طرح دھوپ برف کو فرمایا۔ کوئی تدبیر عقل کے موافق نہیں ہوتی۔ مگر خوش خلقی ؛

# صلح اور جنگ میں خلق محمدیؐ

ایک دفعہ رسول اللہؐ نے خواب میں دیکھا کہ میں مسلمانوں کے ساتھ کعبہ کا حج کر رہا ہوں یہ خواب دیکھ کر زیارت کعبہ کا شوق ہوا اور مسلمانوں کی ایک جمعیت لے کر زیارت کعبہ کے لئے روانہ ہوئے لیکن جب مکہ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کفار نے لڑائی کی تیاریاں کی ہیں۔ رسول اللہؐ نے پیغام بھیجا کہ میں لڑنے نہیں آیا زیارت کرنے آیا ہوں۔

کفار مکہ میں ضد اور جہالت زیادہ تھی اس لئے رسول اللہ صلعم نے مکہ والوں کے پاس حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ خبر آئی حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ حضور کو بہت صدمہ ہوا اور حضور ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا کر کہا آج تم میں سے کون کون مرنے کی بیعت کرتا ہے ؟

سب مسلمانوں نے رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہم سب مرنے کا عہد کرتے ہیں ہم سب کو موت پیاری ہے اس پر وحی آئی کہ خدا ان مسلمانوں سے بہت خوش ہوا جنہوں نے محمدؐ سے درخت کے نیچے مرنے کی بیعت کی اسی واسطے اس بیعت کو بیعت رضوان کہتے ہیں کہ اللہ کی رضا اس بیعت سے حاصل ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد عروہ بن مسعود ثقفی کفار مکہ کی طرف سے صلح کا پیغام لایا اور معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں ہوئے۔ رسول اللہؐ نے صلح منظور کر لی اور صلح کی شرطیں دریافت کیں۔ شرطیں بہت سخت تھیں مسلمان ان کو سن کر بگڑ گئے مگر رسول اللہؐ نے ان شرطوں کو قبول کر لیا۔

شرائط یہ تھیں کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں. پھر اگلے سال آئیں تو ہتھیار لگا کر نہ آئیں. مکہ سے جو آدمی مسلمان ہو کر مدینہ میں جائے اس کو واپس کر دیا جائے اور مدینہ سے جو آدمی بھاگ کر مکہ میں آئے اس کو ہم نہیں دیں گے. مسلمانوں نے بگڑ کر کہا کیا ہم تمہارے دبیل ہیں جو یہ شرطیں مان لیں؟ مگر رسول اللہؐ نے فرمایا مجھے یہ شرطیں منظور ہیں
جس وقت رسول اللہؐ کے حکم سے حضرت علیؑ نے عہد نامہ لکھا تو اس میں یہ بھی لکھا کہ یہ عہد نامہ محمد رسولؐ اللہ کی طرف سے ہے. کفار نے کہا ہم تم کو رسول اللہؐ نہیں مانتے یہ لفظ نہ لکھو. رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا رسول اللہؐ کا لفظ کاٹ دو. حضرت علیؑ نے کہا میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا. آخر خود حضرت نے رسول اللہؐ کا لفظ مٹا دیا.
اس صلح کی میعاد ختم ہونے کے بعد آخر رسول اللہؐ مسلمان فوجوں کے ساتھ اس مکہ میں داخل ہوئے جہاں سے اُن کی قوم نے اُن کو جلا وطن ہونے پر مجبور کیا تھا اور بے کسی کی حالت میں چھُپ کر وطن سے نکلے تھے. آج اس دشمن وطن کے چھوٹے بڑے دم بخود کھڑے تھے. کہیں کہیں مقابلہ بھی کرتے تھے مگر زیادہ خونریزی نہیں ہوئی.
نماز کے بعد رسول اللہؐ نے تمام کفار مکہ کو مخاطب کر کے ایک ایسی مؤثر تقریر کی جو آج تک یادگار ہے حضورؐ نے دیکھا کہ وہ سب دشمن جنہوں نے تیرہ برس رسول اللہؐ کو ستایا تھا سامنے موجود ہیں. رسول اللہؐ نے اُن کو دیر تک دیکھا اور اس کے بعد اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟
کفار اپنے انجام کے خیال سے لرز گئے اور انہوں نے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا اَنْتَ اَخٌ کَرِیْمٌ وَّ اِبْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ. تو ہمارا شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا ہے. بیشک! ہم نے تجھ پر بہت ظلم کئے ہیں. لیکن تیری شرافت سے امید ہے کہ تو ہم کو معاف کر دیگا اور اگر سزا دے تو ہم اسی لائق ہیں. اس جواب کے بعد کچھ دیر سناٹا رہا.
اس کے بعد رسول اللہؐ نے بلند آواز سے فرمایا "تم سب آزاد ہو. آج کے دن تم پر کوئی

الزام نہیں ہے۔ میں نے سب کو معاف کر دیا۔" یہ فقرہ سن کر کافروں کی گردنیں شرم اور ندامت سے جھک گئیں اور رسول اللہؐ نے آسمان کو دیکھنا شروع کیا۔ گویا وہ خدا سے عرض کرتے تھے کہ میں نے تیرے منشا کے موافق یہ فیصلہ کیا ہے۔

جب ہزاروں قیدی رسول اللہؐ کے سامنے پیش کئے گئے تو ان میں ایک عورت نے کہا میرا نام شیماء ہے اور میں آپ کی دودھ بہن ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس کا کیا ثبوت ہے؟ انہوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھادی کہ بچپن میں ایک دفعہ آپ نے یہاں کاٹا تھا۔ اب تک دانتوں کے نشان ہیں۔ رسول اللہؐ یہ نشان دیکھ کر رونے لگے اور فرمایا تو سچی ہے۔

رسول اللہؐ نے اپنی چادر بچھادی اور بہن کو اس پر بٹھایا اور بہت محبت سے باتیں کیں اور بہت سے اونٹ اور بکریاں انعام میں دیں۔ پھر فرمایا۔ بہن اچھا ہو میرے ساتھ چلکر رہو ورنہ تمہارے گھر پہنچا دوں۔ انہوں نے اپنے گھر جانا چاہا۔ رسول اللہؐ نے بھجوا دیا اور اس خاندان کے بہت سے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا۔ شیماء حضرت دائی حلیمہ کی بیٹی تھیں جن کا رسول اللہؐ نے دودھ پیا تھا اور ہوازن کی لڑائی میں گرفتار ہوئی تھیں۔ مکہ فتح ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ چلے آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔

## درویشی مرکز

(از نظام المشائخ جون ۱۹۱۰ء)

آج کل ہر قوم اپنے استحکام اور قرار وجود کیلئے ایک مرکز قایم کر رہی ہے۔ مسلمانوں کا قومی و دینی مرکز تیرہ سو برس سے عرب میں موجود ہے۔ ہر فرقہ اور ہر عقیدے کا مسلمان مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کو اپنی ہستی کی قرارگاہ سمجھتا ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ اس عام مرکز کے علاوہ اپنے مشرب وطریقہ کے جداگانہ مرکز بھی ہوں جو مرکز اعلیٰ کی شاخیں تصور کی جائیں۔

مثلاً علمی حیثیت سے مسلمانوں کا دینی مرکز ندوہ قرار پایا ہے۔ اور دنیاوی علی گڈھ تو مناسب ہے کہ درویشی مرکز اجمیر شریف مقرر کیا جائے۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ سب سلسلوں سے فروغ رکھتا ہے۔ اور قادریہ و سہروردیہ خاندان بھی بوجہ قربت خاص کے اس ملک میں چشتیوں کے دست و بازو ہیں۔ ان دونوں سلسلوں کو اجمیر شریف کے مرکز بنانے میں ہرگز تامل نہ ہوگا رہ گیا نقشبندیہ طریقہ۔ اس کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ اس خاندان کے مشائخ سرہند کے مقابلہ میں اجمیر شریف کو ترجیح نہ دینگے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ حضرات نقشبندیہ ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ خواہ نخواہ تین سلسلوں سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ بنائیں گے۔ کیونکہ ان میں خدا کے فضل سے بڑے بڑے فاضل اور روشن خیال بزرگ موجود ہیں۔ جو مرکز کی اہمیت اور اجماع کی خوبی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ بس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہم مشرب بھائیوں کا اس معاملہ میں ساتھ چھوڑ دینگے ۔

اجمیر شریف کو مرکز بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کے سجادہ نشین کو سب مشائخ ہند کا پیشوا تسلیم کر لیا جائے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ چونکہ اجمیر شریف میں سب سلسلوں کے مشائخ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا جو بات تمام طبقہ صوفیہ کے مفاد کی پیش آئے وہ اجمیر شریف کے مقام پر مشائخ کے مشورہ میں لائی جائے اور اس اجماع سے جو فیصلہ ہو وہ سارے ملک میں عملدرآمد کے قابل تسلیم کیا جائے ۔

مرکز کی ضرورت پر وضاحت کے ساتھ لکھنا بجائے خود ایک طویل گفتگو کا محتاج ہے جس کا یہ وقت اور موقع نہیں ہے۔ مشائخ نے خواہش کی تو آیندہ اس کی تشریح کردیجائیگی میرا تخیل عرصہ دراز سے درویشوں کی مرکزی ضرورت پر گردش کھا رہا ہے اور اس کے متعلق میرے دل میں طوفانی ولولے ہیں۔ میرے لئے وہ دن سب سے بڑا اور مبارک ہوگا جبکہ میں اپنے مرکزی تخیل کا مجسمہ سرزمین ہند پر دیکھوں گا۔ یا میری روح اپنے مقام پر اس کو محسوس کرے گی ۔

میں جانتا ہوں کہ مشائخ میں ابھی یہ احساس بہت کم پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی ہستی کا خرقہ صحرائے زمانہ کے خاروں سے محفوظ کرنے پر مائل ہوں۔ تاہم مایوس نہ ہونا چاہئے۔ آگاہ کرنے سے آگاہی ہوتی ہے۔ فریاد کرنے سے داد ملتی ہے یہ ہماری پراگندگی کا باعث ہے کہ دوسرے فرقے ہم کو ٹھکراتے ہیں اور زیر و زبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس دن ہم ایک مرکز پہ جمع ہو کر اپنے وجود کو مستحکم کر کے دکھائیں گے۔ پھر کس کی مجال ہے جو ہم کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

# رام اپدیش

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۰ء)

ہندوؤں کے مشہور و معروف مذہبی پیشوا سری رام چندر جی کے عارفانہ کلمات یوگ بسشٹ سے محض ناظرین نظام المشائخ کے ملاحظہ کے لئے ترجمہ کرتا ہوں۔ تاکہ ہمارے مشائخ و فقراء کو ہندوؤں کے مقتداؤں کی روش سے آگاہی ہو۔

حسن نظامی

ایک جلسے میں جہاں راجہ دسرتھ رام چندر جی کے باپ اور باشسٹ جی ان کے گرو استاد اور بسوامتر جی اس زمانہ کے نامور عارف بزرگ موجود تھے اور رام چندر جی کی عمر صرف ۱۶ برس کی تھی انہوں نے یہ تقریر کی :-

## دُنیا کی بُرائی

دنیا ناپائدار ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے مرتا ہے۔ مال اسباب جو دُنیا میں ہیں بلا اور محنت کے سبب ہیں۔ اس کی زندگانی کچھ خوشی اور آرام کی چیز نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ دنیا دار اسے آرام کا گھر سمجھتے ہیں۔ دیکھو۔ عورت۔ مال متاع اور سب دنیا کی موجودات ایک دوسرے سے میل نہیں رکھتے۔ جس طرح لوہے کی سیخیں اکٹھی باندھی جائیں تو چپاں

نہیں ہوتیں۔ پس دنیادار کیونکر یہ کہہ کر اسباب دنیا سے اصلی جوڑ ملا سکتا ہے کہ فلاں چیز میری اور امکا ڈھکا میرا ہے ؛

**میں نہیں جانتا کہ کون ہوں** اور یہ تمام عالم جو دیکھنے میں آتا ہے کس چیز سے ظہور میں آیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ بے حقیقت ہے۔ مگر موجود نظر آتا ہے۔ اس سے نہ کسی کو نفع ہے نہ نقصان۔ وہ چمکتی ریت کی طرح ہے جو پیاسے کو دھوکا دے مگر نہ پیاس کو بجھا سکے اور نہ اس میں ڈوب سکے۔ وہ گھر جو مال اسباب سے بھرا ہوا ہے مگر حقیقت اور معرفت کی مایا سے خالی ہے۔ آرام کی جگہ نہیں ہے۔ جیسے وہ غریب آدمی خوش نہیں رہ سکتا جس کے اولاد بہت ہو حالانکہ اولاد انسان کے دل کو خوش کرتی ہے ؛

دولت سب کو پھسلاتی ہے مگر کہیں ٹھہرتی نہیں۔ اور کسی کو حقیقتاً خوش حال نہیں کرتی۔ عیب و ہنر کے بغیر دیکھے جہاں جی چاہا مقام کر دیتی ہے۔ تو اس سے اخلاص پیدا کر کے سانپ کو دودھ پلاتا ہے۔ ایک دن یہ سانپ تیرے دودھ سے پلے ہوئے زہر کو تیرے ہی مار ڈالنے میں خرچ کرے گا ؛

آدمی جب تک مفلس ہے۔ سب سے ملکر اور جھک کر چلتا ہے۔ مگر دولت ملتے ہی اپنے بیگانے سب سے بگڑتا ہے اور پتھر کا دل بنا لیتا ہے۔ جیسے ہوا نرم برف کو پتھر بنا دیتی ہے دولت دل کی صفائی اور روشنی کو گدلا کر دیتی ہے جیسے یاقوت مٹی میں رکھنے سے بے آب ہو جاتا ہے ؛

## زندگی

زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ پتے کی نوک پر رکا ہوا پانی کا قطرہ مضبوط ٹھکانہ میں نہیں ہے پس تو بھی اپنی زندگی کو پائدار مت سمجھ ؛

جس طرح ہوا کو پکڑ نہیں سکتے۔ جواہرات کی چمکدار کرنوں کو ایک لڑی میں پرو نہیں سکتے اسی طرح ابدی زندگانی بھی تیرے اختیار میں نہیں ہے۔

زندگی معرفت الٰہی کی پناہ میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ ظاہری زندگی جانور اور گھاس پھوس بھی رکھتے ہیں مگر حقیقی زندگی اسی کو ملتی ہے جو حقیقت کی معرفت حاصل کرتا ہے ؎

بڑھاپے سے ایک قدم چلنا دوبھر ہے۔ مگر تو زندگانی کی ترقی ہی چاہے جاتا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بوڑھا گدھا جب بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہے تو جنگل میں اکیلا نکال دیا جاتا ہے ؎

## دل

دنیا کے دھندوں کے سبب دل بزرگوں کے طریق پر نہیں ٹھہرتا۔ جس طرح پرندکے پر ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ دل کتے کی طرح ہر آواز پر لپکنا چاہتا ہے اور اچھائی برائی میں تمیز نہیں کرتا ؎

وہم بھرا دل آگ سے زیادہ پُرسوز ہے کہ اس کو پکڑ نہیں سکتے۔ پہاڑ سے زیادہ بلند ہے جس پر کوئی چڑھ نہیں سکتا۔ ہیرے سے زیادہ سخت ہے جس کا توڑنا مشکل ہے۔ سمندر کی سطح آب پر چل سکتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر اس کی تہہ کا پانی نکال سکتے ہیں لیکن دل کو مغلوب نہیں کر سکتے ؎

پریشان کرنے والے خطرے اور واہی تباہی خواہشیں سب دل کی بیماری کے سبب ہیں۔ اس بیماری کا علاج گرو کی صحبت میں ہے اس کو حاصل کر ؎

## حرص

ترشنا یعنی حرص اندھیری رات کے منحوس اُلوؤں کی طرح دل میں ارمانوں کو جمع کرتی ہے۔ اور اس طرح آخرکار اس کو ویران کر دیتی ہے ؎

دل کے پاک اور سُریلے جذبات کو حرص اس طرح برباد کر دیتی ہے جیسے چوہا رباب کے تار کتر کر اس کو بیکار کر دیتا ہے ؎

جو حرص کی آگ میں جلکر مرا ہے اُسکو آبحیات میں ہزار بار بھی غسل دیں تو وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

جو شخص اپنی دانست میں دنیا کے تمام کاروبار سے آزاد ہو کر بیٹھا ہو۔ حرص پہلے اُسی کو شکار کرنا چاہتی ہے۔ حرص آدمی کیلئے اندھیری رات ہے جس میں ہزاروں خطرے بھرے ہوئے ہیں۔ اور انسان کے دل میں اس کے سبب ہر وقت فکر و اندیشہ رہتا ہے ؛

حرص کھُلی آنکھ کو بند کر دیتی ہے۔ حرص گھر گھر کی ٹھوکریں کھلواتی ہے۔ حریص آدمی سے کوئی خوش نہیں ہوتا۔ جیسے بوڑھی عورت کو دیکھنے سے کوئی آنکھ خوش نہیں ہو سکتی ؛

حریص آدمی اس ناچنے والی کے مثل ہے جو اپنے ناچ کے سب بھاؤ اور کمالات ایک ہی وقت میں ادا کرنے چاہے۔ اور ایک بھی پورے طور پر ادا نہ کر سکے ؛

حرص جسم کے ظاہری اعضاء سے بھی کام لیتی ہے۔ اور باطنی اعضاء سے بھی۔ اور اسکی حکمرانی میں تھوڑے ہی دن بعد یہ سب اعضا بیکار و معطل ہو جاتے ہیں ؛

حرص شریف آدمیوں کو اس طرح اپنی طرف مائل کرتی ہے جیسے حسین عورت۔ متقی و پاکباز مرد کو۔ اور سورج کی گرم شعاع نیلوفر کے نرم و نازک پھول کو ؛

آدمی کیسا ہی عقیل اور پہاڑ کی طرح بھاری بھرکم ہو حرص کے سامنے سوکھی گھانس کا تنکا بن جاتا ہے ؛

# استقبال رسول صلعم

(از نظام المشائخ ماہ مارچ ۱۹۱۱ء)

السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا حبیب اللہ۔ السلام علیک یا شفیع المذنبین۔ السلام علیک یا رحمۃ للعلمین۔

غریبوں کا سلام لیجئے۔ گنہگاروں کا مجرا قبول فرمائیے۔ بے کس و لاچار امت کے خیر مقدم پر نظر توجہ ڈالئے ؛

آج اوراق نظام المشائخ کے پلیٹ فارم پر ہم سب آپ کا استقبال اور خیر مقدم کرنے

حاضر ہوئے ہیں۔ یہ ایک طرف آپ کی غریب امت کھڑی ہے۔ دوسری جانب عیسائی۔ ہندو۔ آریہ ہیں جو تہنیت کے گلدستے پیش کرنے چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے حاکم کے سامنے استقبال کے وقت اپنی ضروریات ظاہر کیا کرتے ہیں۔ گزشتہ کارناموں کو سناتے ہیں۔ موجودہ حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور پھر اظہار رائے کے طلبگار ہوتے ہیں۔ دادرسی و مراعات و انعامات کا یہی موقع سمجھا جاتا ہے۔ لہذا ہم بھی ہندوستان کے پردیس میں اپنے دین دنیا کے بادشاہ کا استقبال کرنے وقت رسم زمانہ کے موافق عرض حال کرنا ضروری سمجھتے ہیں ؛

سرکار والا تبار! جو زمین اس وقت ہم سب کے زیر قدم ہے۔ چھ سو برس تک ہمارے زیر نگیں رہ چکی ہے۔ یہاں ہمارا تاج تھا۔ یہاں ہمارا تخت تھا۔ سکہ بھی ہمارا تھا۔ شان و عزت بھی ہماری تھی۔ تلوار کے بل پر آئے تھے۔ تلوار کے بل پر رہے تھے ؛

ہم نے اس ملک میں خدا کے بندوں پر محبت و انصاف سے حکومت کی۔ حضور کے ارشاد کے موافق رعایا کی خبر گیری و حفاظت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ آج تک ہمارا عہد خوشی راحت اور فارغ البالی کا عہد سمجھا جاتا ہے ؛

جہاں پناہ یہ سنکر کمال درجہ مسرور ہوں گے کہ یہ ملک علوم الہیہ کے قبول کرنے اور ان میں جی لگا کر مصروف ہونے میں خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں بھی اگلے زمانہ میں توحید کا چرچا رہ چکا ہے۔ اس خطہ میں بھی خدا تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں سری رامچندر جی دسری کرشن جی وغیرہ مہاتما بدھ کے ذریعہ کلام حق بھیجا تھا۔ جو تمادی ایام کے سبب اور نفس و شیطان کی شرارتوں کے باعث خلط ملط ہو گیا ؛

ظل سبحانی کی سمع اقدس میں یہ واقعہ پیش ہونا ضروری ہے کہ اس ملک کی آسمانی کتاب وید میں وحدت الٰہی کا یہ کلمہ ارشاد ہوا ہے ایکو برہم دوتیو ناستی۔ جس کا عربی مفہوم لا الہ الا اللہ ہے۔ اسی وید کے ایک حصہ اتھرون وید میں حضور عالی کی نسبت

اسی طرح کی پیشین گوئیاں ہیں جیسی زبور۔ توراۃ۔ اور انجیل میں پائی جاتی ہیں ؎

جب ہم غلامان رسالت اس دیار میں وارد ہوئے اور حضور عالی کا پیام یہاں کے باشندوں کو سنایا تو وہ جوق جوق آئے اور آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ چنانچہ اس وقت کروڑوں آدمی ایمان لانے والوں میں موجود ہیں ؎

اب ہم موجودہ دور کا فسانہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ نہایت شرم کے ساتھ۔ نہایت ندامت و پشیمانی کے ساتھ یہ الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں کہ ہمارا چہہ صدی کا تاج لٹ گیا تخت الٹ گیا۔ ہمارے محل اور قلعے غیروں کے پاس چلے گئے۔ اب ہم رات کی روٹی کو محتاج ہیں ہماری رعیت ہم پر ہنستی ہے۔ ٹھوکریں مارتی ہے۔ ریشمین قباؤں کے بدلے ہم کو میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے بھی میسر نہیں آتے ؎

ہماری حرارت برباد ہوگئی۔ ہماری غیرت تباہ ہوگئی۔ اب رسوائی و ذلت کی کوئی حد باقی نہیں رہی ؎

آج جہاں پناہ کے حضور میں ایک شکستہ حال امت کھڑی ہے۔ جو کل تاجدار تھی۔ باوقار تھی۔ آج وہ لوگ آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو کشمکش کے میدان میں بے یار و مددگار ہیں۔ جن کا خدا کی ذات کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔

قدرت نے انگریزی قوم کو ہمارا نگراں بنایا ہے جو چاہتی ہے کہ ہم زبونی و خرابی کے غار سے ہمت کر کے باہر نکلیں۔ مگر زخموں کی تکلیف اور فاقوں کی ناتوانی کے سبب ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اب گردش کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اب ہم پھر اقبال و دولت کے سایہ میں پہونچنے والے ہیں۔ کیونکہ آپ کا دیدار۔ آپ کے اوصاف و اطوار کا دیدار۔ ہم سب کی ظاہری و باطنی مصیبتوں کو دور کرنے والا ہوگا ؎ آمین ؎

# دربارِ رسولؐ

(از نظام المشائخ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء)

(گستاخ نامہ یعنی سائنس ڈاکو کا خط دربار رسالت میں)

از کیمپ یورپ۔ بارگاہ شاہ ہفت اقلیم حضور سائنس بہادر۔ بخدمت جناب معلی القاب

## محمد بن عبد اللہ بانی مذہب اسلام

جناب من! مجھ کو پیشگاہ سرکار دولتمدار حضور بادشاہ ہفت اقلیم سائنس زمانہ گیر دام اقبالہ کی جانب سے ہدایت ہوئی ہے کہ آپ کو ان کے دوستانہ خیالات سے آگاہ کروں۔ چونکہ ہمارے بادشاہ جم جاہ آپ کے خیالات میں بہت کچھہ صلاحیت اور اپنے خیالات سے نزدیکی ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اس لئے ان کی خواہش ہے کہ دوستانہ طریق سے چند امور آپ کے گوش گزار کریں ؎

یہ اطلاع غالباً آپ کو مل گئی ہوگی کہ یورپ میں عیسائی مذہب کے مسمار کرنے میں اور اسکو اپنا محکوم بنانے میں ہمارے شاہ کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ یہ سنکر بہت خوش ہوں گے کہ اس زمانہ میں عیسائی مذہب کا جو کچھہ غل مچ رہا ہے وہ محض لفافہ ہی لفافہ ہے۔ اندر کچھہ بھی نہیں ہے۔ شاہ سائنس نے تمام عیسائی قوموں کے دلوں پر تسلط پالیا ہے اور اب یورپ میں ایسا کوئی سرکش باقی نہیں ہے جو عیسوی مذہب کو بچانے یا اس کا اثر برقرار رکھنے کی شاہ سائنس کے مقابلے میں طاقت رکھتا ہو۔ بدھ مذہب کا جاپان میں خاتمہ کر دیا گیا۔ چین میں کچھہ لوگ ہیں ان پر مہم بھیجی گئی ہے۔ یقین ہے وہ بھی عنقریب مفتوح ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں پچاس برس سے معرکہ کارزار گرم ہے اور شاہ سائنس کو اکثر مقامات پر کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ شاہ سائنس کی خوش اقبالی سے ہندو مذہب کا

ایک بڑا گروہ دیانند راجہ کی سرکردگی میں ہندو مذہب پر چھاپے مار رہا ہے اور ہمارے بادشاہ کو اس کی پرزور اور پُراثر یورش سے امید ہے کہ ہندو مذہب پر بہت جلد ان کا قبضہ ہو جائیگا۔ زرتشتی دین کی نسبت تو آپ کو اچھی طرح واقفیت ہو گی کہ وہ ہمارے شاہ کے قدموں میں آن گرا۔ اور اب اس نے خانہ زاد خاص کا خطاب حاصل کیا ہے۔ مگر حضور ظل زمانی بہت افسوس کرتے ہیں کہ آپ کا مذہب اسلام جگہ جگہ ان کی فتوحات میں سدراہ ہوتا ہے اگرچہ حضور ظل زمانی آپ کے سپہ سالار جنرل اسلام کی قابلیتوں کے قائل اور بہت مداح ہیں لیکن وہ اسلام کی موجودہ روش کو پسند نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہیں کہ آپ اپنے سپہ سالار کی حالت میں تبدیلی کا حکم دیں۔ شاہ سائنس کی حکمرانی نسل انسانی کے لئے راحت و شادمانی کا لازوال خزانہ ہے۔ شاہ سائنس نے اپنی سلطنت کے ایسے طریقے مقرر فرمائے ہیں جن سے ہر مذاق اور ہر خیال کا انسان مساوی درجہ میں خوشی اور آسائش حاصل کرتا ہے۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب انسان کیلئے اور اس کی زندگی کیلئے بڑی خوفناک اور ضرر رساں چیز ہے۔ مذہب کے باعث ہر ملک ہر قوم یہاں تک کہ ہر گھر میں فساد اور خونریزیاں برپا رہتی ہیں۔ مذہب انسانی فطرت کے جذبات کو قدرتی طور پر ابھرنے نہیں دیتا اور دبا کر برباد کر ڈالتا ہے۔ مذہب تمیز داری اور شائستگی کا دشمن ہے مذہب بیدار مغزی اور معقولیت سے کوسوں دور ہے۔ مذہب نہیں چاہتا کہ انسان اپنے اختیارات اور اپنی طاقتیں کام میں لائے۔ مذہب آزادی و مساوات کا مخالف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا پر تکلیفات کا جال پھیلا رکھا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیے کہ یورپ کے اس زمانہ میں جب کہ وہاں مذہب کا دور دورہ تھا اہل یورپ کیسی ذلیل اور کمینی زندگی بسر کرتے تھے پیشوایان مذہب انکو ٹھکراتے تھے۔ آگ میں جلاتے تھے۔ انکی عورتوں کی عزت و ناموس کو خراب کرتے تھے اور بیچارے پیروان دین مسیح اُف نہ کر سکتے تھے۔ مگر آج جبکہ شاہ سائنس کا دور حکومت ہے۔ ہر شخص آزاد۔ ہر شخص با اختیار۔ خوش و خرم اور

عزت دار بنا ہوا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنے سے ادنیٰ یا اعلیٰ کی آزادی و اختیارات میں دخل دے سکے۔ اہل یورپ ہمارے شاہ کی تاجداری پر دل سے فریفتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب دنیا والے سائنس تاج کے زیر سایہ آجائیں۔ ایسی حالت میں آپ خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ ہمارے شاہ کا تلوار کھینچنا اور مذہبی حکومت کو زیر و زبر کرنا کس قدر ضروری اور کیسا اچھا کام ہے۔ لہذا آپ فوراً اپنے اصول جہانداری کو بدل ڈالئے اور سائنس اور گورنمنٹ سائنس کے قوانین اپنے ہاں جاری کر دیجئے۔ تاکہ ہماری گورنمنٹ کے سامنے سے دشواریاں اور مشکلات دور ہو جائیں۔ اور زمین پر امن و امان کا آفتاب چمکنے لگے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ شاہ زمانہ گیران تدابیر کو عمل میں لائیں گے جن سے آپ کی گورنمنٹ کو سخت نقصان اٹھانا اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں بیباکانہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر اس آخری اطلاع پر جلدی توجہ نہ کی گئی تو افواج قاہرہ کو حرکت میں لایا جائیگا اور اسلامی قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیجائیگی ہماری گورنمنٹ کے آتش فشاں ہتھیاروں اور فنون حرب کی ترقیوں سے غالباً آپ بے خبر نہ ہوں گے اور صلح کو جنگ سے غنیمت تصور فرمائیں گے۔

راقم

میں ہوں آپ کا ادنے خدمتگار

دہریہ۔ وزیر محکمہ خارجہ گورنمنٹ۔ سائنس زمانہ گیر۔

## مشورہ

سپہ سالار اسلام فرش خاک پر تلوار ٹیکے کھڑا تھا اور سامنے تمام عہدہ داران فوج دست بستہ ایستادہ تھے ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور سپہ سالار کی تقریر صاف سنائی نہ دیتی تھی لیکن آخر میں سپہ سالار نے ایسے پر جوش جملے کہے کہ سب نے اچھی طرح اُن کو سُنا

یورپ کے مشہور قزاق سائنس کا ایک گستاخانہ مراسلہ دربار رسالت پناہی میں آیا ہے۔ جس میں اس نے لڑائی کی دھمکی دیکر ہماری سلطنت کے قوانین بدلوانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ بولو۔ اب تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟

جنرل شریعت دار:۔ پہلے یہ فرمائیے کہ دربار قدسی کی جانب سے اس گستاخ کو کیا جواب دیا گیا؟

سپہ سالار:۔ وہ جواب تم عنقریب سن لوگے۔ میں تمہارا منشا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر حالات کی صورت دگرگوں ہو تو تم کن طریقوں سے مدافعت کروگے اور تمہارے پاس کیا کیا ذرائع مقابلے کے ہیں؟

جنرل شریعت دار:۔ جس قسم کی ضرورت ہو ہم ہر حیثیت سے تیار ہیں۔ اگر علمی مقابلہ ہو تو حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ الغرض معقول۔ منقول جس قسم کا معرکہ ہوگا ہم مقابلہ کریں گے۔ جنگ کی نوبت آئے تو اس میں بھی ہم کو سب سے آگے ہاتھ مارتے پائیے گا؟

جنرل طریقت دار:۔ جناب عالی تردد نہ فرمائیں۔ میری کمان میں وہ بہادر ہیں جن کے نعرۂ حق سے آسمان زمین لرزتے ہیں۔ سائنس کی کیا ہستی ہے جو ہمارے شہنشاہ کے قوانین کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے۔ یہ دیکھیئے حضور کے روبرو چشتی۔ قادری نقشبندی سہروردی۔ رفاعی وغیرہ نامور افسر کھڑے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں بار نفس امارہ کے لشکروں کو زیر و زبر کیا ہے۔ حرص و ہوا کی کائنات ان کے نام سے تھراتی ہے خود بینی و ناحق شناسی کے سیکڑوں تاج و تخت ان کے نعرۂ ہُو سے خاک میں مل گئے۔ سائنس اپنے تمام ابلیسی لشکروں کو لیکر آجائے اور دیکھے کہ شہسوارانِ طریقت کس شان سے میدان کارزار میں نکلتے ہیں اور کیونکر اس کے دھوئیں اڑاتے ہیں؟

جنرل طریقت دار کی تقریر سنکر سپہ سالار اسلام کا چہرہ بشاش ہو گیا۔ اور اس نے

تبسم خیز انداز سے کہا۔ آفرین بہادرو! شاباش دلیرو!! تمہاری ہمت مردانہ سے مجھے یہی امید تھی۔ مگر جس دشمن کا مقابلہ درپیش ہے وہاں یہ ہتھیار کام نہیں دیں گے۔ اب نری جرأت سے کام نہیں چلتا۔ تم کو چاہئے کہ اپنے حریف سائنس کے طریق حرب سیکھو۔ اور پھر مقابلہ کیلئے مورچہ باندہو۔ آؤ پہلے اس کی کوشش کریں کہ ہمارا لشکر سائنس کے قواعد سے خبردار ہو جائے۔ اس کے بعد دو ہاتھ کرنے کو آگے بڑھے ؛

# تخت رسالت کا فرمان

تمام امت محمدی کے صوبہ داروں اور ادنیٰ و اعلیٰ افراد ملت کو معلوم ہو کہ با دولت و اقبال تمدن جدید کی دنیا میں کلمۃ اللہ کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ دربار رسالت کے فرمان واجب الاذعان کی تعمیل کیلئے دل و جان سے کمر بستہ ہو جاؤ ؛

وقت آگیا کہ یورپ و امریکہ۔ چین و جاپان اور ان تمام ممالک میں جہاں سائنس اور علوم جدیدہ کی اشاعت ہو رہی ہے اسلامی صداقت کی روحانیت پھیلائی جائے۔ لہٰذا تم سب کیل کانٹے سے درست ہو جاؤ۔ پہلے اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اور اپنے وجود کو اسلامیت کا مجسم نمونہ بنالو۔ اور پھر نئے علوم سیکھنے شروع کر دو تاکہ تخت کی منشا کے موافق مذکورہ زمین پر امر حق رائج کر سکو ؛

مسلم یونیورسٹی کے نام سے جو تحریک ہندوستان میں اٹھی ہے وہ تاج ملت کے ارادے کے موافق ہے۔ اسکو سرسبز بنانے میں اتفاق و یکجہتی سے کوشش کرو۔ یہ پہلا دروازہ ہے جو تمہارے لئے قدرت خداوندی نے کھولا ہے۔ اس کے اندر بے دھڑک گھس جاؤ۔

قرآن شریف میں سب سے پہلے الٓمٓ کا لفظ تم نے پڑھا ہوگا۔ اس میں اشارہ ہے کہ آل محمدؐ اس کتاب (علم) کو جس میں کچھ شک نہیں عالمگیر کرنے کے لئے کھڑی ہو گی۔ چنانچہ پہلے سید احمد خاں نے جو محمدی آل سے تھا یہ کام شروع کیا۔ اور اب آغا

خان جو زمرۂ آل رسالت سے ہے اس کی مدد کرنی چاہتا ہے۔ تم سب کو مل کر اس کی اعانت
کرنی چاہیئے۔ تاکہ ہدایت کا چشمہ ان قوموں کو سیراب کرے۔ جو روحانیت کی پیاسی ہیں۔
اسی آلۂ کے مبہم میں اس نائب رسولؐ مہدیؑ کے ظہور کی خبر ہے۔ جو عنقریب
ظاہر ہوگا۔ اور تمہارے منتشر اور پراگندہ کاموں کو سمیٹ کر یکجا کر دے گا۔ اور سارے
جہان کو اسلام کے حقانی دائرہ میں لے آئیگا۔

ما جناب رسالت مآب کے تخت کی جانب سے اس غلط فہمی کی اصلاح ضروری ہے
جو یورپ کی قوموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ لوگ ہمارے نائب مہدیؑ کے نام سے طرح
طرح کے وہم کرتے ہیں۔ ان کو اطمینان رکھنا چاہیئے۔ ہمارا مہدیؑ ان کی مملکت
میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ امن و امان کو برہم نہیں کرے گا۔ اس کا کام صرف یہ ہوگا
کہ باطنی اور روحانی تسکین کے ذرایع دنیا میں شایع کرے۔ اور انسانوں کو ظاہری
دولت مندی کے ساتھ باطنی تسلی کی دولت بھی بانٹے۔ اور لکھا جا چکا ہے کہ جس
وقت وہ دنیا میں آئے گا سب قومیں اس کے طریق روحانیت کو قبول کر لیں گی۔
اور اس کی ہدایت پر عمل شروع کر دیں گی۔ بس اسی کا نام مہدی کی حکومت
ہے۔ کہ اسلامی روحانیت کل جہان پر مسلط ہو جائے۔ یہ نہیں کہ لوگوں کے تاج
و تخت چھینے۔ جس طرح جرمن و انگریز۔ روس و فرانس وغیرہ کی سلطنتیں اب
قایم ہیں۔ مہدی کے وقت میں بھی برقرار رہیں گی۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ یہ سب
ان اصول پر اپنی زندگی شروع کر دیں گی جو مہدی مقرر کرے۔ اس میں جھگڑا فساد
اور خونریزی مطلق نہ ہوگی۔ لہذا سب لوگوں کو بے فکر رہنا چاہیئے۔ اور خوشی و خرمی
سے ہمارے نائب کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھنا چاہیئے ؂

دنیا میں اس اعلان کی خبر نے جو سائنس کی جانب سے دربار رسالت میں پہنچا ہے ہل
چل ڈال دی اگر تخت نبوت تم سب کو تسلی دیتا ہے کہ معاملات کی صورت ایسی پیچیدہ

اور نازک نہیں ہے۔ سائنس کے خط کا جواب دیدیا گیا ہے۔ ہمارا سپہ سالار اسلام میان سے تلوار نکالے بغیر سب خرخشوں کو صاف کردے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے اگرچہ سائنس کے وزیر خارجہ دہریہ کا لب و لہجہ سخت تھا۔ گرماجناب سختی کا جواب سختی سے نہیں دینا چاہتے ہماری سرکار کا ہمیشہ سے نرمی وملامت کا شیوہ رہا ہے۔ اور وہی اب بھی ملحوظ ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گا کیونکہ ماجناب تماعالم کے لئے رحمت ہیں۔

# مرحمت نامہ

(یعنی سائنس کے گستاخنامہ کا جواب دربار رسالت سے)

(از مملکت حجاز خیمۂ رسالت۔ بنام سائنس مدعی زمانہ گیری)

تمہارا خط جس میں تخت رسالت پناہی کو اسلام کی موجودہ روش تبدیل کرنے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے پہنچا۔ بارگاہ قدوسی میں عرض کردیا گیا۔

حضور انور نے کمال الطاف و نوازش کے بشرہ سے اس کو سماعت فرمایا۔

تمہارے وزیر نے جس طریقہ سے اپنی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن دارین پناہ بوجہ خلق عظیم کے اس سے درگذر فرماتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ غرور و تکبر ہر کامیابی کیلئے سبب ناکامی ہے۔ اس سے احتیاط کرنی چاہیئے۔

ارشاد ہوا ہے کہ مذہب کی مضرتوں کو تم نے بالکل غلط سمجھا۔ یورپ کے مذہبی زمانہ میں جس قدر خرابیاں تھیں وہ مذہب کے غلط استعمال کے سبب تھیں۔ مذہب کا اس میں کچھ قصور نہیں تھا۔ اور اب جن راحتوں کو پیش کیا جاتا ہے وہ بھی موہوم اور بے اصل ہیں۔ جن کو پائداری نصیب نہیں۔ ذرا لوگوں کے دل سے پوچھو کہ باوجود اس آزادی و دولتمندی کے ان کو اندرونی اطمینان اور قرار و سکون میسر ہے یا نہیں۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ نہیں پھر اس نمائشی راحت سے کیا فائدہ۔ راحت وہ ہے جس کی جڑ آدمی کے دل میں جاگزیں ہو

نائب بارگاہ ایزدی تم کو مطلع فرماتے ہیں کہ ان کی امت عنقریب تمہاری ان مشکلات کو رفع کر دے گی۔ جو درحقیقت سچی مشکلیں ہیں۔ نہ وہ جن کو تم مشکلات تصور کر رہے ہو اس سے زیادہ کچھ اور فرمانا نہیں چاہتے۔ گو ان کو قلم کے جواب کے علاوہ تیغ و سناں کی جواب دہی کی بھی ہر طرح قدرت حاصل ہے ×

امید ہے کہ تم ہماری رحیم و کریم سرکار کی مہربانی اور نوازش سے فائدہ اٹھاؤ گے اور اچھا زمانہ حاصل کرنے کی کوشش کرو گے ×

راقم

عبید۔ حلقہ بگوش تخت رسالت

محکمۂ تحریرات۔ بقلم حسن نظامی

# فقیروں کی عید

از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۰ء

قوموں کی زندگی اور ترقی جن ذرایع سے معلوم ہوتی ہے ان میں قومی تہواروں کی شان و شوکت کو بہت کچھ دخل ہے۔ اسلام نے ظاہر ہو کر عرب اور اکثر حصہ عالم کی مراسم قبیح و ناز یبا رواجوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اور مٹا دیا مگر جو رسمیں بشریت کی فطرت میں داخل تھیں ان کو باوجود اپنے بھاری بھر کم طرز عمل اور تقوے و متانت کے جاری رکھا۔ بلکہ ان میں اور چار چاند لگا دئے۔

چنانچہ وہ کھیل جو جنگجو قوموں میں بطور مشق جاری تھے۔ اسلام نے انکو منع نہیں کیا۔ خود بانی اسلام علیہ التحیۃ والسلام بارہا ایسے کھیلوں میں شریک ہوئے ہیں۔ حالانکہ کھیل تماشہ اور لغو مشغلوں سے حضور نے ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس سے روکتے رہے ×

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیل جن سے قوم میں کوئی کارآمد بات پیدا ہو اسلام نے بند نہیں کئے۔ اور ان کو اپنی متانت و بردباری کے خلاف نہیں سمجھا۔ مثلاً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیزہ بازی و تیر اندازی کے کھیلوں کا خود بھی تماشہ دیکھتے تھے اور اپنے عیال کو بھی دکھاتے تھے۔ معتبر روایتوں سے یہاں تک ثابت ہے کہ حضورؐ اپنے گھر والوں کے ساتھ دوڑ کے کھیل میں شریک ہوتے تھے۔ اور خود بنفس نفیس دوڑتے تھے اور فرماتے تھے دیکھیں کون آگے نکلے۔

بہادری اور مردانگی کے کھیلوں میں خود ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں جو کھیل دلیری و شجاعت کا جذبہ پیدا کرنے والے ہوں۔ ان میں ہر ثقہ اور متین مسلمان شامل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی شخص اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو ذات سب سے زیادہ متین اور سب سے زیادہ بردبار تھی وہ بھی ایک مفید حد تک ان کھیلوں کو جائز رکھتی تھی۔

اسی پر ایام خوشی کو قیاس کرنا چاہئے۔ کہ سال بھر میں ایک دن ایسا ہوتا ہے جس میں قوم کا ہر فرد اپنی حیثیت اور طبیعت کے موافق خوش ہو۔

اسواسطے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الضحیٰ دو دن مقرر فرمائے۔ یہ دونوں دن اسلام کے دو عظیم الشان فرائض کی تکمیل کی خوشی میں مقرر ہوئے۔ عید الفطر مہینہ بھر کے روزے عطا کرنے کے بعد۔ اور عید الضحیٰ حج کعبہ کے بعد۔ اس طریقے سے مسلمانوں کی خوشی کو اپنے معبود کی عبادت کے ساتھ جیسی کچھ وابستگی ہو گئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے ہر شخص خود غور کر سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہؓ ولی کبھی اور شادمانی سے ان تہواروں میں حصہ لیتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی تہوار ان کی شان کے موافق متانت اور بھاری بھرکم پن کے خلاف و منافی نہیں ہیں بروایت

اور مشائخ بھی بشر ہیں اور انسانوں کے دل سینے میں رکھتے ہیں۔ اور حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی شان کچھ اعلیٰ و برگزیدہ نہیں ہے جو اپنے دینی و قومی تہوار کی خوشی کے اظہار میں شریک ہونا اپنے وقار اور متانت کے خلاف تصور کریں۔ خوشی اور رنج کا حس مٹ جانا دوسری چیز ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے حواس آدمیت سے معطل ہو جائے۔ بلکہ وہ ایک مقام رضا و تسلیم ہے جس میں درویش رضائے الٰہی کی طلب میں ایسا بے خبر ہو جاتا ہے۔ کہ دنیا کی تکلیفات اور خوشیاں اسکی طلب میں مخل نہیں ہونے پاتیں۔ اور وہ ایک ہی دُھن میں مستغرق رہتا ہے

پس عید جیسے قومی و دینی تہوار میں فقراء و مشائخ کا یا ان کے اخبار و رسالہ کا شریک ہونا اور اُس کی خوشی میں اپنے دیگر ہم مذہب بھائیوں کی مثل برابر کا حصہ لینا نامناسب و ناروا نہیں ہے بلکہ لازمی اور ضروری ہے ؞

# عید میلاد الرسولؐ

(از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء)

ایک سو ایک ضرب الا اللہ کی سلامی دو۔ رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ آنکھیں مژگاں کی سناں اور ابرو کی تیغ سنبھالے۔ ادب سے پتلیاں جھکائے کھڑی رہیں۔ زبان درود کا بینڈ بجائے بدن کی سب رگوں کو حکم دو کہ صلواتی بینڈ میں یک جان ہو کر سر ملائیں۔ یہاں تک کہ ہر بن موئے نغمۂ اللہ ھو۔ اللہ ھو۔ نکلنے لگے۔ روزہ کی عید۔ حج کی عید۔ دونوں دست بستہ آئیں اور عید میلاد کا خیر مقدم کریں ؞

دودھ۔ سوئیوں۔ اور قورمہ چپاتی کو اس عید سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ جو کی روٹی کھاؤ۔ اور خوشی مناؤ ؞

آج عید ولادت ہے۔ آج وہ پیدا ہوئے جن پر کائنات کی پیدائش کا حصر ہے۔ چاند کو رخِ انور سے شرمانے والے۔ ظلمت کو گیسوؤں میں الجھانے والے بشاہِ گدا نواز۔ رسول العرب والعجم۔ جن کی ولادت سے تاریکی باطل دور ہوگئی۔ حق کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ خودسر بے سر ہوئے۔ بے تاج تاجور بنے۔ جنہوں نے ہونٹوں کو ہلا کر ساری زمین زلزلے میں ڈال دی۔

غریبوں مظلوموں کے غمگسار سرکشوں۔ ظالموں کے زیر کرنے والے۔ وہی جنکا نام لینے سے ہمارے خون میں حرارت اور دل میں جوش پیدا ہوتا ہے۔

ایسے برگزیدہ و پاکیزہ وجود کے ظاہر ہونے کا وقت ہے کہ آسمان۔ زمین۔ شجر حجر۔ کیف میں ہیں پھر تم کیوں اے مسلمانوں یوم ولادت کو قومی تہوار نہیں بناتے۔

یہ وہ خوشی ہے جس میں ہر فرقہ اور عقیدہ کے مسلمانوں کو یکساں حصہ لینا چاہئے۔ یہاں شیعہ۔ سُنّی۔ مقلد۔ غیر مقلد۔ صوفی۔ وہابی کی قید نہیں۔ سب یک دلی و اتفاق سے میلاد کا تہوار مقرر کریں۔ اور دنیا کو دکھائیں کہ جس طرح رسول خدا کو اپنی امت سے محبت تھی۔ اسی طرح امت بھی ان کے نام پر قربان ہے۔ اور ان کی یادگار میں دل و جان سے حصہ لینا چاہتی ہے۔ دوسری قومیں فرضی اور خیالی تہوار مناتی ہیں تاکہ قوم میں زندگی کے جذبات پیدا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک اصلی اور شاندار موقع موجود ہے اس سے کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے۔

اسلامی ممالک میں جہاں ہمارے خوش قسمت بھائی تخت و تاج کے مالک ہیں میلاد شریف کے موقع پر بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہم بدنصیب سہی۔ بے تاج سہی۔ ہیں تو حلقہ بگوشان رسول۔ پھر کیوں اپنے تاجدار بھائیوں سے حب رسول میں پیچھے رہیں۔ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے۔ کہ از روئے فقہ میلاد جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ سوچنے کا وقت ہے کہ میلاد کے جلسوں

کو کس طریقہ پر بارونق اور شاندار بنایا جائے۔

یاد رکھو کہ سب کی دینی و دنیاوی زندگی اپنے رسولؐ کی الفت و یاد میں مخفی ہے اگر ہم دنیا میں اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کو آخرت میں سرخرو جانا ہے تو آقائے نامدار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد پاک کی عیدین سے زیادہ خوشی منایا کریں۔ بلکہ میلاد الرسول کی ایک علیحدہ عید مقرر کریں جس میں دھوم دھام سے میلے ہوں۔ جلسے ہوں اور ہر عقیدہ کا مسلمان اپنے کلمہ کے شریک بھائیوں کے ساتھ عید الرسولؐ منائے۔ اور کہے "آج اس کے نام کی عید ہے جس نے دنیا کے پردے کو شرک و کفر کے غم و الم سے پاک و صاف کر کے وحدت کے جلوہ سے آراستہ کر دیا۔

**نوٹ:۔** ۲۷ برس کے اس مضمون کو عید میلاد کی بنیاد کہنا چاہیئے جس کے بعد تمام دنیا میں یہ تحریک مقبول ہو گئی حسن نظامی

# ایکو برہم دوتیو ناستی

(از صوفی۔ جولائی ۱۹۱۱ء)

یہ فقرہ جس کے سلیس معنی وحدہٗ لاشریک یا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہیں۔ ہندو مذہب کے اصول میں داخل ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنا توحید پر ہے۔ مگر انسان اپنے خیالات کی آمیزش کر کے اس متفق علیہ اصول کو خراب کر ڈالتا ہے اور وقتاً فوقتاً ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کسی انسان کو بشری خیالات کی اصلاح کے لئے مقرر فرمائے چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم میں ضرورت کے وقت مصلح ظاہر ہونے کا ثبوت تواریخ اور مذہبی کتب میں موجود ہے۔ قرآن شریف میں صاف طور پر ارشاد ہوا ہے کہ ہر ملک و ملت کے واسطے خدا ایک ہادی مقرر کرتا ہے۔ بعض رسولوں کے نام اور حالات کی تصریح فرما دی گئی ہے۔ بعض کی نسبت اشارے کنائے کر دیئے ہیں اور پھر ایک کلیہ قاعدہ

قایم کرکے حکم دیدیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری اور لازم ہے مسلمان بھی زبان سے نہیں بلکہ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ جن رسولوں کی اطلاع ان کو پہونچی اور جن کی نہیں پہونچی وہ سب برحق ہیں ؛

اتنا معلوم کرنے کے بعد سوچنا چاہئے کہ ملک ہندوستان جو دنیا میں ایک بڑا ملک کہلاتا ہے اس بات کا مستحق ہے یا نہیں کہ یہاں بھی خدا نے اپنے دستور کے موافق پیغامبر بھیجے۔ اور ان کو ہدایت کرنے کے واسطے کتابیں دیں۔ اگرچہ قرآن شریف میں اس ملک کے رسومات کی بابت کوئی تصریح نہیں پائی جاتی۔ مگر خدا کے اس کلیہ کے موافق کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان بھی ان متبرک آدمیوں سے محروم نہیں ہے جن کو خدائی اصطلاح میں نبی و رسول کہتے ہیں ؛

ہندوستان کے نامور بزرگوں سری رامچندر جی اور سری کرشن جی اور مہاتما بدھ کے حالات پڑھئے۔ ان کی طرز زندگی پر غور کرنے اور ان کی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم و عیسےٰ و موسیٰ وغیرہ علیہم السلام کے پائے جاتے ہیں۔ اور وہی تعلیم تھی جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے ؛

اسلامی عقاید میں یہ مسلم امر ہے کہ انسان کے لئے فطرتی مذہب ہمیشہ سے ایک ہے جس قدر پیغمبر اور رسول بھیجے گئے وہ سب ایک ہی مذہب اور ایک ہی اصول کی تعلیم کرتے تھے۔ نئے اصول کی شریعت کسی پیغمبر نے قائم نہیں کی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر اور سب سے اچھے رسولؐ نے بھی جن کی پیروی کا فخر ہم کو حاصل ہے وہی بتایا جو اگلے نبی بتاتے آئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تعلیم میں ہر ملک و قوم کی سمجھ اور طرز معاشرت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ایسے طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ ہر درجہ کی عقل میں آ سکے آپ کو معلوم ہوگا کہ توراۃ و انجیل کا طریقۂ تعلیم تشبیہ اور استعارات پر

ہنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر زمانہ کے آدمی عقل و ذہنی تغیر کے سبب اس کے فہم سے قاصر ہو گئے۔ اور طرح طرح کی غلطیوں اور توہمات میں مبتلا ہونے لگے۔ وید مقدس اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں اور بزرگوں کے بیانات میں بھی اس قدر مشکل استعارات پائے جاتے ہیں۔ جن کا ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کرنا دشوار ہے اگرچہ مثالیں ایسی دی ہیں کہ معمولی عقل والا بھی ذرا سی دیر میں سمجھ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس ملک کے بعض لوگوں نے اصلی بات معلوم کرنے میں توجہ نہیں کی اور ظاہری الفاظ پر عمل کر کے اپنے پاکیزہ اصول کو خراب کر دیا۔

میں ایک مثال دنیا کی پیدائش کی نسبت پیش کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں خدا فرماتا ہے کہ ہم نے حکم دیا۔ کُنْ فَیَکُوْنُ ہندو مذہب میں اول برہما پیدا ہوا۔ اس نے تمام عالم کو ظاہر کیا۔ غور کیجئے کہ ان دونوں بیانات میں کیا فرق ہے۔ کچھ بھی نہیں متحد البیان ہیں۔ قرآن میں خدا نے صفت خالقیت کو کُنْ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور وید میں برہما کے لفظ سے۔ برہما صفت ایجاد کا نام ہے۔ جب تک یہ صفت ظاہر نہیں ہوئی دنیا ناپید تھی۔ جس طرح کُن کے ظہور کے بعد یکون کا ظہور ہوا۔ اسی طرح برہما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا۔ یہی کیفیت تمام اصول مذہب کی ہے ؎

عورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک جسم میں سینکڑوں ہاتھ اور متعدد سر ہیں اور ہر ہاتھ میں مختلف چیزیں ہیں۔ کسی میں تلوار ہے۔ کسی میں پھول ہے۔ کسی میں اناج کا خوشہ ہے۔ اور ہندو ان مورتوں کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اس وقت آپکو نفرت آمیز ہنسی آئے گی کہ یہ کیسی مضحکہ انگیز صورت ہے اور یہ کیسے احمق ہیں کہ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں ؎

مگر حضرات ہندوستانی رہبروں نے یہاں کے باشندوں کو سمجھانے کے لئے صفات الٰہی کی حقیقت صاف طور پر ذہن نشین کرنے کے واسطے یہ مورتیں بنائی

تھیں۔ تاکہ کم سمجھ لوگ آسانی سے سمجھ جائیں کہ خدا میں قہر کی شان بھی ہے۔ جس کا نمونہ تلوار ہے اور رحم بھی جس کا نشان پھول یا اس قسم کی کوئی اور چیز ہے۔ اُسی کے ہاتھ میں رزق ہے۔ اس لئے اناج کا خوشہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت ہی بے عقل ہے اور مثالوں کو ذریعہ کے بجائے نتیجہ سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ ان مثالی مورتوں کے سبب بت پرستی شروع ہو گئی۔ اور ہزاروں غلط فہمیاں واقع ہو گئیں یہ بات ہندوستان پر مخصوص نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی کئی ملک ایسے ہیں۔ جہاں صرف مثالی خرابی سے بُت پرستی کا رواج ہوا۔ روم۔ یونان و مصر میں اس کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

جب تمام دنیا میں عالمگیر غلط فہمیاں واقع ہو گئیں تو خدا تعالیٰ نے ایک ایسا آسان صاف اور سیدھا طریقہ تعلیم سکھا کر ہمارے حضرت صلعم کو بھیجا۔ جو تمام دنیا کی ہدایت کے لئے کافی ہو۔ اور تمام مذاہب عالم میں جس قدر خرابیاں بشری خیالات اور نفسانی جذبات کے سبب پڑ گئی تھیں وہ دور ہو جائیں۔ میں نہیں کہتا کہ میرا دعویٰ خواہ مخواہ تسلیم کر لیا جائے بلکہ تجربہ اور تحقیق سے غور کرنا چاہیئے کہ اسلام نے قدیمی اصول کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ تمام دنیا کے مذہبوں کی خرابیاں آسانی سے رفع کر دے تجربہ مشاہدہ کرا دے گا کہ بے شک اسلام کا طریقہ تعلیم ایسا صاف سیدھا اور آسان ہے کہ قدیمی اصول مذہب عمدگی کے ساتھ ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔

اب میں مجمل طور پر ہندوستان کے دو نامور بزرگوں سری رام چندر جی اور سری کرشن جی کے حالات پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ ان بزرگوں کی زندگی اور تعلیم ہمارے مسلمہ رسولوں کے کس قدر مشابہ تھی۔ میں رام کرشن جی کے بعض اقوال کو اپنے حضور صلعم کے ارشاد اور قرآن شریف کے بیان سے مطابق کر کے دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ واقعی ہندوستان کے رسول تھے اور ہمارے رسول گو سب کے بعد بھیجے گئے مگر وہی بیان کیا جو پہلے بیان ہو چکا تھا۔ کوئی نیا دین لیکر نہیں آئے تھے لہٰذا تمام دنیا خاصکر ہندوستان کو لازم ہے کہ

پرانی تعلیم کو نئے طریقے سے سیکھے جو سب سے زیادہ آسان اور صاف ہے اور جس میں اکثر وہی باتیں ہیں جو ہندوستانی رسول فرما گئے تھے۔

رام جی اودھ کے راجہ دسرتھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ہندوستان میں رام لیلا کا مشہور میلا انہیں کی یادگار میں منایا جاتا ہے ان کی سولہ برس کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ اپنے خاندانی پیشوا بششت جی کے ہمراہ سیاحت کو نکلے اور تمام مشہور اور متبرک مقامات اور اہل اللہ بزرگوں کی زیارتیں کیں۔ قدرتی نظارے دیکھے۔ دنیا کے نشیب و فراز ملاحظہ کئے۔ جب واپس آئے تو عجیب حال ہو گیا۔ ہر وقت سوچ اور فکر میں مستغرق رہتے نہ کھاتے نہ پیتے۔ اور دنیا کے تفریحی مشغلوں سے نفرت ہو گئی۔ اکثر خاموش رہتے۔ اور بولتے تو فرماتے یہ دنیا کیسی بری دنیا ہے۔ بالکل ہیچ و ناپائدار۔ اسی اثنا میں ایک ایسا موقع آیا کہ اُس زمانہ کے مشہور بزرگ بسوامتر جی راجہ دسرتھ کے پاس آئے اور رام جی کو کسی سرکش و بدکار کی ہلاکت کے لئے مانگا راجہ نے ان کی کمسنی اور ناتجربہ کاری کا عذر کیا۔ مگر بسوامتر جی کے اصرار سے رام جی دربار میں بلائے گئے۔ اور ایک ایسی عالمانہ و عارفانہ تقریر کی کہ راجہ اور تمام درباری خاصکر بششت اور بسوامتر جیسے عارف لوگ حیران رہ گئے کہ یہ کم سن بچہ کیسی باتیں کرتا ہے۔

رام جی نے اپنی تقریر میں انسانی ہستی کے تمام مدارج اور دنیا کے تغیرات کی نسبت بششت جی اور بسوامتر جی سے سوالات کئے۔ مگر ایسے پیرایہ میں جیسے کوئی شخص تجاہل عارفانہ کرتا ہے۔ خود ہی ایک امر کی نسبت شک و شبہ بیان کرتے اور خود ہی ایک لطیف کنایہ سے اس کا جواب دیتے۔ بسوامتر اور بششٹ نے رام جی کے سوالات کا جواب دیا۔ مگر انصاف سے دیکھا جائے تو

## صاحب عرفان سائل کے سوالات

کی شان کے موافق ان لوگوں کے جواب نہ تھے۔ یہ رام جی کا شروع حال ہے۔ اس کے

بعد انہوں نے ایک خاص امتحان کے موقع پر بیسیوں راجوں کے مقابلہ میں ایک مشہور کمان توڑ کر امتحان پاس کیا۔ اور راجہ کی بیٹی سیتا جی کو جیت کر بیوی بنا لیا پھر چند سال تک اپنی سوتیلی ماں کے حسد کے سبب صحرا کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں ان کے ہمراہ اُنکے بھائی لچھمن جی اور بیوی سیتا جی بھی تھیں۔ یہیں ان کو ایک سرکش و بدکار راجہ نے جسکا نام راون تھا دھوکہ دیا۔ اور اُن کی بیوی سیتا کو چرا کر لیگیا۔ اور رام جی کو اس کے ملک لنکا پر حملہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ہنومان نامی کوہستان کے راجہ کی مدد سے لنکا فتح کر کے راون کو مارا اور سیتا جی کو چھینا۔ اس کے بعد اپنے راج استھان دار الخلافہ اجدھیا پوری میں واپس آئے اور راج کرنے لگے۔ اسی راج کے زمانہ میں انہوں نے رسالت کے فرائض کو پورا کیا۔

ایک عجیب بات ہے جس کی بابت حدیثوں میں بھی اشارہ ہے کہ ہر بڑے رسول کو ایک بڑے دشمن سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ دشمن اسی رسول کے ہاتھ سے ہلاک ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ کو نمرود اور حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور ہمارے حضور صلعم کو ابو جہل سے سابقہ پڑا تھا۔ اسی طرح رام جی کو راون اور کرشن جی کو کنس جیسے خونخوار دشمن دیئے گئے تھے جو مذکورہ بالا دشمنوں کی طرح ذلت و خواری سے ہلاک ہوئے۔ مگر اس ظاہری خصوصیت کے ساتھ میرے خیال میں ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کو حضرت مولانا محی الدین ابن عربی نے بھی لکھا ہے کہ فرعون اور نمرود صفت قہاری کے ظہور تھے چونکہ خدا کی صفت رحیمی اور شان رحمت ظاہر کرنی مقصود تھی جو رسولوں کے ذریعہ سے ظاہر کی اسواسطے شان جلالت و جبروت کو بھی ہر رسولؑ کے زمانہ میں ظاہر کیا۔ رام جی کے زمانہ میں راون بھی شان قہر کا مظہر تھا۔ چونکہ شان قہر کے ظہور کے لئے مختلف صورتیں اور طریقے ہیں اس لئے راون کے بہت سے ہاتھ اور سر بیان کئے جاتے ہیں۔

اب رام جی کے چند اقوال جو ان کی تعلیم کا نمونہ ہیں یوگ بشسٹ اور رامائن سے اخذ کر کے بیان کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ دنیا کی مثال چمکدار ریت کی ہے جو پیاس نہیں بجھا سکتی مگر پیاسے کو دہوکے میں ڈالتی ہے۔ اسلام بھی دُنیا کو سراب کی مثال سے یاد کرتا ہے۔ فرمایا جن کے پاس کتابیں ہیں اور سمجھتے نہیں وہ بوجھ اُٹھانے والے مزدور ہیں۔ قرآن شریف میں اس کی مثال بوجھ اٹھانے والے گدھے سے دی گئی ہے۔

فرمایا۔ دل کتا ہے۔ جہاں مردار دیکھتا ہے کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہمارے حضور نے فرمایا۔ الدُّنیا جِیفَۃٌ وَطَالِبُھَا کِلَابٌ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے۔

فرمایا۔ جو کچھ دریافت کرنا ہے اپنے آپ سے دریافت کر۔ کہ سب کچھ تجھ میں ہے۔ قرآن شریف میں بھی ایسا ہی ارشاد ہے کہ۔ وفی انفسکم افلا تبصرون اپنے آپکو کیوں نہیں دیکھتے اور حدیث میں ہے۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ

اور فرمایا۔ بارہا دیکھا گیا کہ ایک اکیلا مرد بڑے گروہ کو بھگا دیتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ کم من فِئَۃٍ قلیلۃٍ غلبت فِئَۃً کثیرۃً - (ترجمہ) بعض دفعہ چھوٹا گروہ بڑے پر غالب آجاتا ہے۔

فرمایا۔ یہ عالم محسوس وہمخیال ہے۔ مگر تعجب ہے کہ جو نہیں ہے وہ دکھائی دیتا ہے اور جو ہے وہ نظر نہیں آتا۔ فرمایا۔ عمر کی مثال بجلی کی ہے کہ ایک دم چمکی اور نابود۔

فرمایا۔ یہ کیسا بُرا گھر ہے جس کا دروازہ ہڈی کا اور دربان بندریا ہے۔ بندریا زبان کو فرمایا اس لئے کہ اس کو قرار نہیں رہتا۔ آہنکار یعنی ہما ہمی آدمی کی دشمن ہے۔

فرمایا۔ دنیا میں رہنا اور اس میں مبتلا نہ ہونا ایسا ہے جیسا دریا میں کوئی ہو اور تر نہ ہو۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ    بازمیگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اور فرماتے ہیں (۱) سنتوش پرم لابھ (صبر میں سب سے بڑا فائدہ ہے (۲) ست سنگ برمم دہنم (اچھی صحبت بڑی دولت ہے) (۳) وچار پرم گیانم (سوچنا بڑی

عقلمندی ہے) (۴) سمم چت پرمم سکھم رسب کو ایک نگاہ دیکھنا بڑا سکھ ہے)۔

کیا اچھی تعلیم ہے مگر افسوس زیادہ بیان کرنے کی گنجایش نہیں۔ رام جی کے بعد تھوڑا حال سری کرشن جی کا بھی معلوم کر لینا چاہئے۔ کرشن جی کے ساتھ بعینہ وہ قصہ پیش آیا ہے جو حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ پیش آیا تہا۔ یعنی کرشن جی کے ماموں راجہ کنس کو جو متھرا پر حکومت کرتا تہا نجومیوں نے خبر دی تھی کہ تیری بہن دیوکی کا آٹھواں فرزند تیرا قاتل ہوگا۔ اس خبر نے کنس کو ایسا حواس باختہ کیا کہ اس نے اپنی بہن اور بہنوئی کو قید کر دیا اور جو بچہ ان کے ہاں ہوتا اسے مار ڈالتا جب آٹھویں کرشن جی پیدا ہوئے تو ماں باپ نے چپکے سے ایک گاؤں میں جس میں گائے چرانے والے رہتے تھے اس بچہ کو بھیجدیا۔ اور کنس سے بیٹی پیدا ہونے کا بہانہ کر دیا۔

کرشن جی نے گوکل میں جو گھوسیوں کا گاؤں تہا پرورش پائی۔ جب ہوشیار ہوئے تو ان سے عجیب وغریب باتیں ظاہر ہونے لگیں اس کی راجہ کنس کو خبر پہونچی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ میرا بھانجا ہے۔ ان دنوں کرشن جی رسولوں کی سنت خاصکر حضرت موسیٰ ؑ کی سنت کے موافق گائیں چرایا کرتے تھے۔ ماموں نے حیلے سے بلایا اور قتل کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے اسی کو ہلاک کر ڈالا۔ اور دنیا کو اس ظالم سے پاک کیا۔

ان ایام میں کرشن جی کا بانسلی بجانا اور گوپیوں سے اختلاط کرنا سب استعارے ہیں جن سے ان کی پاکبازی پر حرف نہیں آسکتا۔ کنس کے مرنے کے بعد ان کی زندگی میں نئے آثار شروع ہوئے۔ اور حکومت ظاہری کے ساتھ ہی انہوں نے روحانی حکومت کے اصول بیان کرنے شروع کئے۔ چنانچہ جب ہندوستان کی مشہور لڑائی مہابھارت ہوئی ہے تو اس میں کرشن جی نے اپنے چیلے ارجن کو اپدیش دئے۔ انہی لکچروں کے مجموعہ کا نام گیتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے مغالطہ کی پیدا شدہ تکلیف سے نجات پا سکتا ہے اگر تین طریقے اختیار کرے۔

(۱) قدرت کاملہ اور قدرتی اشیاء کا عشق (۲) فرائض معلوم کرنے کے لئے تحصیل علم (۳) فرائض کا ادا کرنا بلا خواہش نفسانی انہی تین اصول پر بحث کی ہے۔ اور ادھیائے سنیاس یوگ میں فرماتے ہیں۔ ذی علم اور خلیق برہمن۔ گائے۔ ہاتھی۔ کتے اور بدکار آدمی سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور فرمایا وہ یوگی سے بھی بڑھکر ہے جو بھلا چاہنے والوں دوستوں۔ دشمنوں۔ قابل نفرت لوگوں۔ نیکوں اور بدوں سب کو یکساں سمجھتا ہے گیتا ۱۳۔ ادھیائے۔

یہاں میں کرشن جی کے اقوال زیادہ تفصیل اور اسلامی مطابقت کے ساتھ جمع نہیں کرسکا۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کئے جائیں گے۔ البتہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ایک وظیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو کرشن جی کے پیرو کسی سختی کے وقت پڑھتے ہیں۔ وظیفہ یہ ہے:۔

"کرشنا کرشن پرمہ آتما پہنڈ ئے بھنجنم ہیم توانگ شرنم یام سے بھے بھیتا پرنشک دیہیے"۔

مگر افسوس ہے کہ کرشن جی کے اقوال کے لفظوں کی پوجا کرلی جاتی ہے جس کا نام گیتا کا پاٹ ہے اور بہت کم لوگ اس کے عجیب فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی رسولوں کی پیشین گوئی لکھی جائے جس میں ہمارے حضور کی نسبت خبر دی گئی ہے۔ ہمارے سلسلۂ نظامیہ کے ایک بزرگ مولوی شاہ حکیم محمد حسن صاحب نظامی نے ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے جس کا نام غایۃ البرہان ہے۔ اس تفسیر میں تمام دنیا کی مذہبی کتابوں سے حضرت صلعم کی خبریں لکھی گئی ہیں اور عجیب معلومات سے ان کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ وید کی پوری عبارتیں مع تشریح درج ہیں جن کا نقل کرنا مشکل ہے۔ جس کو شوق ہو مولوی شاہ فضل احمد صاحب نظامی سے امروہہ ضلع مرادآباد کے پتے پر یہ مطبوعہ تفسیر منگا کر دیکھ لے۔ میں صرف

ایک حصہ کا اقتباس کرتا ہوں۔ جہاں کلنگی پورانوں کے حوالہ سے مولانا نے حضرت کی خبر لکھی ہے۔ لکھتے ہیں:

کل جگی اوتار کے باپ کا نام وشنو داس ہوگا۔ وشنو کے معنی اللہ اور داس کے معنی عبد یعنی عبداللہ نام ہوگا۔ ماں کا نام سومتی یعنی امانت دار ہوگا۔ سو حضور کی والدہ کا نام آمنہ تھا۔ پہلے پہاڑ کے غار میں عبادت کریں گے۔ سو حضرت نے غار حرا میں عبادت کی۔ پھر شمالی پہاڑوں میں ہجرت کریں گے۔ سو ہجرت بھی ہوئی۔ پہاڑ کی کھوہ میں پرشرام سے تعلیم پاویں گے۔ پرش کہتے ہیں روح کو اور رام خدا کو یعنی روح خدا۔ مراد جبرئیل فرشتے سے ہے۔ سو حضرت جبرئیلؑ سب سے پہلے وحی لے کر آئے۔ شنبل نگری میں پیدا ہوں گے۔ شنبل دیپ کی نسبت مولانا نے ایک زبردست بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ شنبل ملک عرب کو کہتے ہیں کل جگی اوتار کے چار بھائی ہوں گے۔ جن کے ذریعہ وہ فتحیاب ہوں گے وغیرہ وغیرہ:

اس بیان سے میری غرض یہ ہے کہ جس طرح سب پیغمبر ہمارے حضور کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے۔ پس ہندوستانی رسولوں کی امت کو بھی حضورؐ کی تصدیق کرنی چاہئے۔ اور ہم کو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہئے۔ اسی میں ہندوستان کی ظاہری و باطنی بہبودی ہے۔ اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں دلی اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اگرچہ ہندوؤں کا مسلمان اور مسلمانوں کا ہندو ہونا مشکل ہے۔ نہ اس بیان سے میری یہ غرض ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں قوموں کی باہمی نفرت واجنبیت دور ہو۔ ہر ایک دوسرے کے پیشوا کی عزت کرے۔ اور گلے ملنے کے لئے پہلے مسلمانوں کا قدم آگے بڑھے۔ سلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین:

٭٭٭

# السلام علیکم

(از اخبار توحید ۱۹۱۲ء)

مسلمانوں کا ذریعہ خطاب ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ تم سلامت رہو۔
ہندوستان میں اس کی جگہ۔ آداب تسلیمات کا رواج ہو گیا تھا۔ اور اب گڈمارننگ
گڈنائٹ اور گڈبائی کے چرچے ہیں۔
یہ زمانہ کا اثر ہے۔ مگر مسلمان وہ ہے جو اپنے دل کو آثار وقت سے محفوظ رکھے۔
اور دینی امور کو اپنا شعار بنائے۔
خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خدا رسول کے مقرر کردہ سلام کی پیروی کرتے
ہیں اور ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو سلام علیکم و علیکم السلام
کہکر ہمکلام ہوتے ہیں۔
ہمارے خیال میں جن لوگوں کو خط و کتابت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ وہ بڑے خوش
قسمت ہیں کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی سلامتی کی دعائیں ان کو ملتی ہیں۔
ہم جس وقت توحید کے خطوط کھولتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑتی
ہے وہ سلام علیکم ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج پچاس سلامتی نامے ہم کو ملے تو
خدا کا شکرانہ بھیجتے ہیں کہ اس نے ہم کو ایسے مذہب میں پیدا کیا ہے جس میں سلام علیکم
جیسی پیاری اور مبارک چیز سے بات شروع ہوتی ہے۔
مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خط میں سلام علیکم نہیں ہے۔ یا اس کی جگہ کوئی
انگریزی لفظ ہے تو بے اختیار ہماری زبان سے افسوس نکلتا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ
سلام نہ لکھنے سے انہوں نے اپنا اور ہمارا دونوں کا نقصان کیا۔ اگر وہ سلام علیکم

لکھتے تو ہم اُس کے جواب میں "علیکم السلام" کہتے۔ گویا اس طرح دونوں طرف سے دُعا ہو جاتی۔ اور دونوں پر خدا اپنی سلامتی نازل فرماتا۔

اجنبی ملکوں میں جہاں مسلمان ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز یہی سلام علیکم ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے دینی بھائی سے مخاطب ہیں اور ہمارا مخاطب مسلمان ہے

لہٰذا اے مسلمانو! تم کو لازم ہے کہ جب آپس میں ملاقات کیا کرو یا کسی کو خط لکھو تو السلام علیکم ضرور استعمال کیا کرو۔ السّلام علیکم۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔

---

# مُرغ کی اذان

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

ہر سچا مسلمان جو رمضان شریف کی سحری کے لئے آج کل پچھلی رات کو بیدار رہتا ہے۔ مُرغ کی اذان سنتا ہوگا اس پردار جانور کی آواز میں غور کرنے والے مومنین کے لئے ایک بڑی نصیحت ہے۔ مرغ کہتا ہے میری اذان نیچرل ہے مگر بے نتیجہ ہے۔ مسجد کے مؤذن کی اذان اَن نیچرل ہے لیکن با نتیجہ ہے پس جو مسلمان خدا اور رسولؐ کے نام کو تقریر دلں میں اثر پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مگر احکام الٰہی پر عمل نہیں کرتے اُن کی مثال مُرغ کی اذان کی سی ہے۔ کہ دوسروں کو جگاتا ہے۔ اور خود عمل نہیں کرتا۔ اصل اذان مسجد کے مؤذن کی ہے جو نماز کے لئے بلاتا ہے اور خود بھی نماز پڑھتا ہے۔ مگر آج کل بعض اذان دینے والے مؤذن ایسے بھی ہیں جو اذان دیتے ہیں مگر خود نماز نہیں پڑھتے دلّی کی ایک مسجد میں ایسا مؤذن دیکھا تھا جس نے ۹ برس سے نماز نہیں پڑھی تھی حالانکہ روز اذان دیتا تھا

# تیس راتوں کی شان

## اندھیرا روشنی پر غالب ہے

ازاخبار توحید ۱۹۱۳ء

گیارہ مہینے کے رات دن رمضان کی تیس راتوں کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔
لوگ کہتے ہیں روزہ کا دن ہے میں کہتا ہوں کہ آجکل دن دُنیا ہے اور رات دین ہے
جس طرح دُنیا میں انسان اعمال کرتا ہے اور دین یعنی عالم آخرت میں اُس کا بدلہ پاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں دن کے وقت بھوک پیاس کے اعمال ہیں اور شام کو افطار کے بعد آخرت کی بہاریں ہیں۔

کیا خدا کی شان ہے۔ رمضان کی تیس راتیں سارے سال کے روشن دنوں پر بھاری ہیں۔ افطار کا لطف رات کے شروع میں تراویح کی کیفیت اسی شب تار میں سحری کی بہار اسی وقت تاریک میں اندھیرا جس قدر فخر کرے کم ہے۔ کہ خدا نے اس کی آبرو کو نور کے سامنے چار چاند لگا کر دوبالا کر دیا۔ رمضان کی راتیں وہ راتیں ہیں۔ جن میں قرآن شریف نازل ہوا۔ جن میں ایک رات ہزاروں راتوں سے بڑھکر ہے اور جو مسلمان قوم کے لئے تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے ایسی نعمت جس کی تجلیات آفتاب و ماہتاب اور تمام برق صفات انوار سے اعلےٰ ہیں۔ لہذا ہر مسلمان عورت مرد کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔

# نئی روشنی کی دوزخ جنت

(از صوفی جنوری ۱۹۱۵ء)

ایک چیز ہے جس کو نئی روشنی کہتے ہیں۔ وہ مٹی کے تیل یا گیس و برق کے لمپ نہیں ہیں بلکہ نئے بدلے ہوئے زمانے کے حالات۔ خیالات اور جذبات ہیں پرانے وقت کے لوگ اس کو اندھیری روشنی کہیں تو زیبا ہے کہ حضرت ابن عربیؒ نے فرمایا نور کی اصلیت سیاہ فام ہے۔ لیکن نئی روشنی والوں کو آج تک نور کی حقیقت میں پس و پیش ہے سورج چاند اور زمین کی مصنوعی روشنیوں کے سوا انہوں نے کبھی کسی کا مشاہدہ نہیں کیا پس ثابت ہوا کہ نور ایک وہمی چیز ہے۔ اور نئی روشنی والوں کو اندھیری روشنی کہنا ایک توہم ہے۔ پرانے لوگ ہمیشہ توہمات کے پانی پر قلعے بنایا کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی پھر زندہ ہوتا ہے اور اس کو دوزخ جنت میں جانا پڑتا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو چیز مر گئی فنا ہو گئی۔ اس کی جگہ دوسری آ گئی۔ نیچر بغیر ضرورت کے کوئی کام نہیں کرتی اور چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی عقلی ضرورت نہیں ہے لہٰذا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا غلط خزاں کے موسم میں درخت کے پتے سوکھ کر گر پڑتے ہیں۔ بہار میں دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں قدرت کا یہی قاعدہ ہے مردہ زندہ نہیں ہو سکتا اور سوکھے پتے دوبارہ ہرے نہیں ہو سکتے۔

جب قدرت اس پر قادر ہے کہ اور پتے پیدا کر دے تو اس کو پرانے پتوں کے ہرا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ نہ ضرورت ہے۔ نہ اس میں طاقت ہے کیونکہ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ پس یہ عقیدہ غلط ہے۔

ہم نے جو اچھے برے کام کئے تھے ان کا بدلہ قانون حکومت سے پا چکے۔ اب دوبارہ

حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے۔ اور چونکہ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ لہذا حشر کا ہونا اور میزان حساب میں نیکی بدی کا تولنا عبث ہے۔

جو گناہ ایسے ہوئے جن کی خبر قانون کو نہ ہوئی اُن پہ ہمارے دل نے جس کو ضمیر بھی کہتے ہیں ملامت کر دی اور ہم کو تکلیف وہ پشیمانی بھی ہو گئی۔ بس یہی حساب اور جزا و سزا ہے۔ اور کچھ ضرورت نہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہو۔ لہذا یہ عقیدہ بھی وہم ہے۔

جنت میں جن چیزوں کے دیئے جانے کے وعدے ہوئے ہیں وہ بالکل خلاف انسانیت ہیں۔ ایک مرد کئی کئی بیویاں رکھے گا۔ یہ تکلیف دہ کام ہے۔ حالانکہ جنت میں خوشی ہی خوشی بیان کی جاتی ہے۔

جنت میں سب جوان ہوں گے۔ یہ خلاف نیچر ہے۔ قدرت نے بوڑھے جوان کا فرق بڑی مصلحت سے رکھا ہے۔ سب ایک وضع کے ہوں گے تو لطف ہی کیا آئے گا۔ اور چونکہ یہ خلاف نیچر ہے۔ اسلئے غلط ہے۔ اور غلط ہے اس لئے وہم ہے۔ اور وہم ہے لہذا پرانے لوگوں کی بات ہے۔

جنت میں شراب ایک ہی قسم کی دی جائے گی۔ جس کا نام طہور ہے۔ مگر انسان کی خواہش رنگا رنگی چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے طرح طرح کی شرابیں بنائی ہیں۔ پس چونکہ یہ بھی خلاف فطرت ہے لہذا غلط ہے۔

جنت میں خدمت گار صرف لڑکے ہوں گے۔ اور چونکہ جنت کے باشندوں کو جوان ہونا ضروری ہے لہذا ثابت ہوا کہ یہ لڑکے جنت سے باہر رہیں گے۔ پس وہ خدمت کیونکر کریں گے لہذا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔

جنت میں مردوں کو زیور پہنائے جائیں گے۔ اور یہ خاصہ عورتوں کا ہے۔ لہذا خلاف فطرت ہے اور جو خلاف فطرت ہے وہ غلط ہے۔

جنت میں دودھ شہد کی نہریں ہوں گی لیکن شہد چھتے میں ہوتا ہے اور دودھ تھن

میں زمین میں اس کی نہر کا ہونا خلاف فطرت ہے لہٰذا غلط ہے ؞

جنت میں ایک موتی کا محل ہوگا۔ موتی اتنا بڑا ہوتا نہیں۔ اور یہ امر سراسر خلاف قدرت ہے لہٰذا غلط ہے ؞

دوزخ میں آگ ہی آگ بیان کی جاتی ہے اور اس میں سانپ بچھوؤں کا ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اور چونکہ آگ میں سانپ بچھو زندہ نہیں رہ سکتے لہٰذا یہ خلاف نیچر ہے اور غلط ہے ؞

دوزخ میں عذاب کے فرشتے بھی ہوں گے اور فرشتے نوری ہیں اور نور کو نار کا عکس بیان کیا جاتا ہے پس ثابت ہوا کہ فرشتے آگ میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان کا وہاں ہونا خلاف فطرت ہے لہٰذا غلط ہے ؞

فطرت نے ہر چیز کا علاج پیدا کیا ہے۔ پس اگر بالفرض دوزخ میں یہ سب باتیں ہونگی تو ان کا علاج بھی ضرور پیدا کیا ہوگا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ انسان کوئی آتش پروف آلہ ایجاد نہ کرے جس طرح کہ پانی سے بچنے کے لئے واٹر پروف کا آلہ نکلا ہے اور سانپ بچھوؤں سے بچنے کے واسطے اسی قسم کا آلہ نہ بنالے ؞

اس کے علاوہ دوزخ جنت ہوں گی کہاں۔ دُنیا کی زمین کا رقبہ انسان نے معلوم کر لیا ہے۔ اگر ابتدا سے سب آدمی زندہ ہو جائیں تو اس زمین میں اتنی گنجائش نہ ہوگی اور اس زمین کے علاوہ کسی دوسرے کرہ میں انسان کا زندہ رہنا محال ہے۔ کیونکہ وہ خاکی نژاد ہے اور جنس خاکی ہی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ دوزخ جنت کو زمین پر ہی ہونا چاہئے۔ اور زمین میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ پس یہ خلاف نیچر ہے۔ لہٰذا غلط ہے ؞

## نئی روشنی والوں کو جواب خود نئی روشنی یہ دیتی ہے ۔

چونکہ نیچر و فطرت یکساں حالت پر کبھی نہیں رہتی۔ بدلتا رہنا اس کا خاصہ ہے اس

واسطے ایک عرصہ دراز کے بعد اس میں غیر معمولی اور خلاف دستور تبدیلی کا ہونا لازمی ہے
اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ نئے آدمی زندہ کرنے کی بجائے پرانے مردوں کو زندہ کرے اور
چونکہ نیچر خود ضرورت ہے۔ اس لئے وہ کسی ایسی ضرورت کے ماتحت نہیں ہو سکتی جسکو
آدمی کی عقل ضرورت کہتی ہو ؛

قانون حکومت کے حق و ناحق فیصلہ کے لئے کونسی عدالت ہے۔ ہو سکتا ہے
کہ قانون نے غلطی کی اور فیصلہ ٹھیک نہ کیا۔ لہذا اقتضائے فطرت ہے کہ وہ جمع کرتے
کرتے سب ایک دن جزا و سزا پر نظر ثانی کرے اور ٹھیک ٹھیک فیصلے کردے ؛

بہت سے گناہ ہیں جن کو انسان کا ضمیر گناہ نہیں سمجھتا۔ اس لئے اس پر ملامت
نہیں کرتا اس کا فیصلہ ہونا ضروری اور نیچرل ہے۔ لہذا ہونا چاہیئے اور یوم آخرت
کو ہوگا ؛

جنت میں سب کام جنتی کی خواہش پر ہوں گے۔ اس لئے کہ قرآن شریف میں
وَفِیْہِ مَا تَشْتَھُوْنَ ط آیا ہے یعنی جنت میں جس کی خواہش کروگے وہی ملیگی۔ پس
اگر نئی روشنی والوں کو ایک ہی بیوی منظور ہوگی تو ایک ہی دی جائے گی۔ بلکہ وہ چاہینگے
تو ایک ولایتی مس بھی مل جائے گی ؛

جنت میں سب جوان ہوں گے کیونکہ وہ نیکیوں کا کلب گھر ہے۔ جس طرح دنیا میں
بوڑھوں کے کلب علیحدہ ہیں۔ جوانوں کے علیحدہ۔ مجردوں کے جدا۔ شادی شدہ لوگوں
کے علیحدہ۔ اور یہ کلب کے ممبر آپس میں ہنسی خوشی سے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ ہم میں
ناجنس بھی آئے۔ بلکہ ناجنس ممبر سے گھبراتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جنتی کلب میں سب
کا جوان ہونا حسب فیشن و نیچر ہے ؛

جنت میں خدمتگار لڑکے ہوں گے اور آپ ان کو لڑکے کہکر آواز دے سکیں گے
ان کی حیثیت خدمتگار رذلی ہوگی۔ مالک مکان کی نہ ہوگی۔ اس واسطے ان کا داخل جنت

ہونا اس طرح ثابت ہے جس طرح کلب گھر کے پوائز (لڑکوں) کا ٭

جنت میں ہر قسم کی شرابیں ہونگی - طہور کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی قسم ایک ہے بلکہ یہ کہ وہاں کی شراب پی کر آپ گندی موریوں میں اوندھے منہ نہیں گریں گے - وہ پاک نشہ ہوگا جس سے پاک جذبات و حالات ظاہر ہوں گے ٭

جنت کے زیور مثالاً بیان کئے گئے ہیں - آپ کو صرف ایک انگوٹھی ملیگی - جس میں سونا پنسل ملا ہوا ہوگا اور نکٹائی و کالر کا پن ملجائے گا - اپنی مرضی پر ہے ٭

دودھ تھن ہی میں نہیں ہوتا - ٹین کے ڈبوں میں بھی ہوا کرتا ہے جس نیچر نے اس کو منجمد کر کے اس قابل بنا دیا - وہی اس کی نہر بھی بہا سکتا ہے - یہی حال شہد کا ہے - ایک موتی کا محل خلاف نیچر نہیں ہے - اپنی خوردبین لگا کر کے دیکھ لینا - جس جگہ نیچر سارے جہان کے سب مرے ہوئے آدمیوں کو رکھے گی وہاں کے سمندر بھی چھوٹے نہ ہوں گے اور ان کے موتی بھی دنیا کے سمندروں کی مانند نہ ہوں گے ٭

دوزخ میں آگ کے اندر سانپ بچھوؤں کا زندہ رہنا عقل کے موافق ہے - آگ کے کیڑے دنیا میں پائے جاتے ہیں ٭

دوزخ کے فرشتے بھی آتشی نور کی مخلوق ہیں - اس لئے وہ اس کے اندر زندہ رہ سکتے ہیں ٭

بیشک فطرت نے ان کا علاج پیدا کیا ہے - اور بتا دیا ہے - اور وہ یہ ہے کہ مر کر زندہ ہونے پر یقین رکھو - اور اس خبر کے بیان کرنے والوں کے حکموں کو مانو اور ان پر عمل کرو ٭

تم واٹر پروف کی جگہ اگر آتش پروف نکال بھی لو - تب بھی دوزخ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے - تمہارے لئے آگ نہ ہوگی - سانپ بچھو نہ ہوں گے ٭

بلکہ بنک فیل ہونے کی خبریں ہوں گی - پیاری مسوں کے انکاری خطوط ہوں گے -

حقارت کے آوازے ہوں گے۔ شیم شیم کے نعرے ہوں گے۔ تم کو ہر وقت بارش اور کہر کا سامنا ہوگا۔ تمہارے تجارتی جہاز آنکھوں کے سامنے غرق کئے جائیں گے تم کو ہڑتالوں کی خبریں دی جائینگی۔ تم سے کہا جائیگا کہ تم آزاد نہیں ہو۔ تم کو سنایا جائے گا کہ سیلف گورنمنٹ تم کو نہیں مل سکتی۔ تمہارے خلاف اخباروں میں لمبے لمبے آرٹیکل چھاپے جائیں گے اور تم کو دکھائے جائیں گے ۔

تمہارے آگے تھیٹر اور بائیسکوپ کے تماشے ہوں گے اور ان میں تمہاری تحقیر و تضحیک کی جائے گی۔ تمکو ڈیم فول کہکر ٹھکرایا جائے گا۔ تم کو بغیر کالر و نکٹائی کے کپڑے پہنا کر بازار میں نکالا جائے گا۔ تم کو میلے اور ٹوٹے ہوئے بوٹ پہنکر مسوں کے کلب میں بھیجا جائیگا اور وہ تم پر قہقہہ لگائیں گی ۔

تم کو نہانے کو پانی نہ ملے گا۔ تم کو بٹھا کر پیشاب کرایا جائیگا۔ تم کو کہا جائیگا کہ اپنے ضمیر کے خلاف مضامین لکھو۔ اور تم کو چار و ناچار لکھنے پڑیں گے ۔

دوزخ میں تمہاری عورتوں کو پردے میں بٹھایا جائیگا۔ اور ان کے ناک کان چھیدے جائیں گے۔ چونکہ یہ سب باتیں تمہارے فیشن تمہاری عادت تمہارے خیالات اور تمہاری خواہشات کے خلاف ہوں گی اس واسطے ان میں تم کو وہی تکلیفیں ہوں گی جو ایک سیدھے سادے آدمی کو آگ اور سانپ بچھو سے ہو سکتی ہیں۔ اور اسی کا نام دوزخ ہے۔ پس تمہاری دوزخ وہی ہو گی جس سے تم کو تکلیف ہوتی ہے ۔

رہا یہ کہ دوزخ ہو گی کہاں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی خاکی زمین پر جس کو نیچر ربڑ کی طرح اتنا لمبا چوڑا بنا دے گی کہ ساری دنیا کے اگلے پچھلے مرنے والے اس میں بخوبی سما سکیں ۔

جبکہ فطرت آج کل کے معمولی زمانہ میں زمین کے طویل و مختصر کرنے کے سامان کہا رہی ہے تو اس زمانہ میں تو اس کے کارناموں کی کچھ حد نہ ہو گی۔ کیونکہ نیچر اس وقت ایک غیر معمولی

تبدیلی و انقلاب کی جانب ہو گی ۔

پس ثابت ہو گیا کہ میدان حشر جنت۔ دوزخ سب اس زمین پر ہوں گے۔ اور ان کا ہونا از روئے نیچر ثابت ہے ۔

نئی روشنی کی جنت و دوزخ کے بحث مباحثہ کو سنکر ان کو دیکھو جو دعوے وار تصوف ہیں اور اپنی دوزخ جنت سارے جہان سے الگ بتاتے ہیں کیا مجذوبانہ بڑ مار رہے ہیں کچھ کچھ تو سمجھ میں آتا ہے۔ ذرا کان لگا کر سُننا ۔

کس کی جنت۔ کس کی دوزخ **کسی نے بے چارے** بندوں کو کُن کی انگلی پر نچا رکھا ہے۔ کسی سے کہتے ہیں جنت دوں گا۔ کسی کو کہتے ہیں دوزخ میں ڈال دونگا کہیں دیدار کا وعدہ کرتے ہیں۔ کسی کے سامنے صاف مکر جاتے ہیں کہ بھلا مجھ کو کون دیکھ سکتا ہے میں کہیں دیکھنے کی چیز ہوں ؟

مانا کہ تم خدا ہو۔ تم قدرت والے ہو۔ تم کو سب کچھ آتا ہے۔ مگر ان اپنی بنائی ہوئی مورتوں کے ستانے میں کیا رکھا ہے۔ اس میں آپ کو کیا مزا آتا ہے۔ ہم تو جانیں جتبک کُنْ فَیَکُوْنُ کا عملدرآمد ہے۔ ہر ہستی دوزخ میں ہے اور جب یہ دور ختم ہو جائیگا ہر وجود جنت میں چلا جائے گا۔

# شذرات

**قہر خدا** پناہ! خدا کا غضب بُری چیز ہے۔ خبر آئی ہے کہ اٹلی کے ملک میں ہولناک زلزلہ آیا۔ شہروں کی آبادیاں سرنگوں ہو گئیں۔ لاکھوں آدمی مر گئے اور زخمی ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سینٹ پال کی مورت چھت سے گری اور پاش پاش ہو گئی ۔

اٹلی کے دل میں خدا کا خوف نہ رہا تھا اس نے بے گناہ عربوں پر چڑھائی کی تھی اور طرابلس میں ہزاروں معصوم عورتوں اور بچوں کو بیوہ اور یتیم ہی نہیں کیا بلکہ اُن کو سنگینوں اور بندوقوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم خود مختار ہیں۔ جو چاہیں کریں ہمارا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

لیکن آسمان کی سلطنت ان شرارتوں کو حساب کے رجسٹروں میں لکھ رہی تھی۔ آخر وقت آگیا اور فرشتے زلزلہ کا عذاب لیکر نازل ہوئے۔ اور اہل اٹلی کو زیر وزبر کر دیا ۰

اٹلی میں بت پرستی کا مرکز ہے۔ وہاں مسیح اور ان کے حواریوں کی پرستش ہوتی ہے گرجاؤں میں بُت رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قہر نے ان بتوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب تو جناب پوپ کو ہوشیار ہو کر بت پرستی چھوڑنی چاہئے ۰

اس واقعہ سے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ وہ ہر وقت خدا کے غیظ سے ڈرتے رہیں اور گناہوں سے توبہ کریں۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے ۰

اپنے دشمنوں کی تباہی سے خوش ہونا نامردی ہے یہ جو کچھ لکھا گیا اپنی قوم کی عزت اور نصیحت کی غرض سے لکھا گیا ہے کیونکہ میری قوم غفلت میں ہے۔

## صاحب بہادر کا سلام

تم نے سُنا ہوگا کہ جب کسی شخص سے کوئی انگریزی افسر ملاقات کرنی چاہتے ہیں تو چپراسی سے کہتے ہیں کہ فلاں کو ہمارا سلام دو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری ملاقات کے لئے بُلا لو ۰

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مومن بندہ کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو فرشتہ بھی آن کر یہی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تجھ کو سلام کہا ہے مومن کی روح یہ سُنکر خوشی خوشی جسم سے پرواز کر جاتی ہے ۰

مسلمان اپنے سب سے بڑے "صاحب" پر قربان ہوں۔ کیا ہی مہربان صاحب ہے۔ اپنے ناچیز مگر ایماندار بندوں کو کیسی محبت سے یاد فرماتا ہے۔ پھر کیوں نہ اسکی چاہت

اور وفاداری کا دم بھرا جائے ؟

## من کہ نازک بدن ہستم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب کا انتقال ہوا۔ تو آنحضرت ان کے دفنانے کے وقت فرماتے تھے۔ یہ نازک بدن لڑکی ہے مجھے ڈر تھا کہ قبر اس پر تنگی نہ کرے۔ مگر وہ اس پر فراخ ہو گئی ؟

امت بھی اپنے رسولؐ کی نازک بدن لڑکی ہے۔ بلکہ اولاد سے بڑھکر پیاری ہے۔ اس واسطے اس کو قبر کی مشکل کے وقت ان کی شفاعت کا بھروسہ ہے۔ خدائے تعالیٰ ہر مسلمان کو اس کٹھن وقت میں اپنے رسولؐ کی شفاعت نصیب کرے۔ آمین ؟

## مرغ کی اذان

مرغیوں نے مرغ کی اذانوں سے دق ہو کر مسجد کے مؤذن سے فریاد کی۔ اس نے کہا کیا تم مرغ کی اذان سنتی ہو ؟ میں تو پانچوں وقت محلہ میں چیخ چیخ کر اذان دیتا ہوں۔ مگر محلہ والوں کے کان میں آواز نہیں جاتی۔ ان سے تو تم اچھیں ؟

مرغ کو خبر ہوئی تو وہ بھی آیا۔ اور بولا میں اپنی ہستی کا یقین دلانے کو اذان دیتا ہوں۔ اس لئے تم کو ناگوار ہے۔ اور مؤذن خدا کی ہستی کا اعلان کرتا ہے اسلئے گوش اغیار بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ مگر خدا پرست دوڑے ہوئے مسجد میں آتے ہیں ؟

## غفلت کی نیند

سونے میں تم انگریزوں کی ریس نہ کرو۔ کیونکہ وہ اپنا کام کر چکے ہیں۔ اب ان کو آرام کی نیند اور زیادہ سونا زیبا دیتا ہے۔ تم امیروں کی نیند پر نظر نہ کرو۔ ان کو دولت نے بے فکر کر دیا ہے۔ تم اگر تندرست اور مضبوط ہو تو ڈاکٹروں کے قول پر نفرت کا ووٹ پاس کرو۔ اور خوب جاگو۔ ڈاکٹر تم سے کہتے ہیں کہ صحت سات گھنٹہ کی نیند مانگتی ہے۔ مگر بڑے بڑے کام کرنے والے کبھی چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے لہذا تم بھی زیادہ جاگا کرو۔

حضرت علیؓ نے فرمایا ہے۔ مَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَهِرَ اللَّیَالِیْ جو بڑا بننا چاہے اُسکو راتوں کو جاگنا چاہئے۔ پنولین زیادہ سونے کا دشمن تھا۔ اسی لئے قدرت نے بڑائی اور ناموری کو اس کا دوست بنایا۔

سردی کی راتیں بڑی ہوتی ہیں۔ تمہارا جو پیشہ ہو اس کو رات کی بیداری میں ترقی دو۔ اوّل شب سو جاؤ۔ پچھلی رات اٹھکر کام کرو۔ یہ دنیا کام کرنے کے لئے ہے۔ سونے کا دوسرا عالم ہے۔ عمر بھر سوتا رہیگا خاک کے سایہ تلے۔ مشہور قول ہے۔

اول اول شب بیداری سے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب عادت ہو جائے تو خوشی و شادمانی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ ہر وقت انسان بشاش رہتا ہے۔ کیونکہ فرض کی ادائگی اور ترقی ہی بڑی شادمانی کا سبب ہے۔

**قال ہے افعال** کہنے کو سب کہتے ہیں کہ کرنا کہنے سے بہتر ہے۔ مگر یہ بھی قول ہے فعل نہیں ہے۔ اس میں ہم کو انگریزوں سے سبق لینا چاہئے۔ جو کرتے پہلے ہیں اور کہتے بعد میں ہیں۔ ہندو کانگریس اور مسلم لیگ کے رزولیوشن میدان قال کے بڑے ہونہار جوان ہیں مگر حال کی صف میں آتے ہیں تو نابود ہو جاتے ہیں۔ اگر ان فیشن طراز جماعتوں کو ان قالیہ فوجوں پر فخر ہے تو خدا ان کے فخر کو زیادہ دن تک سلامتی نہ دے۔

ہمارا حال ماضی کی فراموشی اور استقبال کی خاموشی میں درخشاں ہونا چاہئے۔ اگر ہم بڑے تھے تو کیا ہوا۔ اگر ہم بڑے ہو جائیں گے تو کون جان سکتا ہے۔ ہم کو آج کی حالت دیکھنی چاہئے کہ نہ چھوٹے ہیں نہ بڑے ہیں۔ اور ضرورت ہم کو زندہ رہنے کی ہے خدا کرے ہم قال کو چھوڑیں اور مردان حال بنیں۔

**حقہ کیلئے تمباکو** ایک دوکاندار نے شکایت کی کہ ایک پیسہ کی بکری نہیں ہوتی۔ حقہ کا تمباکو بھی گھر سے لانا پڑتا ہے۔

اس سے کہنا چاہئیے کہ گھر میں جو پونجی تمبا کو منگاتی ہے۔ وہ بھی اس دوکان کی بدولت ہے۔ گھبراؤ نہیں یہ چیزوں کی تکلیف لڑائی تک ہے۔ اس کے بعد پھر خوش حالی ہو گی۔ انسان کو مصائب اور تکلیفات کے ایام میں صبر کو شیوہ بنانا چاہئیے۔ کیونکہ صبر اگر نیت کر کے کیا جائے تو بڑا اجر دلواتا ہے۔ ورنہ بے نیت تو ہر شخص کو اسی طرح دل مسوسنا پڑتا ہے جس طرح صابر کو۔ لہٰذا تم تکلیف کی حالت میں صبر کی نیت کیا کرو ؂

## ہم کو بڑا آدمی بننا چاہئیے

اب بت شکنی کا زمانہ نہیں ہے۔ طبیعتوں کا میلان لیڈر شکنی کی جانب رجوع ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ خلقت جن کو لیڈر سمجھتی ہے اور ان کے زور کو توڑنا چاہتی ہے وہ بھی غلطی پر ہے۔ اور جو لوگ چند حاکموں سے میل جول اور ایک خطاب کو لیڈر شپ سمجھتے ہیں وہ بھی غلط راستہ پر ہیں۔ کیونکہ لیڈری اور بڑائی ایک دوسری چیز ہے جس کے ماتحت دلوں کی کُنجیاں ہوتی ہیں ؂

تم خیال نہ کرو کہ اخباروں میں دھواں دھار مضمون لکھنے والے اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے والے لیڈر اور بڑے آدمی ہیں۔ نہیں یہ بھی دھوکا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بے اصول راستہ پر چلتے ہیں ؂

ہم کو بڑا آدمی بننے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کی تکمیل کیلئے محنت، جفاکشی، ایثار درکار ہے۔ ایثار خود دکھو کر بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ فطرت ہر انسان کی اس کی خواہشوں میں مددگار ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ رات دن جوانی کے مزے لوٹو۔ اور خرافات میں مبتلا رہو تو فطرت تم کو طاقت اور دولت دینے کو تیار پائی جائے گی۔ اگر تم کو منظور ہو کہ دوسروں کی خوشامد کر کے عارضی بڑائی حاصل کرو تو فطرت تمہاری دماغی قوتوں کو بہترین طریقے تعلیم کرے گی اور اگر تم یہ چاہو کہ حاکم و محکوم کو فائدہ پہونچا کر بڑائی حاصل کرو تو اس کے راستہ بھی تم کو فطرت ہی کے ذریعے مل جائیں گے۔ پھر تم بہت ہی بدنصیب

ہو گے اگر اپنی فطرتی طاقت سے نیک کام نہ لو۔

اگر دوسروں کی بھلائی کے لئے تم مشہور ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو قدرت تم کو قرآن کی زبان میں آواز دے گی وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اگر تم کو دوسروں کا بوجھ ہلکا کرنا منظور ہو تو وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ کا نعرہ سنو گے۔ تم چھوٹوں کا دل بڑھاؤ۔ خدا تم کو بڑا آدمی بنا دیگا۔ تم لیڈر بننے کی خواہش کرو اور مخلوق خدا کے کام آؤ۔ قدرت تمہاری مدد کرے گی اور تم بڑے آدمی بن جاؤ گے نمایش ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو ذریعہ بناؤ۔ اصل مقصود نہ سمجھو۔ کیونکہ نمایش تمہاری بڑائی کا آلہ ہے۔

**خلافت اور اخوت** اسلامی دنیا کے یہ دو مسئلے آج کل شدومد سے اہل تدبر کے زیر بحث ہیں۔ اخوت بھائی چارہ ایک رشتہ روحانی ہے۔ جو بطور نعمت الٰہی کے مسلمانوں کو عطا ہوا تھا قرآن شریف کے چوتھے پارے میں اس نعمت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ط

خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر مبذول ہوئی جبکہ تم آپس میں دشمن بنے ہوئے تھے تو تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اس کے بعد تم اس نعمت خدا کے طفیل میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے

قومیت۔ رنگت۔ وطنیت وغیرہ کئی جذبے ایسے ہیں جو افراد انسانی کو باہمی اتحاد کیلئے کھینچتے ہیں مگر اس کشش میں وہ دوام واستحکام نہیں پایا جاتا۔ جو جذبہ مذہب میں نظر آتا ہے۔ خواہ کوئی مذہب بھی ہو اس کے پیرو اپنے اعتقاد سے ایک رشتہ قلبی رکھتے ہیں۔ وہ مذہب اچھا ہو یا برا۔ ماننے والے کو اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں بمقابلہ دیگر مذاہب کے ایک نمایاں خصوصیت باہمی ارتباط کی پائی جاتی ہے۔ اس خصوصیت کو اگر مادی اسباب کے معیار سے معلوم کرنا چاہیں تو نہیں

نہیں کہہ سکتا کیا کیا وجوہات ذہن رسا بتائے۔ مگر بادی النظر میں اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ ہم اس زمانہ میں بے شمار مثالیں عیسائی اخوت کی دیکھ چکے ہیں۔ خود اپنے ملک میں ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کی باہمی الفت کا اندازہ ہو چکا ہے اگرچہ عیسائیوں کی اخوت زیادہ تر سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر عمل میں آتی تھی اور ترکی حکومت کی مسیحی رعایا میں بھی ہم اس کی مثالیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ بیرونی عیسائی حکمران اپنے ملکی مفاد کی بنا پر ان ترکی محکوموں کو بھڑکاتے تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عیسائیوں میں اخوت کا جذبہ ناپید نہیں ہے۔ وہ نہ ہوتا تو بیرونی تحریکیں کارگر کیسے ہوتیں؟

اسلامی اخوت باہر کی تحریکوں اور لیڈروں کی رہنمائیوں سے آزاد ہے۔ ایک گاؤں میں جاؤ جہاں کے باشندے جاہل محض اور تمام احساسات و علم سیاست سے نابلد ہوں۔ پھر ان سے کہو فلاں ملک میں مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ تو وہ ایسے بیقرار ہو جائیں گے گویا خود ان پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے۔ ایسے ہی خوشی کی خبر سُنکر ان کا مسرور ہونا لازمی ہے۔

یہ کیا طاقت ہے؟ اس کے جواب کیلئے ہم جو مادی دلائل غور و خوض سے پیدا کرتے ہیں وہ سب کی سب دست مادیت سے چھٹی جاتی ہیں۔ اور مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہر پھر کر اس آیت کی جانب رجوع کریں۔ اور کہیں کہ سارا طفیل عنایت رب کا ہے۔ اس کو منظور ہے کہ مسلمانوں میں اخوت کا جذبہ تمام قوموں سے ممتاز رہے۔ اس لئے ہمارے اندر اخوت کا جذبہ زیادہ ہے۔

اخوت کی مادی دلیلیں چند مذہبی مراسم ہیں جن میں حج اور نماز کو زیادہ خصوصیت ہے۔ مگر لاکھوں مسلمان نماز نہیں پڑھتے کروڑوں آج تک حج کو نہیں گئے لیکن ان میں جذبۂ اخوت کی کمی نہیں ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رشتہ کسی مخفی طاقت

کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ پوشیدہ قوت خدا ہے۔

جہاں مسلمانوں میں یہ زبردست طاقت اخوت کی ہے وہیں ان میں اختلاف بھی بکثرت ہے اور جو حسب روایات احادیث صحیحہ قیامت تک رہے گا اس اختلاف نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہونچایا۔ ان کی بادشاہتیں خاک میں مل گئیں۔ وہ ذلیل و محکوم بن گئے۔ لیکن ان حالات سے اخوت کی طاقت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا۔ وہ جوں کی توں موجود ہے۔ یہ اختلافات بظاہر ہم کو دھوکے میں ڈالتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم میں سے اخوت سلب ہو گئی ہے۔ مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ اختلاف اور چیز ہے۔ اور اخوت اور چیز ہے۔ اخوت بنیاد اور جڑ ہے۔ اور موجودہ اختلاف شاخوں اور سطح پر ہے۔ جڑ سے اسے کچھ سروکار نہیں ہے۔

غازی پور کی تازہ تقریر میں سر جیمس میسٹن لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے اخوت اسلامی کا تحیر و تعجب سے اعتراف کیا ہے کہ یہ باوجود پیہم صدمات کے اب تک اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے۔

کچھ تعجب کی بات نہیں ہے اسلامی اخوت کی ثابت قدمی ظاہری اعتبارات سے بالکل قرین عقل ہے۔ مسلمان نسل اور ملک کے ماتحت نہیں ہیں۔ ان کا اتحادی مرکز ا۔

## کلمۂ وحدت

ہے جو تمدنی۔ ملکی۔ سیاسی انقلابات سے قدرتًا متاثر نہیں ہوتا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا ہے کہ کوئی دوسری قوم اگر ایسی اخوت قایم کرنی چاہے تو نہیں کر سکتی مگر میں کہتا ہوں فطرت الٰہی نے اپنا احسان مسلمانوں کے لئے ریزرو نہیں کیا ہے۔ جو قوم کلمۂ توحید کا اقرار کر کے دل و جان سے اس پر یقین کرلے اس کی قومیت اخوت

کی طاقت سے اس طرح پامال ہو جائے گی جس طرح مسلمان دیکھے جاتے ہیں ؛

# حاصل مقصد

مسئلۂ اخوت کی تحقیق کا یہ ہے کہ برٹش حکومت اس طاقت کو نظر انداز نہ کرے اور سمجھے کہ جرمن اسلامی اخوت سے کام لے رہے ہیں اور ہماری سرکار ابھی تک صرف علمی پہلو سے اس پر بحث کر لینا کافی سمجھتی ہے۔ حالانکہ وقت عمل کا ہے۔ میں یہ سوال سنجیدگی سے کرتا ہوں کہ جرمنوں نے فرضی طریق سے ہی قبولیت اسلام کا دعویٰ کر کے جو اثر اخوت کی لہر میں حاصل کر لیا ہے اس کا جواب ہماری گورنمنٹ نے کیا دیا؟ یا تو اس کی باضابطہ موثر طریقہ سے تردید ہو یا اور کوئی صورت نکالی جائے ورنہ ان چرچوں کا اسلامی اخوت پر جو اثر پڑ رہا ہے۔ وہ معمولی نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے ؛

**خانۂ رسولؐ کے راز و نیاز** محبت کے راز و نیاز کی معاملہ بندیاں شاعروں نے بہت سی لکھیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملائے مگر خانہ داری کی الفتوں کا ان کو کیا مزا۔ جو درختوں اور جانوروں کی مثالوں میں جذبات عشق تلاش کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے سرو نے قمری کے دل کو جلایا لہذا پھل سے محروم رہا۔ کوئی بولا گل نے بلبل کو ستایا۔ اس لئے پژمردہ ہو کر کملایا۔ کسی نے شمع و پروانہ کے سوز و گداز پر آنسو بہائے۔ آؤ اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی راز و نیاز کو سنیں۔ اور اپنے گھروں میں اس محبت کا رواج دیں ؛

ذیل کا قصہ صحیح حدیثوں سے نقل کر کے لکھا جاتا ہے :-

**رسول خدا** (حضرت عائشہؓ سے مخاطب ہو کر) ہم جان لیتے ہیں کہ آج تم ہم سے خوش ہو یا ناراض ؛

**حضرت عائشہؓ:۔** کیونکر؟ میں قربان ہو جاؤں ذرا بتلایئے تو ؛

**رسول خداؐ:۔** جب تم ہم سے خوش ہوتی ہو تو یوں قسم کھاتی ہو۔ محمدؐ کے خدا کی قسم اور جب ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو۔ ابراہیمؑ کے خدا کی قسم۔

**حضرت عائشہؓ:۔** (متبسم ہو کر) ہاں یا رسول اللہ! خفگی میں آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔ نہ کہ آپ کو ؛

اس راز و نیاز میں جو پاکبازانہ لطف ہے۔ وہ اہل محبت سے مخفی نہیں۔ کونسا گھر ہے جہاں رنجشیں پیدا نہیں ہوتیں مگر رنج ہو تو بس اتنا کہ فریقین اپنے جذبات اشاروں کنایوں میں ادا کر کے جی کی بھڑاس نکال لیں۔ نہ یہ کہ توڑ پھوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کر بیٹھیں ؛

## مقصود زندگی

ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود
کسے خبر ہے کہ مقصود زندگی کیا ہے
(اکبر)

نئی روشنی نے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اچھا کھانا۔ اچھا پہننا اور عزت کیساتھ بسر کر کے مر جانا ہر انسان کا مقصد زندگانی ہے ؛

مگر کوئی پوچھے کہ یہ باتیں تو زندگی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان باتوں کا حاصل مقصد کیا ہوا کیا اتنی بڑی دنیا۔ یہ عظیم الشان کائنات یہ عقل کا پتلا آدم زاد اس لئے پیدا ہوا کہ دو نوالے کھائے۔ دو کپڑے پہنے۔ چار سلام لے اور آنکھ بند کر کے موت کے حوالے ہو جائے ؛

مذہب کہتا ہے۔ عبادت رب مقصود زندگی ہے۔ مگر فطرت کہتی ہے زندگی خود اپنا مقصود ہے۔ زندگی کی شناخت کے لئے زندگی ملی ہے۔ یہ مجہول کی مجہول تعریف نہیں ہے۔ غور کرو ہر ذرہ کی حیات اپنے وجود کے عرفان کے لئے ہے ؛

اور انسان جو تمام موجودات کا خلاصہ ہے اپنی اور تمام کائنات کی زندگی

کو پہچاننے اور اُس سے خالق کا عرفان حاصل کرنے کو پیدا ہوا ہے۔ جب شناخت ہوتی ہے۔ خود سروں کا سر جھکا کر سجدہ میں گر پڑتا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ :-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًاۚ

پھر عبادت و طاعت بھی شروع ہوتی ہے جو بیان مذہب کی رو سے مقصود زندگانی ہے۔ اور کھانے پینے رہنے سہنے کا بھی اصلی لطف آتا ہے جو نئی روشنی کے عقیدے میں مطلوب حیات ہے۔ واہ عرفان تیری کیا بات ہے۔ میری پہچان میں تجھ پر قربان۔ تو آجائے تو جینے کا مزا مل جائے ؎

## خاک کا ٹھکانا

جب جان خاک میں ملی۔ تو سب نے شادیانے بجائے ترانے گائے اور ہر ایک نے نورِ چشم لختِ جگر کہکر اس خاک آلود جان کو سینے سے لگایا۔ ماں نے گود میں اٹھایا۔ باپ نے آنکھوں پر بٹھایا۔ اور جب جان خاک سے آزاد ہوئی۔ مٹی کی آلودگاری سے نجات ملی تو آہ و بکا کے نالے بلند ہوئے۔ کسی نے کہا کہ ہائے میرا لال۔ کوئی بولا ارے میرے سرتاج۔ عورت۔ مرد بچے۔ بوڑھے یکساں رونے پیٹنے میں مصروف ہوئے ؎

کیا خدا کی شان ہے۔ یہ انسان بھی کس قدر انجان ہے۔ ہنسنے کے وقت روتا ہے اور رونے کے موقع پر ہنستا ہے۔ کوئی اس کو بتائے۔ خاک اور جان کے رُتبوں کا فرق سمجھائے۔ جان جسم خاک میں اپنی خوشی سے نہیں آئی تھی۔ حکم حاکم سے مجبور تھی۔ حاکم کو خاک کا رتبہ بڑھانا تھا۔ ورنہ جان کا خاک نہیں کوئی اور ٹھکانا تھا ؎

خاک نے درجہ پایا۔ کچھ دن امر اللہ کے سانسوں کو پیار کے سینے سے لگایا۔ آخر وقت مقرر نے اپنی جان کو رہائی دی۔ اور خاک کو اسکے ٹھکانے پر پہنچایا ؎

خاک کا ٹھکانا خاک ہے۔ جان کا ٹھکانا شہ لولاک ہے۔ خاک اپنے ٹھکانے میں پہنچکر غمناک بن جاتی ہے اور جان کا جو حال ہوتا ہے اس کا اظہار الفاظ و معانی کی حد سے باہر ہے۔ پھر کون بتائے سوائے اس کے کہ جناب اکبر کا گیت گائے اور یہ شعر پڑھے ؎

جان جب خاک میں ملتی ہے تو ہوتی ہے خوشی
خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

# اس کتاب کی غلطیاں

ناظرین کتاب سی پارۂ دل یعنے مجموعہ مضامین حسن نظامی کو معلوم ہو کہ یہ کتاب سالہاسال سے غلط چھپ رہی تھی۔ کیونکہ ہر ایڈیشن کی لکھائی اور چھپائی کے وقت دفتر کے ملازم اس کی صحت کرتے تھے مگر وہ ہمیشہ ہر ایڈیشن میں غلطیاں درست کرنے کی بجائے اور نئی غلطیاں بڑھا دیتے تھے کیونکہ وہ ادبی ذوق اور زبان کے محاوروں سے ناواقف ہوتے تھے۔

گذشتہ ایڈیشن کا کاغذ بھی بہت ہلکا اور خراب تھا جو میرے اصول کے خلاف ہے کیونکہ میں ہمیشہ اپنی کتابیں اچھے کاغذ پر چھپواتا ہوں۔

اس لئے میں نے اس ایڈیشن کو خود درست کیا۔ یعنی پوری کتاب کی کاپیاں پڑھیں اور اُن کو درست کیا۔ ہر سطر میں کاتبوں نے شرمناک اور افسوسناک غلطیاں کی تھیں۔ اور دوسرے ایڈیشن کے لکھنے والے کاتب مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے تھے نہ کاتب غور کرتے تھے نہ صحت کرنے والے۔

میں نے پورے ایک سال کی محنت سے پوری کتاب کی کاپیاں درست کیں۔ اور اب یہ کتاب ایک حد تک درست ہو گئی ہے۔ اگرچہ اب بھی چھپائی کی غلطیاں رہ گئی ہوں گی کیونکہ میں نے چھاپہ خانہ میں جانے کے بعد پروف نہیں دیکھے۔ البتہ میرے مکرم اور محسن منشی قربان علی صاحب بسمل ایڈیٹر اردوئے معلی دہلی نے اس کے پروف پڑھے ہیں اور انہی کے اہتمام سے یہ کتاب چھپی ہے اس لئے امید ہے کہ چھپائی کی غلطیاں بھی بہت کم ہوں گی۔

حسن نظامی دہلوی
اگست ۱۹۳۷ عیسوی

# پانچویں منزل

## سیاست معاشرت تمدن

## تاج اور کلاہِ درویشی

### دربار کی یادگار

نظام المشائخ ۱۹۱۱ء عیسوی

دہلی میں دربار ہے۔ شہنشاہ ہندوستان و انگلستان یہاں آئیں گے جنگل میں منگل ہوگا۔ ادنے اعلےٰ چھوٹا بڑا۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ موسائی خوش ہوگا۔ اور خوشی کا اظہار کرے گا۔

آؤ ہم بھی شاہ جارج کو مبارکباد دیں۔ مگر ساری دنیا انگریزی قوم اور انگریزی بادشاہ کو مبارکباد دیتی ہے۔ ہم صوفیوں کی طرف سے اس چیز کو مبارکباد دیں جو سب خوشیوں کا مرکز ہے۔ بیشمار امیدوں کا ملجا و ماوا ہے۔ یعنی:۔

## تاج

دراصل تاج ہی وہ چیز ہے جس پر بادشاہی شہنشاہی کی مہر لگی ہوئی ہے بغیر تاج

کے سب انسان برابر ہیں۔ وہی دو آنکھیں وہی ایک زبان۔ دل بھی ایک۔ قد بھی بہت اونچا نہیں۔ سانس بھی وہی۔ پیاس بجھانے کو پانی بھی۔ اور پیٹ بھرنے کو روٹی بھی یکساں۔ حضرت تاج سر پہ آجاتے ہیں تو یہ انسانی دو گز کی مورت بادشاہ کہلانے لگتی ہے دیکھنا اس تاج کے اجزاء پر غور کرنا۔ یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے کیوں کر اس میں یہ عظمت یہ طاقت۔ یہ تاثیر آگئی کہ جہاں یہ سر پہ پہنچا کروڑوں سر اس کے سامنے جھکنے لگے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو انسانوں نے بنایا ہے۔ اور اسمیں وہی اجزاء ہیں جو ہر کس و ناکس کے استعمال میں آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ جب وہ اجزاء تاج کی شکل اختیار کر لیں تو انسان کو بادشاہ بنادیں۔ اور گدا کی گدڑی میں سے جائیں تو حقارت و ذلت کا ہدف بنیں۔ ہو نہ ہو اسکی حقیقت میں اس کے معانی میں کوئی بھید ہے۔ ان سے کہو جو صوفی کہلاتے ہیں۔ جنکی دینی و دنیاوی زندگی حقیقت شناسی ہے۔ تاج کی حقیقت پر غور کریں کہ وہ اس شکل میں آکر ایسا اثر دار کیوں ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ والا معاملہ ہے۔ ایسے بادشاہ بھی گذرے ہیں جن کے تاج کی کچھ عزت نہ تھی۔ تلوار کے زور سے ملک لیا اور کچھ دن کے بعد فنا ہو گئے۔ اور ایسے شہنشاہوں کا ذکر بھی تاریخوں میں مذکور ہے جن کو مرنے کے بعد کفن بھی میسر نہ آیا۔

شاہ جارج کی تاجپوشی لندن میں ہو چکی۔ ہندوستان بھی ان کی حکومت کا ایک حصہ ہے۔ اس کے لئے دہلی میں خود تشریف لاکر اپنی تاج پوشی کا اعلان کریں گے! اعلان کرتے وقت ان کا دل خوش ہوگا۔ ان کی خوشی سے رعیت بھی شاد کام ہوگی۔ رعیت کے سب طبقے علیحدہ علیحدہ مبارکباد دیں گے۔ درویشوں اور صوفیوں کی طرف سے کلاہ درویشی۔ صدائے قلندرانہ میں تہنیت گزار ہے۔

"جارج" بابا کی خیر۔ کر بھلا۔ ہو بھلا۔ سانس کی قدر کر۔ آس والوں کی آس بر لا۔ گھوڑے

والے۔ جوڑے والے۔ توپوں والے۔ توپوں والے یشادرہ۔ آبادرہ۔ تیرے جہازوں
کی خیر۔ اور اس آزادی کا بول بالا جو جہاز کے جھنڈوں میں لہرا رہی ہے۔ فقیروں کیطرف
بھی دیکھ۔ یہ وہ ہیں جو مغرور اور متکبر خود سر جفاکار بادشاہوں کو کھری سُنا دیا کرتے
تھے۔ تو تو نیک دل اور نرم مزاج ہے۔ تیری حکومت میں ہر بات سُننے کی صلاحیت ہے
دیکھ یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ دہوکے کی ٹٹی ہے۔ اس کی شان و شوکت میں جی نہ
لگا۔ اور اُسکی طرف متوجہ ہو جس نے تجھکو یہ شان و شوکت عطا فرمائی ہے۔

اس ہندوستان میں اُن ہندو مہاراجاؤں کی اولاد جو ایک زمانے میں اس ملک
کے تاجور تھے۔ کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہے تغلق اور خلجی خاندان کے شہزادے اور
شہزادیاں دہلی میں فاقے کرتے ہیں اور تغلق آباد کے عالیشان قلعے کی کوٹھریوں میں اپنی
گزشتہ عظمت کو یاد کر رہے ہیں۔

تیموری جاہ و جلال کی افسردہ نشانیاں شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے محلّوں
میں فاقہ کشی کر رہی ہیں۔ کیوں۔ اس واسطے کہ انہوں نے دنیاوی عیش و عشرت میں
اپنے انجام کار کو بھلا دیا۔ گردش دوراں کو یاد نہ رکھا۔ تو نہ بھول۔ تیری یاد ہمیشہ قایم ہیگی
غرور سے اکڑ کر نہ چل۔ تیرے تاج کو دائمی قرار نصیب ہوگا۔

خدا خوش نصیب ملکہ "میری" کے سُہاگ کو چار چاند لگائے۔ اور وہ دیکھیں کہ غریبوں
کی دعاؤں کے کپڑے کارچوبی چمکدار کپڑوں سے لاکھ درجہ اچھے ہیں۔ انہیں کو ہمیشہ
استعمال کریں۔

یہ درویشی کلاہ بھی اقلیم تصوف کی حکومت کا ایک تاج ہے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے
ایمان کا سکہ چلاتا ہے۔ خدائی توپوں اور فوجوں کو رکاب میں رکھتا ہے اے بادشاہ!
اس کی دوستانہ مبارکباد قبول کر۔ اور سربلند ہو۔

# ٹھکانا ایک بستر کا

(از اخبار زمیندار فروری ۱۹۱۳ء)

انگریزی سرکار! تجھ کو قرار۔ تیرے نرم گرم بستر کو قرار شاد رہ۔ آباد رہ۔ مسلمان فقیر ہیں بے نوا ہیں۔ مگر تیرے اس بستر کو نظر لگانے والے فقیر نہیں ہیں جو مشرق و مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کو صرف ذرا سی جگہ تیرے دل میں درکار ہے جس میں مسلم کی ہستی مختصر کے لئے ٹھکانا ایک بستر کا ہو جائے۔

اے ہندو سندھ میں پاؤں پھیلانے والی گورنمنٹ! نیند ہماری آنکھوں میں بھی آتی ہے ہم کو بھی گوشۂ عافیت دے۔ زیادہ نہیں فقط

## ٹھکانا ایک بستر کا

کل کے دن ہم تاج والے تخت و بخت کے مالک تھے۔ آج کے دن ہم تیرے راج کے سائے تخت کو تختہ بنائے بخت و اقبال لٹائے بے یار و مددگار کھڑے ہیں ملک نہیں مانگتے۔ تاج و تخت طلب نہیں کرتے۔ ہمیں تو محض درکار ہے۔

## ٹھکانا ایک بستر کا

دہلی بسانا مبارک۔ لیکن ہمارے نشیمن کو نہ اجاڑ۔ ہمارے ٹوٹے ہوئے کو حجرہ سے نہ پھینک۔ دیکھ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ بس یہی باقی ہے۔

## ٹھکانا ایک بستر کا

سنتے ہیں تجویز شدہ نئی دلّی کی تعمیر میں وہ سب رقبہ آگیا ہے جس میں ہم

اجڑنے والوں کی مسجدیں ہیں۔ خانقاہیں۔ مزارات ہیں۔ اور تاریخی چیزیں ہیں۔ جن کو زمین سے اُبھرا ہوا دیکھکر سانس آتا جاتا ہے۔ یہ مٹ جائیں گی تو ہمارا وہ سب کچھ مٹ جائے گا جس کو ہم کہا کرتے ہیں کہ ابھی باقی ہے۔

## ٹھکانا ایک بستر کا

حلقۂ نظام المشائخ نے پنجاب گورنمنٹ کو درخواست بھیجی ہے کہ ان مقدس مقامات کی حفاظت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ اور حلقہ مجوزہ رقبہ کے اندر آئی ہوئی تمام مسجدوں خانقاہوں۔ مزارات و تاریخی مقامات کی فہرست بتا رہا ہے۔ اسپر (جبکہ وہ پیش ہو) نظر توجہ کی جائے تاکہ ہم سب گداگران دلفگار جارج سلطان کے ارمان کو خوشی و خرمی سے پورا ہوتے دیکھیں اور کہیں مل گیا ہمارا۔

## ٹھکانا ایک بستر کا

عقل دور اندیش رکھنے والے انگریزو۔ ہمیں تم پر بھروسہ ہے۔ اعتماد ہے۔ کہ تم یقیناً ہماری اس شکستہ آواز پر کان دھروگے اور احتیاط کے ساتھ اُن نشانیوں کو قائم رکھوگے جہاں ہے ہمارا۔

## ٹھکانا ایک بستر کا

مسلم پبلک کو اگر اس سوختہ طلبگاری میں بوئے ادب و وفا شعاری محسوس ہو اور کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو اس سے بھی درخواست ہے کہ اس صدا میں سُر ملائے اور کہے۔ ہاں۔ باقی رہے،،

## ٹھکانا ایک بستر کا

# چمارزادہ سیّد کی گود میں

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

نیچ زاد چھوکرے۔ آ میری گود میں آجا۔ تو شودر ہے۔ کمین ہے۔ پلید ہے۔ گندہ ہے مگر میرے واحد خدا کا بندہ ہے۔ مجھ جیسا آدمی ہے۔ ناک کان۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ زبان دل و دماغ رکھتا ہے۔ تجھ کو کس نے اچھوت اور ناپاک بنا دیا۔ نہیں۔ تو پاک۔ پوتر ہے۔ عزت دار بلند مرتبہ ہے۔ کون ہے جو تجھکو خدا کی درگاہ میں جھکنے سے روکتا ہے۔ مندر مسجد اور گرجا میں جانے سے منع کرتا ہے۔ کیا ہندو تجھ کو اس لئے مندر شوالے میں نہیں آنے دیتے کہ تو نے نیچ ذات کے گھر میں جنم پایا ہے۔ کیا عیسائی گورا اس واسطے اپنے بڑے درجہ کے گرجا میں تیرے گھسنے کا روادار نہیں کہ تو ناشایستہ جاہل اور کالا دیسی ہے۔ کیا مسلمان تیرے میلے میلے ہاتھ پاؤں دیکھکر گھن کھاتا ہے اور مسجد میں نہیں آنے دیتا۔

تو آ۔ سیّد فقیر عربی رسولؐ کا فرزند۔ تیرے ہاتھ پاؤں دہوئے گا اور اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد توحید میں ساتھ لے چلیگا۔

بابا۔ اپنی قدر پہچان۔ میں تجھ پر قربان۔ تو انسان ہے۔ بلند شان ہے خلیفۃ المسلمین محمد خامس کا لخت جگر۔ خاقان الہند جارج خامس کا نور نظر۔ اور تو اے غریب چمار کے پسر خدا کی درگاہ میں سب برابر ہو۔ آؤ عرب دیس کے مہاراجہ اونچی ذات اور نیچی ذات کو برابری کی نگاہ سے دیکھنے والے پتی کی سیوا اور مہا کریں۔ جس نے پریم پرچار میں امیر غریب۔ ادنے اعلےٰ چھوٹے بڑے پڑھے ان پڑھ کی کچھ تمیز اور قید نہیں رکھی۔ اور اُپدیش دیا۔ ذات پات نا پوچھے کوئے۔ ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے۔

تو آ۔ ہر کے نام کی بانسری بجائیں۔ ہر کو ڈھونڈہیں۔ ہر کو پائیں۔

# جیبی گھڑی کی سازش

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

غلطی یہ ہوئی کہ گھڑی کو بائیں طرف کی جیب میں رکھا۔ وہاں اس شریر چھوٹی کھوٹی فتنی نے میرے دل کو بہکا لیا۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ دل آخر گوشت کا لوتھڑا تھا۔ گھڑی کے چلتے پرزوں سے کیونکر بچ سکتا۔

گھڑی نے جب وہ جیب کے ہوٹل میں اُتری۔ پاس ایک دھڑکنے والی آواز سنی اس کو معلوم ہوا کہ یہاں قریب میں کوئی بے قرار چیز ٹھہری ہوئی ہے۔ اسلئے اس نے کہا تم کون ہو۔ کیا تم بغیر انٹرڈیوس اور تعارف کے بات کر سکتے ہو۔

دل اس وقت ذکر خدا کر رہا تھا۔ مرشد کا بتایا ہوا پاس انفاس اُسکے پاس تھا اسکو کسی غیر سے مخاطب ہونے کی اجازت نہ تھی۔ نہ یاد الٰہی کے سرور و لطف میں وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونا پسند کرتا تھا۔

مگر نئے مہمان کی خاطر سے اس نے اتنا کہا۔ میں دل ہوں۔ سینے کے حجرے میں مدت سے رہتا ہوں۔ آپ کب تشریف لائے؟ میرے قابل کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔

کیونکہ مجھ کو میرے رسولؐ نے حکم دیا ہے کہ اپنے پڑوسی کے کام آنا چاہئے۔ اپنے مہمان کی خاطرداری کرنی چاہئے۔ ولایتی گھڑی نے اس گوشہ نشین اللہ والے کی نرم اور مہربان آواز سنکر نازو دلربایانہ سے کہا۔

تھینکیو مائی ڈیر ہارٹ! شکریہ میرے پیارے دل۔ کیا آپ میرے پاس آسکتے ہیں؟ میں آپ کی شرکت سے اپنی میز کا فخر بڑھانا چاہتی ہوں۔ آپ کا دم سینے کی اندھیری کوٹھری میں گھبرا گیا ہوگا۔ باہر نکلئے۔ میرے فنر دار سایے کو دیکھئے۔ اور ہیرے یاقوت

کے زیور ملاحظہ فرمائیے جن کو میں نے پہن رکھا ہے۔

زاہد خشک مزاج دل نے آہ سرد بھری۔ لیکن ایٹی کیٹ (آداب فیشن کے خلاف) پریزاد گھڑی کے پُر ارمان پیام کا جواب نہ دیا۔

فیشن ایبل گھڑی نے اس خاموشی کو اپنی انسلٹ (توہین) سمجھا اور تیوری پر بل ڈال کر اندر ہی اندر جزبز ہو کر رہ گئی۔

اب اس نے انتقام لینا چاہا۔ وہ خلوت نشین عابد کا تقوے توڑنے کے لئے تیار ہو گئی اور سوچنے لگی۔ کیونکر میں اس نیم وحشی مگر خوبصورت چیز کو اپنے قابو میں لا سکتی ہوں۔

اتنے میں بارہ بجے کی توپ چلی۔ گھڑی والے نے اس کو جیب سے نکالا۔ اور دست شوقین کی انگلیوں سے چٹکی بجاتے کوک بھر دی۔ یہ کوک گھڑی کی غذا تھی۔ جس نے اس کے دماغ میں کام کرنے اور دل کے خلاف غصہ نکالنے کیلئے ایک طاقت و پھرتی پیدا کر دی۔ اور گھڑی نے تازہ دم ہو کر کام شروع کیا۔

پہلے گھڑی نے اپنا کھٹکا دل کے کھٹکے سے ملا دیا۔ اور اس طرح گویا اس نے دل کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ دل نے جب گھڑی کی صدائے وحدت سُنی تو بہت خوش ہوا۔ اور اپنی مشغولی حق سے یکسو ہو کر گھڑی سے یوں خطاب کیا۔ تمہارا کھٹکا بہت مضطرب اور جلد بازانہ ہے۔ ذرا آہستہ آہستہ سانس روک کر ذکر کرو۔ ورنہ عمر جلدی تمام ہو جائیگی میرے مرشد نے حبس دم کی اس واسطے تلقین فرمائی ہے کہ سانس کے اضطراب کو قرار ہے۔ اور سکون و طمانیت سے سب کام پورے ہوں۔

گھڑی بولی۔ میں بے تہذیب دیسی سے ہمکلام ہونا نہیں چاہتی۔ تو ولایت کے آداب سے واقف نہیں ہے۔ تو نے ابھی سوسائٹی کے اعلےٰ رکن عورت ذات کی توہین کی ہے کیوں اس کی مُنہ مانگی مراد کو پورا نہ کیا۔

دل نے جواب دیا میں نامحرم کے پہلو میں ایسے وقت جبکہ میسر اور یہاں کوئی نہ تھا کیونکر

آسکتا تھا۔ یہ میرے مذہب کے خلاف تھا۔ کیونکہ وہ غیر عورت کے پاس تخلیہ میں بیٹھنا کجا صورت دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

کواری گھڑی نے دل کی بات سن کر ایک بجلی بھرا تبسم کیا اور کہا معاف کیجئے میں آپ کے مذہب کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ یہ تہذیب و شائستگی نیز قانون حکومت کے خلاف ہے۔ کہ کسی کے مذہبی عقیدے میں دخل دیا جائے مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ زندگی کے مزے سے محروم ہو گئے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ عورت اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ وہ مجلسوں اور محفلوں کی کیفیت اور زیب و زینت کو بڑھائے اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی عصمت ایک شخص کی جائز ملکیت ہونی چاہیئے مگر یہ بالکل ظلم ہے کہ وہ اجنبی مردوں کو اپنے ہنس مکھ چہرے اور اپنی میٹھی باتوں سے محروم کر دے ہماری ولایت کا دستور بہت اچھا کہ غیر شخص دوسرے کی بیوی سے تخلیہ کی ملاقات کر سکتا ہے۔ ہوا خوری کو ساتھ لیجا سکتا ہے اور اس کے خاوند کے سامنے بیوی کے حسن و جمال کی تعریف کر سکتا ہے۔ تم دیسی لوگ بڑے وحشی ہو۔ اگر کسی کے سامنے اس کی بیوی کی تعریف کر دی جائے تو وہ یقیناً چھری مارنے پر آمادہ ہو جائیگا۔

دل گھڑی کی جادو بھری تقریر سے موم ہو گیا۔ اُس نے اپنا مقدس ہاتھ ڈرتے ڈرتے اٹھایا اور گھڑی کے ہاتھ کو پکڑ کر چومنا چاہا۔ مگر یکایک اس کو خدا کے ڈر نے اس گناہ سے روکا اور اس نے کانپ کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ دل کی اس حرکت سے گھڑی کھل کھلا کر ہنسی اور بلیک فول بلیک فول (بے وقوف کالا بے وقوف کالا) کہکر عشق کے کوچے سے ناآشنا غریب دل کو پریشان کر دیا۔

آخر دل سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا تم میں ایسی کیا خوبی ہے جو سو روپیہ خرچ کر کے تمکو خریدا گیا۔ تم جن چیزوں کو ہیرے یاقوت کے زیور کہتی ہو وہ معمولی پتھر کے ریزے ہیں۔ تمہارے اندر چند پیتل کے پرزوں کے سوا رکھا گیا ہے۔ ہندوستانی در حقیقت کالے

بے وقوف ہیں جن کو وقت کی پابندی کا تو کچھ خیال نہیں مگر یورپ کی تقلید میں پیتل کے چند ٹکڑوں کو چاندی کے سکے دیکر خرید لیتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف یہ بیکار پیتلی ٹکڑے رہ جاتے ہیں اور ولایت میں چاندی پہنچ جاتی ہے۔

میرا بس ہو تو سارے ہندوستان میں ڈھنڈورہ پیٹ دوں کہ گھڑی وہی رکھے جو وقت کی قدر جانتا ہو۔ ظاہری نمایش کے لئے کوئی اپنی دولت غیر ملک میں نہ بھیجے۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ جب تک اپنے ملک میں گھڑی کے کارخانے قایم نہ ہو لیں اور یہاں گھڑیاں نہ بننے لگیں کوئی ہندوستانی گھڑی نہ خریدے۔

دل کی اس باغیانہ تقریر سے گھڑی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے اپنے خانساماں کو بلایا اور اس درویش صفت مگر سرکش وجود کو دھکے دیکر نکلوا دیا۔

جناب دل نکل تو آئے مگر اب اُن پر گھڑی کے عشق کا جنون سوار ہے۔ گھڑی کی طلائی زنجیر کے خیال کو اپنے پاؤں کی بیڑی بنا رکھا ہے۔

میں کیونکر کہوں کہ گھڑی کی سازش نے میرے دل کو کہیں کا نہ رکھا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا



# چھڑکاؤ کی گاڑی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

گرد آباد سڑک پر دیکھا ہو گا۔ چھڑکاؤ کرنے والی گاڑی کیونکر تپتی ہوئی زمین کو سیراب کرتی ہے راستہ چلنے والے مسافروں کو تکلیف دینے والی خاک کا منہ بند کرنے کیلئے

اپنا سارا سرمایہ مٹی میں ملا دیتی ہے۔

تمہارے لئے اس میں عبرت و نصیحت ہے۔ اگر تم ذرا غور و فکر کی عادت ڈال لو تو دُنیا کی ہر چیز تمکو راستہ بتائے گی مگر تم تو زندگی کی کش مکش میں آنکھہ بند کرکے پڑا رہنا چاہتے ہو کہیں اس طرح زندگی بسر ہوا کرتی ہے۔

ظاہر میں چھڑکاؤ کی گاڑی بڑی فضول خرچ معلوم ہوتی ہے۔ اپنا پانی بے تحاشا بہاتی ہے۔ چنانچہ ایک گنوار کا قصہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی شہر میں گیا اور وہاں چھڑکاؤ کی گاڑی کو دیکھا تو کہنے لگا یہ گاڑی والا بھی بڑا بے وقوف ہے۔ پانی بہ رہا ہے اور اسکو خبر نہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے تو ایک بوند بھی باقی نہ رہے گی۔

مگر تم گنوار کی طرح انجان اور ناسمجھہ نہ ہو۔ چھڑکاؤ کی گاڑی پر فضول خرچی کا الزام نہ لگاؤ۔ بلکہ خود اپنی دولت دوسروں کی فائدہ رسانی میں خرچ کرنی سیکھو۔

اب تم اپنے عیش و آرام کے لئے اپنے نام و نہاد کے واسطے شادی میں غمی میں ہزاروں روپے خرچ کر ڈالتے ہو۔ مگر خدا اور اُسکے بندوں کا کوئی کام درپیش ہوتا ہے تو ہاتھہ سمیٹ لیتے ہو۔ فضول خرچی کا سہم چڑھ جاتا ہے۔

فضول خرچی بہت بُری چیز ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔ ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ اسراف نہ کر۔ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کلوا واشربوا ولا تسرفوا کھاؤ پیو۔ مگر اسراف نہ کرو۔

اگر چار آنے گز کے کپڑے میں تمہاری تن پوشی ہو سکتی ہے۔ اگر دو روپے کی دیسی جوتی تمہاری برہنہ پائی کو دور کر سکتی ہے۔ اگر ایک طرح کے دال سالن سے تمہاری روٹی چل سکتی ہے۔ تو تین چار روپے گز کے کپڑے پہنکر اپنے جسم کی عادت نہ بگاڑو۔ دس روپے کا ولایتی بوٹ اور پانچ روپے کی کامدار جوتی نہ پہنو۔ دس دس طرح کے کھانے

دسترخوان پر نہ لگاؤ۔ تم ایک غریب ملک کے باشندے ہو۔ تم ایک مفلس قوم کے فرد ہو۔ دوسرے بھائیوں کا بھی خیال رکھو کہ وہ کس حال میں ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے حال میں لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں جب ان کو گرم کپڑا پہنایا جاتا تو وہ آنکھوں میں آنسو لاکر فرماتے پہلے مسجدوں اور بازاروں کے گوشوں میں غریبوں کو دیکھ آؤ۔ انہیں کوئی ننگا تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پہلے اسکو دو۔ وہ حق دار ہے۔

چھڑکاؤ کی گاڑی تم کو یہی نصیحت کرتی ہے کہ اسکا سب کچھ دوسروں کیلئے ہے اپنے واسطے وہ ایک بوند بھی گھر لیکر نہیں جاتی۔

٭٭٭

# پسینہ

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

گرمی کے موسم میں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ دھوپ میں باہر نکلو تو دماغ پکنے لگتا ہے گھر میں بیٹھو تو پسینہ چلا آتا ہے۔ جس سے کپڑے تر ہو جاتے ہیں اور ان میں بساندی بساندی بو آنے لگتی ہے۔

جانتے بھی ہو۔ پسینہ کیا چیز ہے۔ یہ تمہارے بدن کی زکوٰۃ ہے۔ اللہ میاں گرمی کا موسم بھیجکر آدمی کے بدن کا وہ میل کچیل جو مسامات اور کھال کے نظر نہ آنے والے چھوٹے سوراخوں میں ہوتا ہے پسینے کے پانی سے دھو دیتے ہیں۔ پسینہ ایک طرح کی بھاپ ہے۔ جو گرمی کے اثر سے بدن کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور پسینہ بنکر بہ جاتی ہے۔

پہاڑوں اور بعض ملکوں میں گرمی کا موسم نہیں آتا تو وہاں کے رہنے والے حمام میں جاکر بناوٹی گرمی سے پسینہ نکلواتے ہیں۔ کیونکہ پسینہ آدمی کی تندرستی کیلئے بہت

ضروری چیز ہے۔

پسینہ اللہ میاں کی بڑی نعمت ہے۔ غریب لوگ گرمی کے موسم میں دن بھر جنگلوں اور بازاروں میں محنت اور مزدوری کرتے ہیں اور ہر وقت پسینے میں شور بور ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جب شام کو اپنے گھر جاتے ہیں تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محنت اور پسینہ سے ان کے بدن کی ساری بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ امیر لوگ خس کی ٹٹیاں لگاتے ہیں۔ پنکھے جھلواتے ہیں۔ اور ہر وقت ہائے گرمی ہائے گرمی پکارتے رہتے ہیں جب شام ہوتی ہے تو ان کے چہرے پر اداسی اور پریشانی چھائی ہوتی ہے۔ کیونکہ پسینہ نہ آنے اور بیکار پڑے رہنے سے ان کے بدن کا میل بدن کے اندر رہتا ہے۔ اسواسطے یہ بیچارے ہمیشہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں اور رات کو اس چین سے پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتے جیسے ٹکے کا آدمی غریب مزدور سوتا ہے۔

اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ جس طرح موسم کی گرمی پسینے کے ذریعہ بدن کے میل کو دور کرتی ہے اُسی طرح انسان کی روح پر چھایا ہوا میل نماز روزہ زکوٰۃ سے دور ہو جاتا ہے قاعدہ ہے کہ جب پسینہ آتا ہے تو آدمی کا جی بہت گھبراتا ہے۔ ایسے ہی نماز کی محنت۔ روزے کی مشقت اور زکوٰۃ کے خرچ سے پہلے پہل تو انسان کو ذرا تکلیف ہوتی ہے مگر جب روح کا میل صاف ہو جاتا ہے تو ایسی خوش ہوتی ہے جسکی کوئی حد نہیں

لہٰذا اے اخبار توحید کے پڑھنے والو! آنے والے موسم گرما کو خدا کی نعمت سمجھو جو غریبوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور پسینہ کی قدر کرو۔ اور روح کا میل کچیل دور کرنے کے لئے نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ زکوٰۃ دو۔ تاکہ خدا کے گھر جا کر آرام سے رہو

# پاؤں کا جیل خانہ

ازاخبار توحید ۱۹۱۳ء

لوگو! میں ایک آزاد جنٹلمین کا پاؤں ہوں۔ مجھکو صرف صبح کے وقت غسل دیا جاتا ہے اس کے بعد سوتی۔ یا اونی یا ریشمی قبا پہنائی جاتی ہے۔ جس کو جراب کہتے ہیں۔ اسوقت میں خوش ہوتا ہوں کہ ایک امیر اور خوشحال آدمی کا پاؤں بنا۔ جو یہ لباس میسر آیا غریب کا پاؤں ہوتا تو کیچڑ میں۔ کانٹوں میں۔ دہوپ کی تپتی۔ جھلستی زمین پر چلنا پڑتا۔ لیکن جب مجھکو بوٹ کے جیل خانے میں ڈالا جاتا ہے تو بہت پریشان ہوتا ہوں۔ اپنی عارضی خوشی پر نفریں کرتا ہوں۔ مگر جنٹلمین نہایت بے پروائی سے مجھکو قفس چرمی میں بند کر دیتا ہے اور مجھ پر زور دیکر کھڑا ہوتا ہے تو لیکچر دیتا ہے کہ اے لوگو! آزادی حاصل کرو۔ آزادی بڑی نعمت ہے۔ اُسوقت بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ زبان ہو تو کہوں کہ تیری آزادی کا دعوے جھوٹا ہے تو نے ٹھنڈے اور گورے ملکوں کی تقلید میں جہاں بوٹ پہننا ضروری ہے ہندوستان میں رہ کر خواہ مخواہ اس کو پہنا۔ اور اپنے جسم کے ضروری حصے کو قید کر کے "پابند" ہو گیا۔ اب آزادی کیسی؟ آزادی جب تھی کہ دیسی جوتا پہنتا۔ پانچوں وقت کی نماز کے وقت پاؤں کو دہوتا اور ہندوستانی شریفوں کی محفلوں، مسجدوں میں بے روک ٹوک جاتا۔ اب بوٹ اتارنے کی مشکل کے سبب سب سے محروم ہے۔

# سوئی کی لن ترانی

(ازاخبار توحید ۱۹۱۳ء)

کالے بُرقع میں چھپی ہوئی کاغذ کی سیاہ پڑیہ میں بند سوئی نے اپنا نوکدار منہ باہر

نکالا اور کہا۔ کون کہتا ہے انگریز ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ یہ ملک میرا ہے اسکے رہنے والے میری رعایا ہیں۔ آیندہ کوئی شخص میرے سوا کسی کو یہاں کا تاجدار شہ کہے نہ سمجھے نہ مانے ورنہ سزا دی جائے گی۔

انگریزوں کا اور میرا صرف اتنا تعلق ہے کہ جہاں میں پیدا ہوئی ہوں۔ وہیں یہ پیدا ہوئے ہیں۔ تو اس کیلئے اتنا ہو سکتا ہے کہ میں ان کو اپنی دوسری ہندوستانی رعایا کے مقابلہ میں کچھ امتیاز دیدوں لیکن ناممکن ہے کہ ان کے دعوائے ہمسری کو برداشت کیا جائے۔

سب لوگ میرے محتاج ہیں۔ میں نہ ہوں تو گورے کالے ننگے پھریں۔ یا درخت کے پتوں سے اپنا بدن چھپائیں۔ میرا ہمجنس لوہا سوت کاتتا ہے۔ کپڑا بنتا ہے اور میں اس کو سیتی ہوں۔ عزت مجھ سے ہے۔ حرمت مجھ سے ہے۔ اور راحت مجھ سے ہے۔

جب میں پہلے پہل اس ملک پر حملہ آور ہوئی تو دیسی سوئیوں نے جو کچی تھیں میرا سامنا کیا۔ مگر میں نے ان کو زک دی اور ناپید کر دیا۔

آج میری وہ شان ہے کہ اگر انگریزوں کو اور سب یورپ والوں کو بلکہ سب انسانوں کو نیچا دکھانا چاہوں تو دکھا سکتی ہوں۔ اور ننگا دھڑ نگا پھرا سکتی ہوں۔

دیسی کالے بائیکاٹ کا نام لیں تو میں ان کا بائیکاٹ کر کے حیران پریشان کر سکتی ہوں۔ جب وہ جوش کے مارے آپے سے باہر ہوں اور میں ذرا کے ذرا اپنا منہ چھپا لوں تو نشہ ہرن ہو جائے اور "ہائے سوئی"، ہائے سوئی" کا غل مچنے لگے۔ ہندوستان سوئی سوئی کا محتاج ہے آواز آنے لگے۔

لہذا میں اعلان کرتی ہوں کہ کوئی آدمی دم نہ مارے اور چپ چاپ کام کرتا رہے کیونکہ تاج میرا۔ کاج میرا۔ راج میرا۔

# فٹ بال

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

بیچاری گیند میدان فٹ بال میں کھیلنے والوں کی کس طرح ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ بڑا ترس آتا ہے۔ چمڑے کا بوٹ چمڑے کی گیند کو ٹھکراتا ہے۔ وہ بھاگتی ہے تو یہ پیچھے دوڑتا ہے۔ ایک طرف سے بچتی ہے تو دوسرا حریف سر پہ آتا ہے۔

اس گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر ٹھوس ہوتی تو کس کی مجال تھی جو یوں سر بازار ٹھوکریں مار سکتا۔

آدمی کو دیکھو جس کا باطن ایمان حق سے بھرا ہوا ہو اُس کو کسی کا خوف نہیں رہتا مگر کھوکھلے ضمیر والے ہمیشہ گردش ایام کے بوٹوں سے ٹھکرائے جاتے ہیں۔

فٹ بال بڑا اچھا کھیل ہے۔ گرمی کے موسم میں شام کے وقت دیکھا ہوگا۔ نوجوان اس سے جی بہلایا کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی ورزش ہے جس سے ہاتھ پاؤں اور بدن میں چستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے۔

اگلے زمانے میں کبڈی کا کھیل تھا۔ جس میں سانس روک کر دوسرے فریق کے پالے میں کبڈی کبڈی کہتے ہوئے جاتے تھے۔ اب کبڈی کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ حالانکہ کبڈی میں فٹ بال سے بڑھ کر فائدے تھے۔ اول تو یہ کہ سانس کے روکنے اور دوڑنے سے پھیپھڑہ مضبوط ہو جاتا تھا۔ دوسرے گیند خریدنی نہ پڑتی تھی۔ تیسرے فٹ بال کی وردی اور ایک خاص قسم کا جوتا نہ لینا ہوتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ دسویں پندرہویں دن گیند خراب ہو جاتی ہے۔ جوتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور غریب ہندوستانی ولایت والوں کی جیب میں چاندی کے سکے ڈال کر چمڑے کے چند ٹکڑے دوبارہ خریدنے

پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بھائی ایسے کھیل کو دور سے سلام جس سے ملک کی دولت برباد ہوتی ہو گھر پھونک تماشا اچھا نہیں ہوتا۔

# ہاتھ کی بغاوت

## سالن کی آزادی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

میرا ہاتھ سالن کی پیالی میں جانا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے پیالی کی اونچی اونچی دیواروں سے دم گھٹتا ہے۔ شوربے اور بوٹی اور قتلوں کے قید خانے میں نہیں جاؤں گا۔ مجھ کو انگریزی پلیٹ چاہیئے۔ جہاں سالن کو آزادی ہے۔ بوٹی الگ نظر آتی ہے۔ قتلہ جدا معلوم ہوتا ہے۔ شوربا اپنی شان علیحدہ دکھاتا ہے۔ ہاتھ کو اختیار ہے۔ پلیٹ کے کھلے میدان میں جس طرف چاہے جائے۔ پیالی میں انگلیوں کو غوطے مار مار کر بوٹیاں نکالنی پڑتی ہیں قتلہ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے پلیٹ میں ہر چیز سامنے دکھائی دیتی ہے۔

الٰہی خیر ہاتھ ہی باغی ہو گیا تو پیٹ بھوکا مر جائیگا۔ اسکو سمجھاؤ اور کہو۔ دیوانے غریبوں میں پیدا ہوا ہے غریبوں کی سی باتیں کر۔ ہمارے ہاں بھی پلاؤ زردہ کھلی قاب اور میدانی رکابی میں ہوتا ہے۔ مگر دال اور غریبانہ سالن پیالی کی دیواروں کے پردہ میں اچھا۔ پردہ سے باہر آنا آبرو میں بٹہ لگائیگا۔ انگریز ملک کے بادشاہ ہیں دولت حشمت ان کی غلام ہے۔ وہ تر بتر کھانے کھاتے ہیں۔ اس لئے کھلی رکابیاں ان کو زیبا ہیں۔ تو مفلس کنگال اُبالی دال کھانے والا۔ تجھ کو یہ فضول خرچیاں مناسب نہیں ہیں جب تک پلاؤ زردہ میسر نہ آئے صبر شکر سے پیالی پر گزارہ کر۔ آج تو بغاوت کرتا ہے۔ کل عورتیں سرکشی اختیار کرینگی کہ ہم کو بھی پردہ سے نکالو۔ اس وقت کیا ہوگا۔ اب تو پردہ میں پھٹے پرانے

پیوند لگے کپڑے چھپے ہوئے ہیں۔ پردہ نہ رہا تو ملک کا سارا بھرم کھل جائے گا۔ اور غریب شوہر اچھے کپڑے بناتے بناتے پاگل بن جائیں گے۔ نادان بات کو سمجھ اور دوسروں کی ریس چھوڑ۔

# پیاسے گلے پر چھری

## حاملہ کا قتل

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

مسلمان کہتے ہیں۔ بلغاریوں اور سرویوں نے ترکی عورتوں کو ان کے بچوں کے سامنے قتل کیا۔ انگریز کہتے ہیں کہ غدر میں ہندوستانیوں نے ان کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ فقیر کہتا ہے کہ اس بے زبان جانور کو بھی کسی نے دیکھا جس کا نام بکری ہے۔ جو شہروں کے قتل خانوں میں ہزاروں بھوکی پیاسی بے دردی کی چھری سے ذبح ہو جاتی ہیں تم اپنی بیوی بچوں کو لیکر خوشی خوشی آراستہ دستر خوان پر کھانا کھاتے ہو تمہارے سامنے۔ قلیہ۔ قورمہ۔ کوفتے۔ پسندے۔ کی قابیں ہوتی ہیں۔ ہاتھ بڑھاتے ہو مظلوم بوٹیوں کو دانتوں سے بھنبوڑتے ہو۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ گوشت کہاں سے آیا ہو۔ کیونکر آیا۔ اور کتنے جانور تمہاری قابوں کے لئے جان سے گئے۔

کسی دور کے گاؤں سے بکریوں کا ریوڑ چلا۔ مئی کی دھوپ ان کے سر پر تھی۔ بیچاریاں دن بھر کی منزلیں طے کر کے شام کو شہر میں پہنچیں۔ جلادوں نے ایک تنگ مکان میں بند کر دیا۔ اور وہ ہستیاں جن کو دیہات کے کھلے میدانوں میں رہنے کی عادت تھی شہر کے تیرہ و تاریک جیل خانہ میں بھوکی پیاسی مقید رہیں۔ صبح کو مقتل کی بلاؤ ہوئی دیسی ڈاکٹر کی نظر طماع نے ایک سرسری معائنہ کیا۔ لین دین کے خفیہ اشارے

ہوئے۔ اور ناتوان مظلوم قیدی جن کی زبانیں پیاس کی شدت سے نکلی پڑتی تہیں جو حسرت اور مایوسی سے اپنے جلادوں کو دیکھکر رحم کی درخواست کرتے تھے ڈنڈوں اور لاتوں کے زور سے کان اور دُم کھینچ کھینچ کر قتل گاہ میں پہنچائے گئے جہاں جلاد چھریاں تیز کئے اور بے پروائی سے آستینیں چڑہائے کھڑا تہا۔ ان میں ایک بکری حاملہ تھی اسکو دو قدم چلنا دوبھر تھا۔ وہ ظالموں کی لاتوں سے حواس باختہ تھی۔ دم چڑھا جاتا تہا۔ مڑمڑ کر دیکھتی تھی کہ کوئی خدا کا بندہ ترس کھائے اور پیٹ میں بچہ رکھنے والی کو موت سے بچائے۔ وہاں کون سنتا تہا سب کے کلیجے پتھر کے تھے کسی نے رحم نہ کیا یہانتک کہ سب کے ساتھ وہ بھی مقتل کی زمین پر پچھاڑی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پیاس کے مارے حلق سوکھ گیا تہا۔ وہ چیخنا چاہتی تہی مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ اُس نے چھری کو دیکھا اور سمجھی کہ اب اس کی دہار پانی پلائے گی۔ آخر یہی ہوا جلاد نے گلے کی کھال پر چُھری رکھدی۔ حاملہ بکری نے کانپ کر اور لرز کر ایک دفعہ چیخ ماری۔ چھری نے اُسکے بالوں کو کاٹا۔ کھال کو کاٹا۔ رگوں کو کاٹا۔ اور ہڈی کے پاس جا کر دم لیا۔ خون کے فوارے اُبلے۔ ہاتھ پاؤں سے دم کھنچنا شروع ہوا بے جان لاش چند منٹ تڑپی اور ٹھنڈی ہوگئی۔ اس کے بعد کھال کھینچی گئی۔ پیٹ چاک کیا گیا اور وہ بچے نکالے گئے جو مرنے والی کے پیٹ میں تھے۔ اس وقت سفاک جلاد نے اتنا کہا۔ او ہو یہ گیا بھن تھی۔ بچوں کو جلدی سے چھپانے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اب قانون کی گرفت کا ڈر تہا۔ اس گوشت کے ٹکڑے پارچے ہوئے۔ کوئی حصہ قلیئے کے کام آیا۔ کوئی قورمے میں بُھنا۔ کسی کا قیمہ بنا۔ پسندے کوٹے گئے۔ کسی کو کوفتے کی کوفت اٹھانی پڑی۔

یہ ہے تمہارے دسترخوان کی بہار جس کو فخر اور گھمنڈ سے کھا رہے ہو۔ کھا چکو گے تو اخباروں میں بلقانی سفاکیوں پر مضمون لکھو گے۔ اور خیال کروگے کہ تم نے قوم کا ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔ ہاں بے شک تم نے فرض ادا کیا ہے تمہاری تعریف کرنی چاہئے

لیکن یہ فرض خود غرضی کا فرض تھا۔ ورنہ تم ان بے زبان ہستیوں کا بھی خیال کرتے۔
کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم ذبح خانوں کی نگرانی پر زور دیتے۔ اور پبلک سے کہتے کہ وہ بے زبان جانوروں کی خبر گیری کا انتظام کریں۔ اس میں تم پر بغاوت کا الزام نہ لگتا۔ اگر لکھتے کہ جن پر چھری چلائی جائے ان کو پانی پلا دینا چاہئے۔ ان کو حبس بے جا میں نہ رکھا جائے۔ گیابھن اور حاملہ کی تحقیق خاص طور پر ہو اور جو لوگ اس کے خلاف کوئی حرکت کریں ان کو عبرتناک سزائیں دی جائیں مگر تم سب (جنہیں راقم فقیر بھی شامل ہے) دوسروں کو کہتے ہو اپنی خبر نہیں لیتے۔ کل قیامت کے دن احکم الحاکمین تم سب سے اسکا جواب طلب کرے گا۔

میں جانتا ہوں کہ جانور تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں بیشک تم ان کا گوشت کھا سکتے ہو۔ مگر ان سفاکیوں کی کسی مذہب نے اجازت نہیں دی۔ خصوصًا اسلام نے ان ناروا ظلموں کو نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے۔

حضرت خواجہ اجمیری کے غلاموں کو چاہئے کہ وہ اپنی صوفیانہ نرم دلی کو کام میں لائیں اور ہر شہر میں ایسی انجمنیں قائم کریں۔ جن کے ممبر روزانہ صبح کے وقت ذبح خانوں میں جا کر۔ حاملہ۔ بیمار۔ کمزور۔ کمسن۔ بھوکے پیاسے جانوروں کو ذبح ہونیسے بچائیں۔ اور اس کا خیال رکھیں کہ ایک جانور دوسرے کے سامنے ذبح نہ ہو۔ چھُریاں تیز کر لی جائیں تاکہ ذبح کے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو مظلوم اور غریب نواز خواجہؒ اور حضرت رب العالمین کی خوشنودی حاصل کریں گے۔

# تخت گاہ کے ایک تختہ کا پیام

## وئیسرائے کے نام

(از زمیندار جنوری ۱۹۱۲ء)

مائی لارڈ ہارڈنگ! ۱۹۱۲ء جاتا ہے اور تم آتے ہو۔ بارہ مہینے پہلے ان ہی دنوں میں تم اور یہ ۱۹۱۲ء ایک گاڑی میں سوار ہو کر خبر دینے آئے تھے کہ دہلی برٹش راج کا پایہ تخت بن گئی۔

اب تم دسمبر میں بحیثیت نائب السلطان مستقل سکونت کے ارادے سے دہلی میں داخل ہوتے ہو اور تمہارے ساتھ ۱۹۱۲ء کے بدلے ۱۹۱۳ء پہلو میں بیٹھا نظر آتا ہے۔

گورے ملک کے وہمی ۱۳ کے عدد سے بدشگونیاں لیتے ہیں۔ مگر ہم کالوں کے خیال میں یہ خام خیالیاں ہیں۔ تمہارا اور تمہاری حکومت کا بول بالا ہو گا۔ اور تیرہ کا عدد منحوس نہ رہے گا۔

لاٹ صاحب! لوگ کہتے ہیں کہ دنیا بدل رہی ہے۔ ہر وجود تغیر و انقلاب کے میدان میں دوڑا چلا آتا ہے۔ زمانہ نے تمام کائنات کی چھوٹی بڑی اشیاء میں حرکت پیدا کر کے ان کی کایا پلٹنے کا سامان کیا ہے۔

مگر فقیر نہیں جانتا کہ خلقت کا یہ کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔ جھوٹ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ تم نے اور تمہاری حکومت کے اکثر بڑے بڑے آدمیوں نے بارہا یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب برپا ہے اور حالات و کیفیات میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ ہر فانی ہستی جدت کا جامہ پہن رہی ہے۔

مگر میں اسکو یوں نہیں مان سکتا کہ تم سب کی یہ باتیں نیچرل مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ یاد ہوگا کہ گذشتہ دسمبر میں بھی سردی تھی۔ آسمان کا رنگ نیلا۔ رات کالی۔ دن اُجلا۔ اور ہوا ٹھنڈی تھی۔ اور آجکل بھی وہی سماں ہے۔ تارے نکلتے ہیں۔ چاند گھٹتا بڑھتا ہے سورج طلوع و غروب کے دور میں پھنسا ہوا ہے۔ اس زمانے میں بھی انسان رات بھر سوتے اور دن بھر جاگتے تھے۔ کانوں کا کام سُننا۔ آنکھوں کا دیکھنا۔ ناک کا سونگھنا۔ اور زبان کا بولنا تھا۔ غذا چبا کر کھائی جاتی تھی۔ اور ہاں غذا کی جتنی مقدار سے پہلے پیٹ بھرتا تھا اب بھی اتنے ہی نوالے درکار ہیں۔ اس میں ذرہ بھر فرق و تفاوت نہیں ہوا۔ پھر تغیر و تبدیلی کس چیز کا نام ہے۔

یہ تو نہیں کہ اگلے وقتوں میں پانی۔ مٹی۔ لکڑی اور تانبے کے پیالوں میں پیا جاتا تھا اب شیشے کے گلاس چل گئے ہیں۔ اس وقت زمین پر بیٹھکر روٹی کھائی جاتی تھی اب میز کرسی کا رواج ہے۔ اُن دنوں اونٹ بیل گھوڑے کی سواریاں تھیں آجکل ریل موٹر کار ٹرام کا زور ہے۔ اگر اس کا نام زمانہ کی تبدیلی ہے تو میں انکو نہیں مانتا۔ کیونکہ میرے نزدیک تبدیلی جب ہوتی کہ بغیر پانی کے پیاس بجھ جاتی۔ کھانے کی خواہش جاتی رہتی۔ نقل و حرکت کے واسطے ریل اور موٹر کار کا محتاج نہ رہنا پڑتا۔

میرے پیارے جارج سلطان کے قایم مقام تم پر سلام۔ ذرا سُننا اُس دہلی کے در و دیوار کیا پیام دیتے ہیں جنہیں قدم رکھتے ہو وہ کہتے ہیں۔

ہارڈنگ بابا کی خیر۔ تخت گاہ کے ایک تختہ کی دعا لیتا جا۔ بھلا ہوگا۔ شاد رہ آباد رہ تیری امیدوں کا چمن پھلے پھولے۔ تیرے ارمانوں کا تختہ سر سبز و شاداب ہو۔

دنیائے فانی میں جی نہ لگا۔ اس خاک پر ہزاروں دفعہ کرنوں اور شعاعوں کے ہجوم میں جھومتے جھامتے سورج کے جلوس نکلتے تھے مگر شام کو ان کی روشنی ہمیشہ ناپید ہوجاتی تھی۔ اپنے فرض کو پہچان۔ جس طرح سورج خلقت کی فائدہ رسانی کے خیال میں اپنی

آن بان اور شکل و صورت کو نہیں دیکھتا اور دن بھر خدا کے بندوں اور اسکی تمام مخلوقات پر نعمتوں کا مینہ برساتا رہتا ہے تو بھی اے اُس بادشاہ کے نائب جس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا ان ظاہری کھیل تماشوں میں مشغول نہ ہو۔ اور رحم و انصاف کی طرف توجہ کر۔ تاکہ آسمان و الا تجھ پر رحم کرے۔

ان ہاتھیوں سے جن پر تو سوار ہے تیری ذمہ داریاں زیادہ بوجھل ہیں۔ توقع نہ رکھ کہ رعیت تیرے آگے جھکتی ہے یا نہیں۔ تیرے احسان کا بوجھ ان کی گردن کو جھکائے تیری انصاف کاریاں سب کے سروں کو خم کرائیں تو بات ہے۔

آج وہ دن ہے کہ دہلی ظاہری اور نمائشی شان و شوکت کے بدلے باطنی اندرونی دبدبہ و تمکنت کی خواستگاری کرتی ہے۔ پایہ تخت کی خشتی و سنگی عمارات کے ساتھ باشندوں کے دلوں میں محبت و الفت کی بنیاد بھی رکھ۔ تاکہ انگریزی تاج کے ہیروں کو اصلی درخشانی نصیب ہو۔ اور دکھا دے کہ تو اس خدا کا سچا اور نیک بندہ ہے جسکی۔ مندر۔ مسجد اور گرجا میں عبادت کی جاتی ہے۔ مسجد و گرجا کی نمازیں شریک نہ ہو۔ مندر کے ناقوس اور شوالے کے گھنٹے سے ہمنوائی نہ کر۔ مگر اے خدا پرست ہندوستان کے مجازی بادشاہ اپنے دل کو ہر وقت شہنشاہ حقیقی کی باز پرس سے خبردار کرتا رہ بھول مت یاد رکھ تاکہ تیری اور انگریزی قوم کی یاد ہمیشہ نیکی سے برقرار رہے۔ (جس دن یہ مضمون شائع ہوا۔ وائسرائے پر بم پھینکا گیا۔ اور خواجہ صاحب بھی شبہ میں گرفتار ہوئے تھے۔ (ایڈیٹر منادی)

# درکار ہیں مستانے چند

از خطیب ۳۰ اپریل ۱۹۱۵ء

ہوش سے بیگانے چند۔ دین کے دیوانے چند۔ درکار ہیں مستانے چند۔ ترک خانہ کریں۔ میخانہ میں رہیں۔ جام کو نظر لگائیں۔ ہاتھ اور منہ کو بچائیں۔ زخموں کے کھرنڈ

تو چین۔ اور مرہم والوں کو دکھائیں۔

بھوک جن کی دائی ہو۔ پیاس جنکی مائی ہو۔ بے سروسامانی جن کی ماں جائی ہو۔ وہی درکار ہیں۔ وہی اس میدان کے شہسوار ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یکتائی اور توحید کی آواز آندہی کے شور میں دنیا تک پہنچاؤ۔ مجھے وہ چاہیئے جو کہے کہ پیاری گھٹا کی بوندوں میں اس لیلی کا محمل بناؤ۔ جرس بجاؤ۔ گھر گھر پہنچاؤ۔ سوکھی زمین سوندہی خوشبو سے مہک اٹھے۔ گھر والے مستی میں آئیں۔ جہولے ڈالیں گائیں بجائیں۔ آندہی ہو گی تو کواڑ بند کئے جائیں گے۔ آنکہہ۔ ناک۔ کان کو ڈہکا جائیگا۔ پھر کیا خاک توحید بتانے کا مزا آئیگا۔

انگریز کا لندن ہو یا ہند کا نندن۔ برما کا رنگون ہو یا نجد کا مجنوں۔ سب کو پریم نگر لے جانا ہے۔ وحدت کی سیج پر سلانا ہے۔ مگر یہ لڑنے جھگڑنے کی سند نہیں۔ تو تکار چیخ پکار سے حاصل نہیں۔ جو لوگ مناظرہ کی تلوار سے لڑتے ہیں اور اس پر ہادی مہدی بنتے ہیں انہوں نے کتنے کافر مسلمان کئے ان کے آگے کس قدر منکر گردنیں خم ہوئیں۔ تجربہ کہتا ہے ایک بھی نہیں۔ بلکہ انکار بڑہا۔ ضد زیادہ ہوئی۔ بگاڑ کی دیواریں اونچی ہو گئیں۔ نہ عیسائی نے مانا نہ موسائی نے۔ نہ ہندو نے تسلیم کیا۔ نہ آریہ نے۔ نہ سکھ مائل ہوئے نہ پارسی گھائل ہوئے ہاں چرچے بہت رہے۔ روپے جیبوں سے نکلکر ادہر سے اُدہر اور اُدہر سے ادہر آتے جاتے رہے۔ دسترخوان پر کہانے بھی رنگ برنگ کے آئے۔ نوالے بھی نرم گرم چکنے چپڑے دانتوں پر چڑہے اور معدے میں اترے لیکن ذرا کان کو میرے پاس لا تو کہوں۔ دل وجان توحید کا ارمان نہ نکلا۔ نہ اسکو کسی نے دیکہا نہ وہ کسی کو دیکہہ سکی۔ ہر سکہی کھڑی تکتی رہی کہ پیا کا اشارہ پاؤں تو لیلی کو مسند پر لاؤں۔

جب ہی تو کہتا ہوں۔ ارے دیوانوں کو بلاؤ۔ مستانوں کو پکارو۔ جو انجمن طلبگار اسلام کے نوکر ہوں۔ جو اپنے مطلوب کی چشم پوشی رضا کو تنخواہ بنائیں۔ کفنی پہنیں۔

ہر ہر جپیں۔ شام کی مرلی بجائیں۔ گھر گھر وہائی مچائیں۔ روتوں کو ہنسائیں ہنستوں کو رُلائیں۔ اور ساجن سیاں بہاری مراری کے گیت گائیں۔

پوچھو ان کا ذکر کس اخبار میں چھپے کہوں جریدۂ سکوت میں۔ دریافت کرو انکا خیر مقدم کیونکر ہو۔ جواب دوں کس مہر سے سے نہ کوئی ان کو جانے۔ نہ وہ کسی کو جانیں۔ بس ایک جاناں کی دید ہو۔ اسی کی گفت ہو۔ اسی کی شنید ہو۔ تب دیکھنا ہر گھر میں ہولی ووالی ہر گھر میں عید ہو۔

اسلام غیر نہیں ہر آدم زاد کے لئے خیر ہے۔ اس کو زہر نہ بناؤ۔ خود شکر بنو اسلامی شیر میں گھُل کر فنا ہو جاؤ۔ تب مزے لیکر لوگ پئیں گے۔ کیا لیکچروں اور مباحثوں کے قم سے مردے جیئیں گے؟

تم مسیحا بنتے ہو مگر خود بینائی کے محتاج ہو۔ اندھوں کو نہ بلاؤ پہلے خود اپنی آنکھیں بنواؤ۔

سُننا مجھے کس نے پکارا۔ رنگون میں آؤ۔ اور برما کو مسلمان بناؤ۔ ذرا ٹھہر جا کلمہ یاد کر رہا ہوں۔ اور کلمے والے کا دل شاد کر رہا ہوں۔

ابھی خود مجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اس اونچے لا کو کیوں کر عبور کروں اس پہاڑ سے اترلوں تو دامنوں کو سمیٹ کر الا اللہ کا نعرہ بلند کروں گا۔

مگر ہاں میں نہیں تو کیا اور بھی نہیں۔ بہتیرے مستانے دیوانے موجود ہیں۔ گدگدانے کی دیر ہے۔ کلبلانے والے نکل ہی آئیں گے۔

تو ہاں انہیں کیا کرنا چاہئے۔ یہ کہ جو گھر بار سے آزاد ہوں۔ وہی میدان میں آئیں برما چلیں جنگل میں منگل رچائیں۔ درختوں کے سایہ میں بسیرا جمائیں۔ ملے تو کھائیں نہیں تو مگن ہو کر سو جائیں۔ عبادت رب ان کا شعار ہو۔ پھر چھوٹا بڑا ادنے اعلےٰ ان کا یار ہو۔ برمی زبان آتی ہو تو واہ ہے۔ ورنہ نظر عشق کی زبان سب سمجھتے ہیں۔ اسی میں

بات چیت ہو۔ کوئی دس بولے تو وہ ایک اشارہ ابرو سے سب کا جواب دیں۔ پانچ وقت کی نماز حلقۂ ذکر و شغل و ماسوا کی ضرورتوں سے بےخبری اور ذات الٰہی پر توکل کوئی بیمار ہو تو اسکی خدمت کریں۔ اپنے دکھ کی جگہ اس کا دکھ سمجھیں۔ دو جسم ایک جان بن جائیں۔ کسی کے کانٹا لگے تو اپنی پلکوں سے نکالیں۔ کوئی ترشی سے پیش آئے تو یہ اپنے اخلاق کی مٹھائی اسے کھلائیں۔ بات میں سچ ہو گھات میں سچ ہو۔ غرض جو چیز ہو صداقت و راستی کی تصویر ہو۔ پھر دیکھو۔ کہ کیوں نہ ہر بری کا دل زلف اسلام میں اسیر ہو۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہم روپے دیا کرتے تھے اب بھی دینگے۔ ذرا ورے کو آئیں میں ان کا منہ چوم لوں۔ اور ہو سکے تو ان کے خیال کو بھی بوسہ دوں کہ کار خیر کے لئے روپے جیسی دلنشین چیز کو اپنے سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔

مگر دلدار من۔ یہ کوچہ دوسرا ہے۔ یہاں روپئے کی ضرورت نہیں۔ نہ انجمن سازی کی نہ غل شور کی۔ نہ ہاہمی کی۔ یہاں تو بس پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے یا چاک گریباں متوالے کام کر سکتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈو اور پہلے اپنے رنگون کے مسلمانوں کو مسلمان بناؤ۔ میں بھولا۔ ان کو یہ بتاؤ کہ وہ مسلمان ہیں اور ایک شرمیلے سجیلے سلطان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ جو کھجوروں کے جھنڈ میں اپنی پیاری بکریوں کو جنگل کے پتے کھلاتے تھے اور دیکھنا لمبے لمبے بال شانوں پر ڈالے سورج سے آنکھ لڑاتے تھے۔ لکڑی پر سہارا دیکر کھڑے ہوتے اور کہتے۔ کھاؤ میری بکریوں۔ کھاؤ میری پیاریوں۔ میں تمہاری چوکسی میں کھڑا ہوں۔ کوئی دشمن تمہارے پاس نہ آنے پائے گا۔

اور ہاں وہ جو حرا نامی غار میں جاگتے تھے۔ اور امت کے سونے کا سامان کرتے تھے اور وہ جو راتوں کو کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے اور رخساروں پر آنسو بہاتے اور فرماتے تھے الٰہی میری امت کو ہنستا رکھیو اور وہ جو آج بھی آٹھویں دن تمہاری رپورٹ سنتے ہیں

اور جب کوئی برائی پاتے ہیں تو اس کو چھپاتے ہیں اور دل ہی دل میں فرماتے ہیں کاش میرے پیارے تو ایسا نہ کرتا۔ ارے میری اُمت کہلا کر تو نے جھوٹ بولا۔ دیکھ فرشتے مجھ پر ہنسیں گے۔ ارے مجھ سے منسوب ہو کر شراب پیتا ہے۔ زنا کرتا ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ دل جان میرا کہنا مان۔ ان سب کو چھوڑ۔ میرا بن۔ میرا بن۔ دیکھ تیرے سبب مجھ کو شرمانا پڑتا ہے۔ فرشتوں کے سامنے نظریں نیچی ہوتی ہیں۔ تو میرا ہو کر میری آبرو نہیں بچاتا۔ بچا بچا اپنے آپ کو نفس و شیطان سے بچا۔

یہ سُنیں گے تو نگوں کے مسلمان اصلی مسلمان بنیں گے۔ اور جب اسلام اپنی اصلی حقیقی شکل میں نمودار ہوگا تو ہر وجود غیر مسلم اس کا شیدا و طلبگار ہوگا۔

مگر کہنے کو سب یہی کہتے ہیں جو میں نے کہا ضرورت کرنے کی ہے جو عمل کی بولتی ہوئی تصویر ہو۔ اور عمل کی تکمیل بغیر ترک تعلقات ماسوا اور جنون مخصوص کے محال ہے اسی واسطے تو اس مضمون کے دروازہ میں میں نے پہلی صدا یہ لگائی تھی۔

درکار ہیں مستانے چند

# غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا

# تو کیا ہوتا

از اخبار خطیب ۱۴ مئی ۱۹۱۵ء

اگر ہوتا تو خدا ہوتا۔ جس نے سورج کی روشنی۔ دریا کا پانی۔ ہوا۔ آگ۔ مٹی سب کو برابر دی تھی۔ امیر۔ غریب۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ رکھا تھا۔ مگر اس نے اپنے وجود کو مخفی کر لیا۔ ہر مخلوق کا سہارا اور آسرا بنا۔ مگر پردہ کے پیچھے رہ کر نظروں سے پوشیدہ ہو کر۔

اور انسان بنا تھا دیدیار۔ ظاہری ذریعہ پر مٹنے والا۔

اس لئے کشمکش ہونے لگی۔ کوئی بڑا بن گیا کوئی چھوٹا رہ گیا۔ کسی نے اتنی دولت پائی جس کی تھاہ نظر نہ آئی۔ کوئی رات کی روٹی کو ترسا۔ اگرچہ رزق کا مینھ گھر گھر برسا۔

میں نے اپنے ملک پر نگاہ دوڑائی تو ایک عالمگیر بے قراری سامنے آئی۔ کوئی نائی کہلاتا تھا۔ پاؤں دباتا تھا۔ خوان سر پر اٹھاتا تھا۔ حجامت بناتا۔ کمین کہلاتا کوئی قصائی تھا۔ صورت آدمی کی رکھتا تھا مگر ذات میں ہیٹا مشہور تھا۔ کوئی چمار تھا۔ چوڑا تھا۔ کھٹ بنا تھا۔ غرض بڑے کم اور چھوٹوں کی بھیڑ تھی۔

پوچھا۔ بھئی انسانوں میں یہ فرق کیسا؟ جواب ملا۔ قدرت کا یہی دستور ہے۔ کسی کو سنوارتی ہے۔ کسی کو بگاڑتی ہے۔ خدا نے پکارا۔ نہیں۔ تمہاری تکلیفیں خود تمہارے ہاتھوں سے ہیں۔ محنت کرو تو بڑے بن جاؤ گے۔ میرے دربار میں کسب اور کرم کی پوچھ ہے۔ جو متقی ہے وہی سب سے بڑا ہے

نائی نے کہا۔ اے خدا! آج عربی میں یہ حکم سناتا ہے اور کل سنسکرت میں منوجی کی زبانی یہ حکم ہوا یا تھا۔ کہ برہمن میرا سر ہیں۔ اس لئے علم و عقل کا کام وہ کریں۔ چھتری میرے بازو ہیں۔ جنگ اور حکمرانیاں ان کے حصے کی۔ ویش میرا شکم ہیں۔ لین دین کاروبار۔ ان کے ذمہ۔ شودر میرے پاؤں ہیں۔ خدمت۔ چاکری ان کا کام۔ خود ہی ذات پات کی قید لگاتا ہے۔ پھر نئے سے نئے حکم تبدیلی کے سناتا ہے۔

خدا نے اپنے عربی بندے سے کہوایا۔ نہیں تمہاری سمجھ کا پھیر تھا۔ میں نے کام بانٹے تھے۔ ذات تقسیم نہیں کی تھی تم سب ایک ہو۔ بشرطیکہ نیک ہو۔ جو میرے ملک میں سب سے چھوٹا اور سب سے بڑا ہوتا ہے۔

یہ باتیں سنکر ایک خاکروب گرمی میں جھاڑو دیتے دیتے ذرا سید ہا کھڑا ہوا پسینہ

ہیں غرق۔ آنکھوں کو آسمان کی جانب اٹھایا۔ اور کہا یہ تو بتا۔ ہمارا آسرا کون ہے۔ صبح سے دوپہر ہوگئی۔ غلاظت اٹھائی۔ جھاڑو دی۔ کمیٹی کے جمعدار کے ڈنڈے کھائے گالیاں سنیں۔ اب گھر جاتا ہوں۔ میلی کوٹھری میں پڑنا ہوگا۔ چھوٹے ٹکڑے۔ سڑی بسی دال کھانے کو ملیگی۔ گرم پانی پینے میں آئے گا۔

ادھر دیکھو۔ یہ امیر ہیں۔ رات بھر بجلی کے پنکھوں میں سوئے۔ آٹھ بجے جاگے۔ انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ نوکروں کو صلواتیں سنائیں۔ ناشتہ کیا۔ بیت الخلا گئے نہائے پھر آراستہ کمرے میں آئے۔ شطرنج کا دور ہوا۔ کھانا کھایا۔ گانا سُنا۔ سو گئے شام کو ہوا خوری کے لیے موٹر آئی۔ لینڈو منگائی۔ غرض کوئی گھڑی محنت و تکلیف کی نہ پائی۔ جس اعلیٰ اور قیمتی چیز کی طرف آنکھ اُٹھائی وہ دست بستہ دوڑی ہوئی سامنے چلی آئی۔

ایک وہ ایک یہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میرا دل اس خلجان کے دریا میں غرق ہے۔ خاکروب کا شکوہ ختم نہ ہوا تھا کہ سامنے بیگاری چمار آیا۔ سر پر بوجھ۔ دھوپ پائیں ننگے پاؤں۔ ساتھ میں سپاہی۔ جلدی چلنے کا تقاضہ۔ اس نے دیکھا کہ خاکروب اور خدا میں گفتگو در پیش ہے تو اس نے بھی آہ کی صدا میں آمین پکاری۔ اور کہا۔ ہے میرے باری۔ ہے میری باری۔ دو وقت سے بچے بھوکے ہیں۔ اندھی ماں بخار میں ملہلا رہی ہے۔ گھر سے روزی کی تلاش میں چلا تھا کہ اس فرشتے کے ہاتھ میں پڑا۔ اس نے طمانچے بھی مارے بُرا بھلا بھی کہا اور جانور کی طرح ہانک کر خبر نہیں کہاں لے چلا۔

اتنے میں ایک برقعے والی پاس سے گزری۔ دامنوں میں سیکڑوں پیوند ٹوٹی ہوئی جوتی۔ بغل میں ٹوپیوں کی بُغچی۔ بازار گئی تھی۔ بیپاری نے خریدنے سے انکار کیا اور کہا مندا ہے۔ لڑائیوں کے موسم میں کسی چیز کی نکاسی نہیں۔ حیران پریشان گھر چلی ہے۔ یتیم بچوں کی بھوک۔ اپنی بیکسی کا خیال کرتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو

اُبلے چلے آتے ہیں اور اندر سے کون کہتا ہے کہ خود کیونکر جیئوں اور بچوں کو کیوں کر پالوں۔

دو فریادیوں کو دیکھکر وہ بھی پروردگار کی دوہائی دیتے کھڑی ہوگئی۔

تین عرضیاں گزریں تو عدالت آسمانی نے بغیر سمن جاری کئے دروازہ کھولا۔ اور کہا میرے بندوں ! مایوس نہ ہو۔ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ میرے دفتر میں امیروں کے عیش بھی لکھے جاتے ہیں۔ اور غریبوں کے مصائب بھی۔ ذرہ ذرہ اور نکتہ نکتہ پر بحث ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی عوض ملتا ہے اور آخرت کے واسطے بھی معاوضہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ بے انصافی نہ ہوگی۔ جس کو یہاں نہیں اس کو وہاں ملیگا۔ اور جو یہاں پا چکا اس کو وہاں کچھ نہیں۔

فریادیوں نے کہا ہمیں محنت اور مفلسی کی شکایت نہیں۔ شکوہ اس کا ہے کہ امیر ہم کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ پاس نہیں بٹھاتے۔ بات نہیں کرتے۔ آدمی نہیں سمجھتے ستاتے ہیں۔ ٹھکراتے ہیں۔ اور بعضے ہمارے سایہ تک سے کتراتے ہیں۔

یہ سنکر آسمان لرزنے لگا۔ ہوا سہم کر دم بخود ہوئی۔ فرشتوں نے کچھ اشارے پائے دوزخ کے انگارے اٹھائے۔ دوزخ بھی چیں بہ جبیں ہوئی۔ سانپ بچھوؤں کو پرورش پر آمادہ کیا۔ جنت نے دروازے بند کئے ایسے امیروں پر حرام کے بورڈ لگائے آسمان چہارم پر جناب مسیحؑ نے سُنا غیرت خداوندی کو جوش میں دیکھا۔ تو وہ بھی تھرائے مگر خیر ہوئی کہ ان کی امت کی بکتی فوج ولاسہ کو دور کھڑی نظر آئی جس نے ہزاروں غریبوں کو سہارا دیا تھا۔ تاہم وہ دوڑے کہیں آج ہی یہ سوال نہ ہو جائے کہ کیوں جی تم نے ان سے کہا تھا کہ مجھ کو خدا کا بیٹا کہنا اس وقت کیا جواب دوں گا شرم کے مارے گردن جھک جائے گی۔ غریب پروری کی۔ مگر خدا کے راستہ سے بھٹکا دیا۔ تو خدا کو کیا جواب دوں گا۔

زمیں پر جب غضب الٰہی کی شعاعیں نمودار ہوئیں بصیرت والے گھبرا گئے

امیروں اور خودسروں مغروروں پر دانت پیسنے لگے۔ کلیجے پر ہاتھ رکھکر غریبوں کی تکلیف محسوس کرنے لگے۔

یکایک حجاز سے برقابی خبر آئی۔ ایک بڑے سلطان نے ہمت بندھائی۔ لکھا تھا ان غریبوں کا آسرا میں ہوں۔ لاچاروں بے سہاروں کا سہارا میں ہوں۔ ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھی روٹی کھاتی تھی۔ خدا نے بادشاہ بنایا۔ مگر میں نے رعیت کی طرح وقت گزارا۔ مسکینوں میں رہا مسکین بنا۔ اور مسکینوں میں حشر کی تمنا کی۔

آؤ تم میرے ہو۔ تم چمار ہو یا بھنگی۔ نائی ہو یا قصائی۔ کنجڑے ہو یا جلاہے۔ پھٹے حال ہو۔ مفلس کنگال ہو۔ مگر میرے دل کی ٹھنڈک اور فرزند نونہال ہو۔ تم کو گلے لگاؤں پیار کروں۔ نہلاؤں۔ پاؤں دباؤں۔ پنکھا جھلوں۔ آپ پیچھے کھاؤں۔ پہلے تمہیں کھلاؤں۔ اور تم کو ہر ذلّت وحقارت سے بچا لوں۔

اسے خدا کو ایک مانو۔ اس کی مرضی پر چلو۔ پھر تم میرے راج دلارے ہو۔ آنکھوں کے تارے ہو۔ روپیہ پیسہ کیا چیز ہے۔ مجھکو ایمان عزیز ہے۔ ایمان عزیز ہے۔ کہتا حسن نظامی سے کہتا۔ ہر دعوی دار غلامی سے ذات پات کی قید اٹھاؤ۔ مغل سید۔ پٹھان کا نام مٹاؤ۔ کمینوں کو اچھوتوں کو پاس بلاؤ برابر بٹھاؤ ساتھ کھلاؤ۔ ان کا آسرا ہوگے تو خدا کو پاؤگے۔ ورنہ ہاتھ ملتے تہ رہ جاؤگے۔

حسن نظامی نے گردن جھکائی۔ اپنے مالک اپنے داتا کی مرضی سر آنکھوں پر اٹھائی پہلے خاکروب کے قدم لئے۔ اسکی کوٹھری میں خرقہ بچھایا۔ اور ساتھ بیٹھکر جھوٹی روٹی اور باسی دال کا نوالہ کھایا۔ میرا بھائی۔ میرا بھائی کہکر جی بڑھایا۔ پھر بیگاری چمار کے گھر پہنچا اپنا کھانا اسکے بچوں کو بانٹا۔ اسکی نابینا ماں کو دوا پلائی۔ اور جب تک اس کا لال بیگار سے الٹا نہ پھرا۔ اسکا جی بہلا چماری کو پنکھا جھلنے اور پاؤں دبانے سے نہ پھرا۔

برقعے والی عورت کا گھر یاد تھا۔ لوگوں سے کہا۔ اس کی ٹوپیاں خریدو۔ شریف ہے

خیرات نہ لے گی۔ اس کا دل نہ ٹوٹے ایسی مدد کرو۔

جہاں پناہ۔ ہز مجسٹی۔ امپرر دو جہاں۔ خاقان الانس والجان۔ سلطان العرب والعجم۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گورنمنٹ ناظر غیب تھی۔ اس نیت کی کارگزاری سے مسرور ہوئی۔ سبز نشان انعام میں بھجوایا۔ اور فرمایا۔ اس کو کھڑا کرو۔ اور غریبوں سے کہو۔ یہ ہے تمہارا آسرا۔ یہ ہے تمہارا سہارا۔ یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔ اس کے نیچے آؤ۔ پھر کوئی تم کو حقیر ذلیل نہ کہہ سکیگا۔ کسی کو پاس بٹھانے ساتھ کھلانے سے عار نہ ہوگا۔

یہ جھنڈا وحدت کا ہے یہاں دوئی نہیں

سوائے یہاں کے اور کہیں یکسوئی نہیں

ہے کوئی بندۂ خدا جو حسن نظامی کی طرح اس حکم پر ایمان لائے۔ اور بھنگی چماروں کیساتھ کھانا کھانے پر آمادہ ہو جائے۔ جس کو انکار ہوگا قہر خدا کا سزاوار ہوگا۔ زمین اس کو نگل جائے گی۔ دولت اسکی چھن جائے گی۔ عزت اس کی مٹ جائے گی۔ دربدر رسوا ہوگا۔ پھر بعد کے پچتانے سے کیا ہوگا۔

کہدو انسان کا جسم گندہ نہیں۔ اگر ظاہری ناپاکی نہ ہو تو ہر ولد آدم پاک ہے شاہ وگدا مساوی بحکم شہ لولاک ہے۔ غریب کے آگے جھکو۔ متکبر امیر کے سامنے اکڑو۔ ٹوٹے دل کو جوڑو۔ سنگین دل کو توڑو۔

جب غریبوں کا یہ آسرا پیدا ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا مسلمانوں کے تمدن سیاست وغیرہ میں انقلابی مزہ آئے گا۔ اور اس وقت اس سوال کا جواب سمجھ میں آجائے گا کہ غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ جب علم سبز کے نیچے کا ہر بہادر بتائے گا کہ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا۔

یہ مضمون تمام ہندوستان کے اخباروں نے چھاپا تھا اور اس کی بہت تعریف ہوئی تھی

# شذرات

## ہماری بُری نیکیاں

یہ طرزِ احسان کرنیکا نہیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا

ہندوستانی بڑے مخیر ہیں۔ خیر خیرات کرنے میں انکا درجہ بڑی بڑی دولت مند قوموں سے بڑھ گیا ہے۔ مگر ان کی یہ نیکیاں بعض اوقات برائیوں سے بڑھ جاتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ہندو لوگ چڑیماروں کو دام دیکر پرندوں کو آزادی دلایا کرتے ہیں۔ ظاہر میں یہ بڑا نیک کام ہے کہ بے زبان جانور ظالم صیاد کے پنجے سے رہائی پاتے ہیں لیکن درحقیقت جانوروں پر ظلم کرانے کا اور چڑیماروں کو جانوروں کی گرفتار کرنیکا اس سے زیادہ کوئی رغبت دلانے والا سبب نہیں ہوسکتا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ہماری ستمگاری کی "نقد داد" ملتی ہے تو وہ اور زیادہ محنت و جستجو سے اپنی سفاکیوں کا سلسلہ دراز کرتے ہیں۔ اور بچارے پرندے زیادہ گرفتار ہونے لگتے ہیں۔

اسی طرح موٹے مسٹنڈے بھک منگوں کو خیرات دینا ان کو بے کار بنانا ہے ملک میں گداگروں کی تعداد بڑھانے کے ذمہ دار زیادہ تر یہی نیک لوگ ہیں جو پہلے لوگوں کو بیمار کرتے ہیں پھر دوا تقسیم کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔

ایسی بری نیکیوں کا انسداد لیڈران ملک کو سیلف گورنمنٹ کے حصول سے زیادہ ضروری ہے مگر ہم کو لیڈروں کے بھروسہ پر نہ رہنا چاہیئے۔ جس ملک میں فرض ادا کرنے والے لیڈر نہ ہوں اس کا ہر باشندہ اپنے ذاتی فرائض کا ذمہ دار ہے۔ لہذا ہندوستانیوں

کو اس خیرات ناجائز کی رسم پر نظر ثانی اور زبان و قلم کو حرکت میں لا کر حق العباد کے بارے سبکدوش ہونا چاہئے۔

## صبا نے کلیوں کو جگایا

کل صبح باغ میں سوتی کلیوں کو صبا جگاتی تھی۔ شانہ ہلاتی تھی۔ یہاں تک کہ گدگدیاں کر کر کے ہنساتی تھی۔ یہ جگانے کا نرالا انداز دیکھ کر میں نے اس سے کہا تو بڑی ملنسار ہے۔ برگ گل کے رخسار پر سر رکھ کے بولی۔ تم سیکھو کہ بچوں کو یوں پرورش کیا کرتے ہیں۔ یہ برتاؤ ہوگا تو ہر طفل غنچے کی طرح کھلے گا۔

میں اپنی نیند خراب کر کے پہلے بیدار ہوئی۔ جنگلوں۔ پہاڑوں کی تازگی چننی دامنوں میں بھرتی۔ یہاں آئی۔ تب ان کلیوں کی خدمت بجا لائی۔ تم خود سورج نکلنے کے بعد تک سوتے رہتے ہو۔ تو بچوں کی تر و تازگی کہاں سے آئے گی۔

## شمع کا قد زیبا

حضرت اکبر کی میز پر مومی شمع گورے سنتری کی طرح تنی کھڑی تھی۔ اس کا قدِ زیبا سر سے پاؤں تک سڈول ہناجی کو بھا گیا۔ چکنی چپڑی صورت پر دل آگیا چاہتا تھا کہ اس مس خاموش کو گویا کروں اور اپنی محبت کے پھندے میں پھنساؤں کہ کسی نے اس کے سر پر شعلے کا تاج رکھ دیا۔ آہاہا۔ عالم ہی بدل گیا۔ کلاہ نور میں شمع پیاری کی شکل کیسی دلفریب بن گئی۔ پروانے باغ کی ڈالیوں سے اُڑ اُڑ کر کمرے میں آنے لگے۔

میرا لطفِ دید ختم نہ ہوا تھا کہ جناب اکبر کا شعر کان کی راہ آنکھوں میں سما گیا ؎

زینت مقدر ہے مصیبت کا دہر میں
سب شمع کو جلاتے ہیں سانچہ میں ڈھال کے

صورت شعر کی حالت الفائی نے شمع کو بھی رُلا دیا۔ آنسو بہا کر بولی دنیا کی زینت چاہنے والے میرے جلاپے کی مصیبت کو دیکھیں۔ قدر عنا زیبائش کے ہاتھوں مٹا جاتا ہے نہ ظاہری ٹیپ ٹاپ ہوتی نہ یہ وقت پیش آتا۔

# تغیر فطرت کا سبب

فطرت ہر وقت تبدیلی و تغیر میں مصروف رہتی ہے۔ انسان کے ذرات جسم و حواس کو دیکھو وہ بھی سکنڈ سکنڈ میں بدلتے رہتے ہیں۔ پوچھا اس کا سبب؟ ہوش نے جواب دیا ہستی مطلق کے گوش تک رسائی پانے کیلئے رنگا رنگ طریقے بدلے جاتے ہیں مگر وہاں ایسے پر حجاب پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس طرح پہنچ نہیں ہوتی۔ بقول اکبر ؎

نہیں پاتی نہیں پاتی رسائی گوش جاناں تک
بدلتی ہے طریقہ سو طرح میری خبر اپنا

دُنیا میں دکھ سکھ کی تبدیلیاں بھی اسی اصول کی ماتحت ہیں۔ جو ان تغیرات سے دل برداشتہ نہیں ہوتے اور عبادت رب میں مصروف رہتے ہیں ان کی خبر گوش جاناں تک بلا تردد پہنچ جاتی ہے۔

# جرمنی کا فلسفہ کائنات

ڈاکٹر ہیگل جرمنی کا مشہور فلاسفر ہے جس کی فلاسفی جرمنی درسگاہوں میں رائج ہے۔ اہل جرمن اسکو افلاطون سے بڑھکر سمجھتے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر اقبال باعتبار تخیل کے ہیگل افلاطون سے یقیناً بڑا ہے۔

ہیگل موجودات عالم کی ہستی محدود کی زندگانی اصول تناقص میں مضمر بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ کائنات کے تمام محدود وجود آپس میں کٹتے مرتے اور ایک دوسرے سے

دست و گریباں ہوتے ہوئے ایک دن ہستی مطلق میں مل جاتے ہیں۔ جب تک ہستی میں کیب
تناقض موجود ہے کشمکش لازمی ہے۔

اہل جرمنی ہیگل کے اس فلسفہ کو ناز سے لکھتے ہیں۔ جو ضخیم کتابوں میں قلمبند کیا
گیا ہے مگر ہندوستان میں اس کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ ذوق مرحوم نے ایک شعر میں اسی کے
قریب ایک مضمون لکھا تھا کہ اس جہان کو اختلاف سے زیب ہے مگر حضرت اکبر الہ آبادی نے
تو ہیگل کے سارے سمندر کو اس طرح اس شعر میں بند کیا ہے جیسے انگریزی بیڑے نے
جرمنی بیڑے کو نہر کیل میں کیل رکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پینچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

جرمن والوں کو معلوم ہو کہ ہند میں ہمارا فلسفہ مفتوح ہو چکا ہے تو ان کی حرص فتاحی
شکست ہو جائے۔ حضرت اکبر کو تو شاید معلوم بھی نہ ہوگا کہ جو شعر ان کے قلم سے بیساختہ نکلتا
ہے اس پر جرمنی کی تمام ساخت پرداخت منحصر ہے انہوں نے اس شعر میں روح و مادہ
اور ان کے تمام لوازمات کو کس آسانی سے ادا کر دیا ہے۔

ہندوؤں کی مہابھارت کے وقت سری کرشن جی نے جو فلسفیانہ لکچر ارجن کو سنایا تھا
اور جو اب گیتا کے نام سے ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں شامل ہے۔ ہیگل کے اس فلسفہ سے
کہیں زیادہ لطیف و پر معانی ہے۔

مسلمانوں کے فلسفہ تصوف کو دیکھا جائے تو اس کے جزئیات میں ہیگل کے کلیے
بکھرے ہوئے ملیں گے۔ تشبیہ و تنزیہہ کے اشارات میں محدود پیکروں کو وجود مطلق کے
جلوے علانیہ نظر آجائیں گے۔

اس میں شک نہیں محدود ہستیوں کی باہمی کشمکش فطرت و نیچر کے حکم سے ہے
جہاں زہر پیدا ہوتا ہے وہیں تریاق بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ گرمی و سردی۔ خشکی و تری۔

نیکی و بدی ۔ نور و ظلمت ادھر واں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت نے دنیا کو دارالامتحان بنایا ہے
جہاں سلیم الفطرت انسانوں کو آزمائش کے بعد منتخب کیا جاتا ہے ۔ پس ہستی مطلق کے دربار
میں مقبولیت ان ہی کی ہے جو نیچر کی مقررہ حد توازن سے آگے نہیں بڑھتے اور اس
توازن کو تقدیر آلہی سمجھکر مصائب پر صبر اور تعیش پر شکر کرتے ہیں۔ ان کا قدم ظلم و زیادتی
کی جانب جنبش نہیں کرتا ۔ کیونکہ وہ ہستی مطلق کے آداب و سامان کا عرفان رکھتے ہیں۔

# آرام کہاں ہے؟

نئی روشنی اور پرانی روشنی بحث کر رہی ہے کہ انسان کی آسایش و راحت خودی
میں ہے یا بیخودی میں ؟ ایک فریق کہتا ہے ۔ خودی مٹانے کا عقیدہ عیش زندگانی کا دشمن
ہے ۔ دوسرا بیان کرتا ہے زندگی کی حقیقی کامرانی خودی میں میسر نہیں آسکتی ۔
یہ کیسی مشکل بات ہے یہ لوگ تو آپس میں علم کے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں ۔ اور
بے علم جینے کے مزے کو کھڑے ترستے ہیں ۔ ان کے لئے حضرت اکبر الہ آبادی نے کیا خوب
مثال ارشاد فرمائی کہ نیند دن بھر کی محنت کے بعد ذریعۂ آرام ہے ۔ مگر اس آرام میں آدمی
کی خودی باقی نہیں رہتی جب بے خود ہوتا ہے تو آرام پاتا ہے ۔

# روح و اجل کے دامن

موت و حیات دیکھنے اور کہنے میں دو اور حقیقت میں ایک ذات ہیں ۔ کیونکہ ذات
واحد کی فرستادہ ہیں ۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور حیات پر مرتے ہیں ان پر اجل چنگل
مارتی اور حیات ان سے دامن بچاتی ہے ۔ اور جن کو خدا سے سروکار ہے جو خالق لیل و نہار
ہے اُن کے لئے اجل کے دامنوں میں حیات بستر بچھاتی ہے ۔ اور جب وقت موعود آتا ہے
روح رواں بستر اٹھا کر روانہ ہو جاتی ہے ۔ اور اجل اپنے خالی دامن کو جھاڑتی چلی جاتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو مرنے میں اذیت نہیں ہوتی۔ اور وہ اجل کے ضرر یورش سے محفوظ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے ؎ (اکبر)

برباد کیا اجل نے ہم کو کیا یہ کہئے　　روحِ رواں نے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا

# موج پر کائی نہیں جمتی

ہند پانی اور بہتے دریا کی جنس ایک ہے شکل ایک نہ ہے۔ ظاہر ایک ہے۔ باطن ایک ہے۔ مگر آبِ مقید پر کائی چھا جاتی ہے۔ اور موجِ رواں ہمیشہ سورج سے آنکھ لڑاتی ہے اسی طرح جو آدمی کچھہ کام نہیں کرتے تو ان کی لیاقتیں دل کے دل ہی میں ارمانوں کو مسوس کر مر جاتی ہیں اور جو دین دنیا کے مشاغل میں رواں دواں رہتے ہیں وہ اوجِ فلک پر سورج بنکر چمکتے ہیں۔

# میں نہیں ڈوبا

طوفان کشتیوں اور جہازوں کو ڈبوتا ڈبوتا مجھہ تک آیا۔ میں ایک بلبلا تھا۔ اور پانی میں تیر رہا تھا۔ اُس نے چاہا مجھہ پر حملہ کرے۔ اور وہ کف منہ میں لیکر میری جانب بڑھا۔ مگر میں اطمینان سے اس کو دیکھتا رہا۔ وہ مجھہ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ پانی نے میری خودی کی ہوا کو شکست دی۔ ہوا فرار ہوئی اور میں پانی ہوگیا۔ طوفان سر پر آیا تو مجھکو نہ پایا۔ بہت گھبرایا۔ آخر کسی نے سُنایا خودی کے متوالے ڈوبتے ہیں۔ حباب بے خود ہوگیا۔ اب تو اس کو کہاں پا سکتا ہے۔

دنیا کے رہنے والے اس مثال کو سنکر اپنے حریفوں سے مطمئن ہوئے۔ اور انہوں نے بھی اپنے اندر کی ہوائے نفسانی کو نکالنا شروع کر دیا۔ اُس وقت میں سمجھا کہ میں انبار کے دریا میں غرق نہیں ہوا۔ لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا۔

# کچی نیند کی آنکھیں

ان کی عمر جوانی کی تھی۔ یہ بیداری میں خام تھے۔ نیند کی غفلت میں پختگی کے سوا ان کی ہر ادا کچی تھی۔ سوتے میں انہوں نے کیا پی لیا ہے۔ آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مگر نشہ سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ دیکھنا ڈیلوں کی سفیدی میں سُرخی کیسی نشیلی ہے اور پلکیں کیسی بے قابو ہو ہو کر لڑکھڑا رہی ہیں۔ پتلی کی بے قراری پردہ کے اندر کی چھپی باتوں کو رُک رُک کہنا چاہتی ہے۔ مگر زبان یاری نہیں دیتی۔

ذرا پوچھنا۔ تم کو عورتوں کی تعلیم بے پردگی کی بھی کچھ خبر ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کو آزاد و بے باک بنانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کچی نیند کی آنکھیں خود صورت مثال اور زبان حال ہیں۔ مرد مکمل ہو جاتے۔ گویا نیند پوری ہو جاتی۔ اس وقت عورتوں کو جگا یا جاتا۔ وہ بے چاریاں پہلے ہی کچی ذات ہیں۔ کچی نیند میں اٹھائی جائیں گی تو خود بھی گر پڑیں گی دوسروں کو بھی گرائیں گی۔

# عالم اسباب

یہ دنیا عالم اسباب مشہور ہے۔ اس میں ہر چیز دوسری چیز کی ماتحت و محتاج بنائی گئی ہے۔

صرف انسانوں پر نظر کی جائے تو ہر فرد دوسرے کا دست نگر معلوم ہوگا۔ جس طرح ایک مفلس و غریب آدمی دولتمندوں کا محتاج ہے۔ اسی طرح دولت والے غریبوں کی امداد کے ضرورت مند ہیں۔ خواہ کیسا ہی بڑا فاتح خود مختار شہنشاہ ہو اپنے نوکروں اور ماتحتوں کی مدد بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اسکی عزت اور ناموری گمناموں کے عمل پر منحصر ہے۔

اس سلسلہ ضروریات کی باہم وابستگی اور ایک دوسرے کی احتیاط قدرت کا بہت

بڑا راز ہے۔ یہ نہ ہو تو مخلوق میں خالق کی ہمسری و خودی پیدا ہو جائے۔ جب مغرور ہستیاں عالم اسباب کی مجبوریوں سے کمتر ہستیوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہیں تو خودی و نخوت کے نشے ہرن ہو جاتے ہیں۔

مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو شرک بہت ناپسند ہے۔ آثار نیچر میں بھی نظر آتا ہے کہ انسان و حیوان شرکت غیر سے گھبراتے ہیں۔ اس واسطے قدرت نے نہایت لطافت و باریکی سے ہر وجود کا سلسلہ دوسرے وجود کے ساتھ اس ترکیب سے ملایا ہے کہ ضروریات کی تکمیل کے بعد ہر ہستی اپنے کام میں آزاد ہو جائے اور شرک کی تکلیف میں مبتلا نہ رہے۔ پس اگرچہ کائنات میں اشیاء باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں لیکن ادائے حقوق کے بعد ان کو آزادی ملنی لازمی ہے۔

# آخری دستخط

میرے مضامین کا پہلا حصہ پورا ہو گیا اور مجھ سے آخری دستخط مانگے جاتے ہیں اور میں یہ سطریں لکھکر دستخط کرتا ہوں۔

چار برس سے زیادہ کا ذکر ہے میرے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ایک جسم معطل تھا، اس کے سر پیر نہ تھے۔ آنکھیں کانوں کی جگہ اور کان ناک کے مقام پر، اور ناک زبان کے موقعہ پر چسپاں تھی، نہ کوئی ترتیب تھی، نہ موزوں قرینہ تھا کیونکہ اس مجموعہ کا مرتب کرنیوالا ہیں خود اور چند احباب تھے۔ کچھ ہماری نااہلیت۔ کچھ مضامین کا ایک وقت میں نہ ملنا۔ اس خرابی کی وجہ سمجھنی چاہیئے۔ دوستوں کو جہاں کہیں کوئی مضمون ملا انہوں نے کاپی نویس کو دیدیا۔ تقدیم۔ تاخیر۔ موزوں۔ غیر موزوں کا خیال نہ کیا۔ اس پر بھی صدہا مضامین رہ گئے اور وہ اخبار و رسائل نہ مل سکے جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے، خود میرے ہاں ایک بوری ایسے اخبارات و رسائل کی غلطی سے ردی میں چلی گئی جن میں میرے مضامین تھے اور ان کو ترتیب مجموعہ کے خیال سے جمع کیا گیا تھا۔

باوجود ایسی بے ترتیبی و بے سلیقگی کے یہ مجموعہ لوگوں نے پسند کیا اور دو برس کے اندر (غالباً) دو ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں اور مانگ باقی رہی لیکن اس طلب کا جواب موجود نہ رہا۔ اب وہ وقت تھا کہ اخبار توحید کی ضبطی نے ہندوستان میں میرے مضامین کا شوق بڑھا دیا تھا، کیونکہ میں نے اخبارات و رسائل میں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ خلقت کے مضطربانہ اشتیاق کو دیکھکر اخبار توحید کے مالک شیخ محمد احسان الحق قادری میرٹھی نے توحید کے پرچوں سے میرے مضامین اخذ کئے اور ان کا ایک مجموعہ چھاپ دیا۔ یہ مجموعہ صرف توحیدی مضامین کا تھا تاہم ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کی ترتیب پبلک کو بہت پسند آئی۔ حقیقت میں

انتخاب توحید کی ترتیب تھی بھی ایسی باقاعدہ کہ خواہ مخواہ اچھی معلوم ہوتی تھی اس تجربہ سے بھیا احسان کو جرأت ہوئی اور انہوں نے اسی وقت سے تمام اخبارات و رسائل سے میرے مضامین جمع کرنے شروع کئے اور ان کی ترتیب سے ابواب مقرر کر دئے اسی اثنا میں ملک دکن کے محکمۂ تعلیم نے اسکول کے بچوں کے واسطے میرا پہلا مجموعہ منظور کیا اور اسکی خریداری کی باضابطہ اطلاع مجھکو دی لیکن میں اسکی تعمیل کیونکر کرسکتا میرے پاس تو ایک کتاب سے زیادہ دوسری نہ تھی یہ معلوم کرکے بھیا احسان نے جلدی جلدی مجموعۂ مضامین کا پہلا حصہ مرتب کرکے محمد انوار ہاشمی کے عصر جدید پریس میرٹھ میں چھپوا دیا اور مُلّا محمد الواحدی کے درویش پریس میں اسکا ٹائٹیل چھپواکر کتاب پوری کر دی۔

اس مجموعہ میں انتخاب توحید اور رسالۂ مجموعہ سے اقتباس کیا گیا۔ جو مضامین موجودہ جنگ کے سبب خلاف مصلحت تھے ان کو حذف کر دیا، اسکے بعد اخباروں اور رسالوں کے جدید مضامین بھی لئے۔ برادرم شیخ محمد احسان الحق صاحب نے اسکی ترتیب اور عزیز قلبی محمد انوار ہاشمی نے لکھائی، چھپائی اور تصحیح میں بہت محنت کی ہے اور محض اخلاص و محبت کی بنا پر مہینوں کی دردسری اٹھائی ہے اسکا میں شکریہ تو کیا ادا کروں، محبت کے کوچہ میں یہ رسم منع ہے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں اور خدا تعالےٰ کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھ کو ایسے بے غرض مخلص دئے۔

عزیزم مُلّا محمد الواحدی اڈیٹر رسالۂ نظام المشائخ و اخبار خطیب دہلی نے اس مجموعہ پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ نئی طرز کا ریویو ہے، امید ہے کہ اس دیباچہ کو دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ میں واحدی صاحب کا بھی احسانمند نہیں ہوں، انہوں نے بھی حق تعلق ادا کیا۔

دوسرا دیباچہ ملک کے شہرۂ آفاق انشا پرداز اور اردو ادب کے عملی خدمتگزار جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے سکرٹری انجمن ترقی اردو اور افسر ماتحت محکمۂ تعلیمات دکن کا ہے مولانا نے علم دوستی اور اردو زبان کے ذوق سلیم کی بنا پر ان مضامین کی داد دی ہے خدا اُن کو داد دیگا کہ انہوں نے ترقی اردو کے مقاصد کو ملحوظ رکھکر میری حوصلہ افزائی میں مبالغہ کیا ہے

برادر طریقت مولوی سید غلام بھیک صاحب فقیر اللہ شاہ نظامی بی۔ اے۔ وکیل انبالہ جو میر نیرنگ کے تخلص سے ادیبوں میں شہرت عام رکھتے ہیں سابقہ مجموعہ پر انہوں نے ایک دیباچہ لکھا تھا وہ بھی بھیا احسان نے اس مجموعہ میں داخل کر دیا ہے۔

# اپنی رائے

دیباچہ نویسوں نے توان مضامین پر رائے زنی کردی اب میں خود اپنی رائے کے دو لفظ لکھکر آخری دستخط کرتا ہوں۔

دلی میں رہنے والے کا یہ کچھ کمال نہیں ہے کہ اس نے اردو زبان میں اپنے خیالات کو صفائی سے ادا کردیا۔ اسواسطے میں ان مضامین کی زبان پر تعریفی الفاظ لکھنے نہیں چاہتا۔ البتہ اپنے ذہن اور تصور کی ستائش کرتا ہوں جس نے میرے قلم سے ان تخیلات کو کاغذ پر نمایاں کرادیا۔ اور یہ ستائش خودی کے ذہن اور تصور کی نہیں ہے بلکہ خالق ذہن و تصور کی تعریف ہے، وہ نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا اور میرا ذہن و تصور بھی نہ ہوتا۔ وہ تھا ہے۔ رہیگا۔ میرا وجود بھی ہوا اور اس نے جذبات کو مجسم کرکے دکھادیا۔

میں ذکر کرتا ہوں خدا نے مجھے بڑی نعمت دی ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مجھپر لازم گروانا ہے۔ ان مضامین میں بعض اشارے وہ ہیں جن کو نہ خود میں سمجھا نہ امید ہے کہ آجکل کوئی سمجھ سکیگا۔ لیکن قلم نے کسی طاقت سے متاثر ہوکر ان کو لکھا ہے لہذا وقت آئیگا کہ انکے سمجھنے والے پیدا ہوں وہ سمجھ لینگے تو میری اپنی اس رائے کی قدر کرینگے اور ان آخری دستخطوں کا مطلب جان جائیں گے جو میں نے خاص اپنی روش تحریر دکھانے کو اپنے قلم سے لکھے ہیں۔

حسن نظامی دہلی

# اکسٹھ برس کی عمر میں

۶۱

یہ مجموعہ مضامین جس کو سی پارۂ دل بھی کہتے ہیں ایم اے اور بی اے کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اور ہر جگہ اس کی مانگ ہے۔ گزشتہ ایڈیشن بہت ہلکے کاغذ پر طبع ہوا تھا اور مجھے اس سے بہت تکلیف ہوئی تھی کہ میری اولاد کو سردی کے موسم میں تن زیب اور ململ کے کپڑے پہنادئے اس کے علاوہ یہ ختم بھی ہو گیا تھا۔ آخر کاتب نے پھر لکھا۔ کاپیاں ۱۹۳۶ء میں تیار ہو گئی تھیں اور اب جبکہ اگست ۱۹۳۷ء کا آخر ہے یعنے ۱۹۳۷ء کے بھی آٹھ مہینے گزر چکے ہیں یہ کتاب مطبع میں جاتی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ میری کتابیں دفتر کے ملازمین چھپواتے ہیں۔ اور مقررہ آدمی کاپیاں پڑھتے اور کتابت کی غلطیاں درست کرتے ہیں۔ مگر میری کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں کتابت کی اور طباعت کی بے شمار غلطیاں نہ ہوں اس لئے میں نے چاہا کہ سی پارۂ دل کی اصلاح میں خود کروں۔ چنانچہ میں نے یہ کام شروع کیا۔ اور پورے ایک سال میں یہ کام ختم ہوا۔ اگر اتنے عرصہ میں کوئی اور کام نہ ہوتا اور میں نئے مضامین لکھتا تو شاید اس مجموعہ سے پانچ حصے زیادہ نئے مضامین لکھ لیتا۔ مگر کام کی کثرت اور اکسٹھ برس کی عمر ہو جانے کے سبب اب مجھ سے زیادہ کام بھی نہیں ہو سکتا۔ منشی قربان علی صاحب بسمل ایڈیٹر اردوئے معلیٰ دہلی جو میری کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے منتظم ہیں وہ ایک سال سے روزانہ تقاضہ کرتے رہتے ہیں مگر مجھے فرصت نہیں ملتی آخر ایک برس کے بعد آج ۲۰ اگست یوم جمعہ وقت ۳ بجے شب کو یہ سب کاپیاں نظر ثانی سے فارغ ہوئیں اور میں نے ہر غلطی کو درست کر دیا اور بعض مقامات پر عبارتیں بدل دیں جو مجھے ناموزوں معلوم ہوئی تھیں۔

**حسن نظامی**

۲۰ اگست ۱۹۳۷ء۔ یوم جمعہ دہلی